چراغاں

حصہ دوم۔ "فانوس"

روشن، اسلامی، تحقیقی مضامین



سید رفیق عباس جعفری

چراغاں

حصہ دوم۔ "فانوس"

روشن، اسلامی، تحقیقی مضامین

سیّد رفیق عباس جعفری

ناشر
قمر زہرا میموریل اکیڈمی، کراچی

اشاعت اوّل

مارچ/2019ء

نام کتاب : ''چراغ اساس'' حصہ دوم ''قاموس'' (روشن، اسلامی، تحقیقی مضامین

تالیف : سید رفیق عباس جعفری

کمپوزنگ : راحت حسین، احمد گرافکس (021-36805931)

سرورق : سید علی اسد جعفری (مانچسٹر)

ناشر : قمر زہرا میموریل اکیڈمی، کراچی

ہدیہ :

ملنے کا پتہ

احمد بک سیلرز

ہول سیلرز اینڈ آرڈر سپلائرز

718/20 فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون: 021-36364924

Email: sh.jafri786@gmail.com

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

مادرِ باصفا

جناب فاطمہ بنتِ اسد سلام اللہ علیہا

کے نام

فہرستِ مضامین

چراغاں

— حصہ دوم ''فانوس'' کے اُجالے —

برادرِ محترم جناب سید رفیق عباس جعفری صاحب کی کتاب ''چراغاں'' کا دوسرا حصہ ''فانوس'' پیشِ نظر ہے۔ پہلا حصہ ''قندیل'' کے نام سے کچھ عرصہ قبل شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ دونوں مجموعہ جات رفیق عباس صاحب کے ان مضامین پر مشتمل ہیں جو گزشتہ دس سالوں میں پاکستان کے امامیہ رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ پہلے مجموعہ ''قندیل'' میں معصومین اور محسنین اسلام علیہم السلام پر کم از کم ایک ایک اور دیگر موضوعات پر مضامین جمع کیے گئے۔ اس مجموعہ میں بھی ایسے ہی مضامین ہیں مگر بعض پر ایک سے زیادہ اور بعض پر ایک بھی نہیں۔

۳۔ ان مضامین کی بڑی خوبیاں جو مجھے نظر آئیں وہ یہ ہیں:

الف: ہر مضمون کے آخر میں ''مآخذ'' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف کردہ مضمون کی تیاری میں کن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں بہت پرانی بلکہ نایاب کتب بھی ہیں۔

ب: بیشتر مضامین قرآن مجید کی مختلف تفاسیر سے ماخوذ ہیں۔ تفاسیر بھی مختلف مکاتیبِ فکر کی ہیں۔ اس طرح بیان کردہ موضوع پر اسلام کے مختلف مکاتب کی آرا، سامنے آتی ہیں۔ یہی بات کتب احادیث کے حوالہ جات کی بھی ہے۔ ان حوالوں سے مضامین کے

ثقہ ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

ج۔ ان مضامین میں ائمہ معصومین کی سیرت اور تعلیمات مثلاً طریقۂ تربیت اولاد جیسے اہم اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے کی کوششیں بھی فرمائی ہیں جو ہدایت الٰہیہ کا اصل مقصد ہوتا ہے، جسے قرآن میں "تزکیہ" اور حدیث میں "جہاد اکبر" فرمایا گیا ہے۔

ائمہ اہل بیت کا قول و عمل قرآن مجید کی زندہ، پائندہ اور تابندہ تفسیر ہے، سیرت رسولؐ کی تشریح اور تسلسل ہے، اس لیے ہمارے لیے نمونۂ عمل ہے۔ ایسی تعلیمات کو اجاگر کرنا اصلاح معاشرہ کا عملی طور پر انجام دینا ہے۔ بقول شاعر:

میں نہیں کہتا کہ حضرت یہ کریں یا وہ کریں
انؑ کی سیرت آئینہ ہے، آئینہ دیکھا کریں

آخر میں محترم بزرگ، جناب سید رفیق عباس جعفری صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے نہایت گہرے مطالعہ کے بعد ان مضامین کو لکھا ہے جو آسان کام نہیں۔ تحقیق کرنا خونِ جگر پینے کے مترادف عمل ہے۔

اک نئے کام کی تخلیق کوئی کھیل نہیں
یوں سمجھ لیجیے مٹی کو بشر کرنا ہے

مفسر قرآن

ڈاکٹر سیّد محمد حسن رضوی

پیش لفظ

ــــ سیلِ نور ــــ

''چراغاں'' حصہ اول ''قندیل'' کے پیش لفظ میں ہم نے جو عرض کیا تھا وہ پھر عرض کرتے ہیں۔

جیسا کہ علمائے کرام نے لکھا ہے مذاہب آدمی کو انسان بنانے کے لیے وجود میں آئے۔ اسی لیے جب پہلا آدمی خلق ہوا تو اس کو ہادی بنایا گیا۔ اگرچہ اس وقت گنتی کے چند افراد تھے لیکن صحیح اور غلط کی ہدایت کی ضرورت کے تحت جناب آدمؑ کو ہدایت کا سلسلہ تفویض کیا۔ آدمیت بڑھتی گئی اور ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ آخرِ زمانے میں ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے جو ہدایت کے سلسلے کے آخری نبی قرار پائے۔ اللہ کے حکم پر آپؐ کے پردہ فرمانے کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوا لیکن ہدایت کا سلسلہ جاری رہا اور امامت کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ کے روشناس کرائے گئے دین کی حفاظت کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔

دینِ مبین کی ترویج کے لیے علمائے کرام نے خطبے ارشاد کیے اور کتابیں تصنیف کیں۔ خطبے، کچھ تو لوگوں نے لکھ کر محفوظ کر لیے، بقیہ ہواؤں میں گم ہو گئے لیکن کتابیں زندہ رہیں۔ ان اکابر نے آخری کتاب ''قرآنِ مجید'' اور

احادیث شریف کے تراجم کیے اور تفاسیر تیار کیں۔ ظاہر ہے ان کاموں میں ان لوگوں کا خون پسینہ شامل ہوا۔ جب یہ کتابیں پیش کی گئیں تو ان کے پڑھنے والے بھی کثیر تعداد میں وجود میں آئے۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ لکھنے والا لکھ کر امر ہو گیا۔ جب تک تحریر موجود ہے تصنیف کرنے والا بھی ہے۔ البتہ پڑھنے والے نے تحریر پڑھ کر اس سے ذاتی طور پر استفادہ کر لیا لیکن اس کی ذات کے ساتھ ہی اس کا مطالعہ ختم ہو گیا۔ اب اگر پڑھنے والا اپنے مطالعہ کو مشاہدے یا تجربے کے ساتھ ملا کر آگے بڑھا دے یا تحریر کی شکل دے دے تو یہ چراغ سے چراغ جلانے والی بات ہو جائے گی۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کسی کی تحریر کو اپنے نام سے آگے بڑھا دینا سرقہ ہے۔ یقیناً کسی کی تحریر کو اپنے نام سے شائع کرنا سرقہ ہے، لیکن ایسی تحریر کے آگے اصل لکھنے والے کا یا کتاب، رسالے، اخبار کا نام بطور ماخذ یا منابع لکھ دیا جائے تو یہ سرقہ نہیں کہلائے گا۔

جناب سیف الدین سیف نے کیا خوب صورت شعر میں اس بات کو بیان کیا ہے:

سیف اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

مجھے مطالعے کا شوق کم سنی سے تھا۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد محسوس کیا کہ جو کچھ میں نے پڑھا وہ تو میرے بعد میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ کیوں نہ تحریر کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ پہلے میں نے مضامین لکھے اور کچھ احباب کو اور چند علمائے اکرام کو دکھائے جنہوں نے انہیں پسند کیا اور شائع کرنے کی تجویز دی۔ چنانچہ میں نے مضامین تالیف کیے اور مختلف رسائل کو ارسال کیے۔ جہاں

بھی میں نے یہ مضامین بھیجے سب جگہ قابلِ اشاعت قرار پائے۔

میری تالیف ''قرآن اور شہزادی فاطمہ'' سال ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ سال ۲۰۱۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۲۰۱۸ء میں منقبت، سلام اور نوحوں کا مجموعہ ''سخن چراغاں'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ ۲۰۱۹ء کے اوائل میں ہمارے مضامین کا پہلا مجموعہ ''چراغاں'' حصہ اول ''قندیل'' شائع ہوا۔ اب دوسرا مجموعہ ''چراغاں'' حصہ دوم ''فانوس'' کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

عام طور سے آج کل کہا جاتا ہے کہ کتابیں پڑھنے کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ یہ سلسلہ ختم تو نہیں کم ضرور ہوگیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کی کتابیں شائع بھی ہورہیں ہیں، فروخت بھی ہورہی ہیں اور پڑھی بھی جارہی ہیں۔ ہر سال برصغیر ہند و پاکستان میں کتب میلوں، رسم اجرائی کتب کی تقریبات وغیرہ میں اضافہ ہورہا ہے۔ زبانیں اب ایک علاقہ سے نکل کر عالمی سطح پر پھیل رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر زبان کی کتاب دنیا بھر میں جہاں اس کے بولنے والے ہیں شائع ہورہی ہیں۔

میں نے رسائل کے لیے مضامین لکھنے کا سلسلہ ۲۰۰۹ء میں شروع کیا تھا۔ ماہنامہ ''خواجگان'' لاہور، ماہنامہ ''طاہرہ'' کراچی، ماہنامہ ''اصلاح'' کراچی اور چند اور رسالوں اور اخبارات میں یہ مضامین شائع ہورہے ہیں۔ یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ سب سے زیادہ میری حوصلہ افزائی ماہنامہ ''خواجگان'' لاہور کے جناب محمد تقی جاوا صاحب نے فرمائی۔ ارادہ یہ ہے کہ ان مضامین کو کتابی شکل دے دی جائے تا کہ یہ ایک جگہ محفوظ ہوجائیں۔ وجہ اشاعت نہ کاروباری ہے نہ شہرت۔ پہلے ان

مضامین کو منتخب کیا جو چہاردہ معصومین اور محسنینِ اسلام علیہم السلام سے متعلق ہیں۔

چہاردہ معصومین علیہم السلام کی حیات اور سیرت سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے ان ہستیوں پر کئی مضامین مختلف رسائل کے لیے لکھے۔ ان مضامین میں سے جو سب سے اچھا مضمون لگا وہ میں نے "چراغاں" حصہ اول "قندیل" میں شامل کر لیا۔ بقیہ مضامین میں سے کچھ اس کتاب میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ مزید ان شاء اللہ آئندہ مجموعہ میں۔

سید رفیق عباس جعفری

۱۲/ مارچ ۲۰۱۹

''اَنعَمتَ عَلَیهِم'' کون ہیں؟

قرآن مجید فرقان حمید عالم انسانیت کے لئے قیامت تک مینارۂ ہدایت ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۵۹ گواہ ہے کہ ہر خشک وتر کا بیان قرآن مجید میں موجود ہے۔ اب یہ قاری کا کام ہے کہ اس سے کس طرح ہدایت اخذ کرتا ہے۔

ہر مسلمان دن میں کم از کم دس بار (پانچ واجب نمازوں میں) سورۂ الحمد کی تلاوت کرتا ہے۔ سورۂ الحمد قرآن مجید کا پہلا سورہ ہے اور اتنا جامع ہے کہ پورے قرآن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ابتدائی آیات اللہ تعالیٰ کی تعریف' اس کے جلال و جمال وکمال کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جب کہ آخری آیات "اھدنا الصراط" سے لے کر "الضالین" تک دعائیہ ہیں۔ اللہ سبحانہ' کی تعریف وتمجید کے بعد بندہ اس سے طلب کرتا ہے۔ اس سورہ کی جامعیت کے ضمن میں الحاج سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی مجتہد (لکھنوی) فرماتے ہیں:

''....... حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے اسے تمام قرآن کا خلاصہ بتایا ہے۔ یہ بات جمہورات میں شہرت پا گئی۔ چنانچہ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں دو جگہ ابوزید بلخی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے: "فی ان سورۃ الحمد تنوب عن جمیع القرآن." ہمارے فہم کے مطابق اس کی تشریح یہ ہے کہ تمام قرآن کا مقصد اصلی دو باتیں ہیں۔ اعتقاد اور عمل۔ اعتقاد کے دو شعبے ہیں۔ مبداء اور معاد۔ اور عمل کے دو شعبے ہیں۔ اچھے اوصاف سے اتصاف اور برے اوصاف سے اجتناب۔ سورۂ حمد ترتیب وار ان امور پر مشتمل ہے۔

الحمدلله رب العالمین. الرحمن الرحیم ۔مبداءِ اول یعنی حضرت احدیت کا اعتقاد۔ مالک یوم الدین۔معاد یعنی آخرت۔ایاک نعبد و ایاک نستعین۔اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم ۔اچھے اعمال سے اتصاف اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ۔برے اعمال سے اجتناب۔ معلوم ہوتا ہے کہ سورہ حمد ایک متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح۔وہ اجمال ہے اور مجموعہ کلام مجید اس کی تفصیل۔"(تفسیر فصل الخطاب' جلد اول)

سورہ الحمد کی جامعیت کے بیان کے بعد ہم اس سورہ کی آخری آیت "صراط الذین.....ولا الضالین" پر غور کرتے ہیں۔آیت کا عمومی ترجمہ: ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا' نہ ان کا (راستہ) جن پر (تیرا) غضب ہے اور نہ ان کا جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

علامہ طالب جوہری صاحب نے اپنی تفسیر "احسن الحدیث" میں اس عمومی ترجمہ سے اختلاف فرماتے ہوئے لکھا ہے:".....سب ترجموں میں غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کا ترجمہ 'نہ ان کا راستہ' کیا گیا ہے۔اس ترجمہ کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قواعد نحویہ کے مطابق نہیں ہے۔اس میں مضاف کو مقدر ماننا ضروری ہے۔جب کہ یہ تقدیر بغیر کسی سبب معقول کے خود غیر منطقی ہے اور دوسری خرابی یہ ہے کہ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خدا انسانوں کو مغضوب علیہم اور ضالین کا راستہ بھی دکھلا سکتا ہے۔جبھی بندے یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ وہ راستہ نہ دکھلا بلکہ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ دکھلا۔قواعد نحویہ کے اعتبار سے 'غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ' درحقیقت 'انعمت علیھم ' کی صفت ہے۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ انعام یافتہ لوگ نہ غضب الٰہی کا شکار ہیں' نہ گمراہ ہیں۔"

عمومی ترجمہ اور علامہ طالب جوہری صاحب کے ترجمہ کے بعد اس آیت کی تفسیر کے لئے مفسر قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی صاحب کی "خلاصۃ التفاسیر" سے استفادہ کرتے ہیں:

یہاں پر لوگوں سے مراد انبیاء' صدیقین (یعنی جو قول و عمل میں سچے ہیں)'شہداء اور صالحین (یعنی نیک بندے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ صراط مستقیم یعنی" سید ھا راستہ" سے مراد صاحبان نعمت تک رسائی' ان سے محبت' ان کی معرفت' قلبی اور عملی وابستگی اور ان کے طریقۂ زندگی کو اختیار کرنا ہے۔

محققین نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہدایت کے لئے قرآن کافی نہیں' صاحبانِ نعمت کا دامن پکڑنا (عملی وابستگی) ہی ہدایت ہے۔ اس لئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں (۱) قرآن' جو اللہ کی کتاب ہے (۲) میری عترت اہلِ بیت۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک اختیار کئے رہو گے تو میرے بعد ہرگز ہرگز نہ گمراہ ہو گے اور یہ دونوں کبھی ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پلٹ آئیں۔" (صحیح مسلم شریف)

غرض "نعمت" سے مراد جاہ و مال دنیا یا زر زمین' زن نہیں' نعمت سے مراد وہ ہدایت اور توفیق ہے جو خدا کے اطاعت گزاروں کے شاملِ حال رہی ہے۔ (معانی الاخبار۔ حدیث از علی ابن ابی طالب)

یہی صاحبان نعمت بندے' خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سورۂ حمد میں عبد و معبود کے درمیان خدا ان بندوں کا ذکر نہ فرماتا۔ اسی لئے مرشد تھانوی نے لکھا "صراط مستقیم میسر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیرویِ اہل صراط مستقیم کی' کی جائے اور اس کے لئے محض اوراق کتب کافی نہیں" (تفسیر ماجدی)

صاحبان نعمت بندے کون ہیں؟

خداوندِ عالم ایسے بندوں کی نشان دہی قرآن مجید میں اس طرح فرماتا ہے:

ترجمہ آیت ۶۹، سورۃ النساء: "اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں تو یہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام و احسان کیا ہے (۱) انبیاء (۲) صدیقین (۳) شہداء (۴) صالحین۔

پھر ہدایت صرف صاحبانِ نعمت تک رسائی ہی کا نام نہیں' ثباتی پہلو کے ساتھ ساتھ سلبی پہلو بھی ضروری ہے یعنی ان اشخاص اور جماعتوں سے بیزاری اور قطع تعلق بھی ضروری ہے جو صراط مستقیم سے دوری کا باعث ہیں۔ ان ہی صاحبان نعمت سے تعلق جوڑے رہنے کو دین کی

اصطلاح میں "تولاّ" اور اللہ کے مغضوب اور گمراہ لوگوں سے قطع تعلق کو "تبرّا" کہتے ہیں۔ حضرت ابوعبداللہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "مغضوب علیھم "یعنی جن پر خدا کا غضب ہوا" سے مراد اہل بیت رسولؐ سے دشمنی کا اظہار کرنے والے ہیں۔ اور "ضالین "یعنی گمراہوں سے مراد" وہ شکوک واوہام میں مبتلا لوگ ہیں جو معرفت امام نہیں رکھتے۔" (تفسیر علی بن ابراہیم)

بعض روایات میں 'مغضوب علیھم' سے مراد یہودی اور 'ضالین' گمراہوں سے مراد نصرانی بھی ہیں۔

غرض صاحبان نعمت چار قسم کے لوگ ہیں (۱) "نبیین" جو اللہ تعالیٰ کا پیغام لانے والے اور اس کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ اللہ اپنے علم کی بناء پر ان کا انتخاب فرماتا ہے۔ (۲) "صدیقین" جو قول وعمل کے سچے اور کھرے ہیں۔ ہمیشہ ہر بات سچ اور ہر کام سچائی و خلوص دل سے انجام دیتے ہیں۔ اُن کے سید وسردار حضرت علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔ جنہوں نے کبھی غیر اللہ کے سامنے سر نہ جھکایا اور قول وعمل کے ایسے سچے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "کل میں اُس کو علم دوں گا' جو مرد ہو گا' جو خدا اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہو گا اور خدا اور اس کا رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔" (صحیح بخاری شریف)

اور حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

"علیؑ کا ذکر کرنا بھی عبادت ہے" یہ حدیث غیر مشروط ہے۔ یعنی علیؑ کا کوئی عمل ایسا نہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو۔ اگر ایک قول یا عمل بھی اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا تو مطلقاً علیؑ کا ذکر عبادت نہ قرار پا سکتا تھا۔ اسی لئے تو امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا: "انا صدّیق الاکبر" یعنی "میں صدیق اکبر ہوں"

عالم اسلام آج بھی حضرت علیؑ کو "کرم اللہ وجہہ" کہتا ہے۔ یعنی اللہ نے ان کے چہرے کو غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے محفوظ اور مکرّم رکھا۔ اعلیٰ ترین معنی میں تو صدیق کے مصداق حضرت علیؑ اور ائمہ معصومین ہیں لیکن ہر وہ شخص جو قول وفعل میں جتنا سچا ہو گا اتنا ہی صدیق ہو گا۔ کیوں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "بندہ سچ بولتا رہتا ہے' سچ بولتا رہتا ہے' یہاں

تک کہ اللہ اس کو صدیقین میں لکھ دیتا ہے۔" خاص کر کاروباری معاملات میں سچ بولنے والا یقیناً صدیق ہے کیوں کہ وہ نقصان اٹھا کر سچ بولتا ہے۔

(۳) تیسرا گروہ "شہداء" کا ہے جو اللہ کی راہ میں جان دے کر اپنے خون سے اپنی گواہی کو ثابت کرتے ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مالی، جسمانی اور دماغی قربانیاں حق کے لئے دیتے ہیں۔ اور (۴) "صالحین" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال ان کے برے اعمال پر غالب ہوں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے: "جس کے نیک عمل (برے عمل پر) بھاری ہوں گے وہ اس زندگی میں ہوگا جس سے وہ خوش ہوگا۔"

شہداء کے سید و سردار امام حسنؑ و امام حسینؑ ہیں کیوں کہ ان کی شہادت گویا رسولؐ کی شہادت ہے اور ان کو حضورؐ نے "جنت کے جوانوں کے سردار" فرمایا ہے۔ ان کی بیش بہا قربانیاں عالمین میں آشکار ہیں۔ اللہ نے قربانی کا معیار یہ پیش فرمایا ہے:۔

"تم ہرگز ہرگز نیکی تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم اس شئے میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمھیں محبوب ہے"۔ (آل عمران۔ آیت ۹۲)

حضرت امام حسینؑ نے "اس میں سے کچھ" نہیں بلکہ "سب کچھ" اللہ کی راہ میں قربان کردیا۔ گویا قرآنی معیار سے بھی ان کی قربانی بلند تر ثابت ہوئی۔ بقول شاعر:

اہلِ بیتِ پاک کے ہر سانس کو اے مدعی
ہاں ملا کر دیکھ لے آیات قرآنی کے ساتھ

اور تمام امت کے صالحین کے سید و سردار اہل بیت رسولؐ کے امامؑ ہیں، کیوں کہ وہ معصوم ہیں اور منصوص من اللہ ہیں وہ ہر گناہ سے پاک ہیں ان کی نیکیاں ضرب المثل ہیں۔ صاحب "تحفۂ" تک نے لکھا ہے: "اگر امام کے معنی سب سے آگے ہونے کے ہیں تو اس معنی میں "آل محمدؐ" ہی ساری امت کے امام ہیں اس لئے کہ ہر ہر نیکی میں وہ ساری امت سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

خطبہ غدیر میں حضور اکرمؐ نے فرمایا:

جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب اللہ نے ہماری خلقت کا ارادہ

فرمایا تو ہمارے نور کو صلب آدمؑ میں قرار دیا جو ان کی پیشانی میں ضو بار رہا۔ پھر یہی نور ان کے وصی حضرت شیثؑ کی طرف منتقل ہوا۔ انہیں جناب آدمؑ کی وصیت تھی کہ اس نور کو صرف پاکیزہ عورت کے رحم میں منتقل کریں۔ لہٰذا آنحضرتؐ کے بزرگوں نے اپنے وصی کے لیے پاک و پاکیزہ عورتوں کا انتخاب کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہم نیک مردوں اور پاک و پاکیزہ عورتوں کے اصلاب و ارحام سے ہوتے ہوئے صلب حضرت عبدالمطلبؑ تک پہنچے۔ وہاں سے اللہ نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصہ جناب عبداللہ سے جناب آمنہؑ کی طرف منتقل ہوا جس سے میں ہوں اور دوسرا جناب ابوطالبؑ سے جناب فاطمہ بنت اسدؑ تک پہنچا جس سے علیؑ ہیں۔'' (بحار، جلد ۱۵، ص ۱۵)

مفسّر قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی صاحب کی مندرجہ بالا پُرمعنی تفسیر سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ ''انعمت علیھم'' یا صاحبانِ انعام سے مراد پیغمبر اکرمؐ اور ان کی آلِ اطہار ہیں۔ (عرصہ ہوا کراچی میں ہندوستان سے آئے ہوئے ذاکرِ اہلبیت حضرت سہیل آفندی نے فرمایا تھا کہ 'انعمت' پانچ حروف پر مشتمل ہے جو پانچ اصولِ دین کی نشان دہی کرتا ہے، یعنی الف: امامت، نون: نبوت، عین: عدل، میم: معاد اور تا یات توحید کی)۔

جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو سورۂ فاتحہ کے ذریعہ دُعا کا طریقہ سکھایا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ''صاحبانِ انعام'' کا تعارف نہ کراتا۔ چنانچہ ان حضرات کا تعارف کبھی طٰہٰ کہہ کر کرایا، کبھی ان کی عصمت کی نشان دہی آیۂ تطہیر سے کی، ان کی صداقت کو آیۂ مباہلہ سے عملاً منوایا، ان کی مودّت کی فرضیت آیۂ مودّت سے بتائی، ان کے عملی ایثار کی شناخت اور ان پر انعامات کی بارش کا تذکرہ سورۂ دہر میں واضح کیا، ان کے خیرِ کثیر ہونے کی بشارت سورۂ کوثر میں دی۔ غرض یہ کہ ہر ہر طرح سے ان کے مقام و مرتبہ اور ان کو دیئے جانے والے انعامات کے تذکروں سے اللہ کی پاک کتاب بھری پڑی ہے۔

☆☆☆☆☆

سرکارؐ کی آمد.....

مولائے کائنات امیرالمومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اپنے خطبہ میں اس معاشرے کا احوال بیان کیا ہے۔ جس میں ختمی مرتبت سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث کیا گیا تھا۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"اللہ نے اپنے رسول کو اس وقت بھیجا جب رسولوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، امتیں عرصۂ دراز سے خواب غفلت میں پڑی ہوئی تھیں، فتنے سر اٹھا رہے تھے، تمام چیزوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، دنیا کی رونق ختم ہو چکی تھی، اس کی فریب کاریاں کھلی ہوئی تھیں، اس کے پتے زرد ہو گئے تھے اور پھلوں سے ناامیدی ہو چکی تھی، پانی زمین میں تہ نشین ہو چکا تھا۔ ہدایت کے نشان مٹ گئے تھے، ہلاکت و پستی کے پرچم کھلے ہوئے تھے، دنیا اپنے باشندوں کے سامنے تیور چڑھائے ہوئے کھڑی ہوئی تھی، اس کا پھل فتنہ تھا، اس کی خوراک مردار تھی، اس کے اندر کا لباس خوف اور ظاہری لباس تلوار تھی۔" (نہج البلاغہ، خطبہ ۸۹)

بعثت نبوی سے قبل جزیرۃ العرب کے معاشرے میں ظلم و فساد کا دور دورہ تھا۔ وہاں کے لوگوں کا کوئی متحدہ بلاک نہیں تھا اور ان کی اجتماعی و ثقافتی خصوصیات جو کہ صحرائی ماحول کی پیداوار تھیں، ان کی زوال پذیر حالت کو روکنے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ تباہی کے آثار

جزیرۃ العرب کے معاشرے میں نمایاں ہو چکے تھے اور ان کے درمیان جو معاہدے ہوتے تھے اس کی ایک اجتماعی خصوصیت تھی، لیکن اس کے تعدد سے یہ بات عیاں ہے کہ ان کے معاشرے میں مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔

تاریخ میں اس معاشرے کی کوئی ایسی اصلاحی و انقلابی تحریک نظر نہیں آتی، جو اس میں ابھری ہو اور اس نے انہیں بہتر و خوش حال زندگی کی طرف دعوت دی ہو۔ ہاں پراگندہ حالت میں بعض لوگوں کی تحریک ضرور تھی جسے اجتماعی تعدی کا ردعمل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بانی جزیرۃ العرب کے بہت کم لوگ تھے اور یہ تحریک نہ تو ایک نظریہ کی حد تک پہنچ سکی اور نہ ہی معاشرہ میں کوئی انقلاب برپا کر سکی (السیرۃ النبویہ)۔ معاشرۂ قریش میں خلفشار اور اختلاف کو خانۂ کعبہ کی تعمیر نو کے سلسلے میں سب دیکھ چکے تھے۔ حالانکہ اس وقت قریش عرب کے قبائل میں سب سے زیادہ معزز اور متحد تھے۔ اس معاشرے کی تباہی اور شکست و ریخت کو جزیرہ نمائے عرب میں مقیم یہودیوں کی دھمکیوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے یہود جزیرہ نما عرب کے لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ بشریت کو نجات دلانے والا آسمانی شریعت کے ساتھ عنقریب ظہور کرنے والا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک نبی ظہور کرے گا جو تمہارے بتوں کو توڑ دے گا۔ (بحارالانوار، السیرۃ النبویہ، البقرہ، ۸۹)

رسولؐ کے آباء و اجداد کا ایمان:۔

رسولؐ کی ولادت اور پرورش ایسے موحد گھرانے میں ہوئی جو بلند اخلاق اور اعلیٰ اقدار کا حامل تھا۔ آپؐ کے جد عبدالمطلب کے ایمان کا علم تو ان کی اس دعا سے واضح ہے جو انہوں نے اس وقت کی تھی جب ابرہہ نے خانۂ کعبہ مسمار کرنے کے لیے چڑھائی کی تھی۔ اس وقت کعبہ کی حفاظت کے لیے جناب عبدالمطلب نے کسی بت سے التجا کی بجائے اللہ واحد پر توکل کیا تھا۔ جناب عبدالمطلب اپنے علم و ایمان سے نبی اکرمؐ کی عظمت اور ان کے

مستقبل سے واقف تھے۔ انہوں نے جناب رسالت مآب کا واسطہ دے کر اس وقت بارش کی دعا کی تھی جب حضورؐ بہت کم سن تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی قدر و منزلت ہے۔ جناب عبدالمطلب نے جناب امِ ایمن سے فرمایا تھا کہ خبردار اس بچے (جناب رسالت مآبؐ) سے غافل نہ ہونا۔

جناب عبدالمطلبؑ کے بعد:

جناب عبدالمطلبؑ کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کی تعداد کے لحاظ سے جناب عبدالمطلبؑ کو "ابوالسادۃ العشر" کہا جاتا تھا۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں:

عبداللہ، ابوطالب، حمزہ، عباس، زبیر، حارث، جحل، مقوم، ضرار اور ابولہب۔

ان میں سے پہلی تین شخصیتوں کو تاریخ اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ عباس بھی مسلمان ہوئے جن کی نسل میں سلاطین بنی عباس مشہور ہیں۔ ابولہب کا نام مخالفت کے لحاظ سے تاریخ میں نمایاں ہے۔

جناب عبداللہ:

جناب عبداللہ جناب رسالت مآبؐ کے والد بزرگوار ہیں۔ جناب عبدالمطلبؑ کے زمزم کھودنے کے موقع پر جب قریش نے ان کی مخالفت کی تو انہیں اپنی تنہائی کا احساس ہوا کیوں کہ اس وقت ان کے ایک فرزند حارث تھے اور وہ بھی کم سن۔ اس لیے انہوں نے نذر مانی کہ اگر ان کے بیٹوں کی تعداد پوری دس ہو جائے تو وہ ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ اللہ نے ان کی تمنا پوری کی اور ان کے دس بیٹے ہو گئے۔ انہیں اب اپنی نذر کی تکمیل کا خیال آیا۔ جناب عبدالمطلب نے قرعہ کے ذریعہ بیٹے کا انتخاب کرنے کا ارادہ کیا۔ قرعہ جناب عبداللہ کے نام پر نکلا۔ ماں، بہنیں، بھائی اور دوسرے لوگ سدّ راہ ہوئے کیوں کہ جناب عبداللہ کو سب لوگ بہت چاہتے تھے۔ سب نے مشورہ دیا کہ اس کے عوض

میں اونٹوں کی قربانی کی جائے۔ جناب عبدالمطلبؑ نے جناب عبداللہ کے مقابل دس اونٹ کے نام کا قرعہ ڈالا مگر قرعہ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ پھر بیس، پھر تیس، کرتے کرتے پورے سو اونٹوں کی قربانی طے پائی۔ اس طرح سو اونٹوں کی قربانی کے عوض جناب عبداللہ کی قربانی موقوف ہوئی۔ حضور اکرمؐ اسی لیے فرماتے تھے کہ میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔ (یعنی ایک جناب اسماعیلؑ اور دوسرے جناب عبداللہ)۔

پرورش سرکار رسالتؐ میں آپؐ کے چچا جناب ابوطالبؑ کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ تبلیغ رسالت کے پیش نظر وہ بھی تا حیات رسولؐ کی حفاظت و پشت پناہی کرتے رہے۔ دعوت ذوالعشیرہ میں حضورؐ کو سپورٹ کرنا، خانۂ کعبہ میں حضورؐ کی دوران نماز حفاظت کرنا ایسے امور ہیں جو ان کے ایمان و ایقان کی بیّن گواہی ہیں۔ قریش کے بائی کاٹ اور شعب ابوطالب کی محصوری اور اذیتیں جھیلنا ان کے ایمان اور نصرت نبوت کے دوسرے ثبوت ہیں۔ حضورؐ کی حدیث کہ "میں پاک و پاکیزہ صلبوں سے پاک و پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ کے آباء و اجداد اور مائیں ہر شرک و رجس سے پاک تھیں۔

بشریت سخت و دشوار حالات سے گزر رہی تھی کہ نور الٰہی چمکا اور اللہ کے بندوں اور روئے زمین پر بسنے والوں کو بہترین زندگی اور ابدی سعادت کی بشارت دی اور سرزمین حجاز سن ایک عام الفیل مطابق ۵۷۰ء کو ماہ ربیع الاول بابرکت ہو گیا۔ معصومین علیہم السلام کے قول کے مطابق آپؐ کی ولادت باسعادت ۱۷ ربیع الاول بروز جمعہ طلوع فجر کے بعد ہوئی۔

تاریخ و حدیث کی معتبر کتابوں میں وہ عجیب و غریب حوادث بیان ہوئے ہیں جو آپؐ کی ولادت کے دن رونما ہوئے۔ مثلاً فارس کے آتش کدے کی آگ بجھ گئی۔ شدید زلزلہ آیا کہ جس سے عیسائیوں اور یہودیوں کے گرجا و کلیسا منہدم ہو گئے۔ ہر وہ چیز اپنی جگہ سے اکھڑ گئی جس کی پرستش کی جاتی تھی اور خانۂ کعبہ میں نصب ہوئے بت منہ کے بل گر پڑے۔

کاہنوں اور ساحروں کے اعداد و شمار اور حساب کتاب بیکار ہو گئے۔ کچھ ایسے ستارے طلوع ہوئے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ جب آپؐ پیدا ہوئے تو آپ کی زبان پر "اللہ اکبر و الحمدللہ کثیرا و سبحان اللہ بکرۃ و اصیلا" تھا (تاریخ یعقوبی، سیرۃ الحلبیہ)۔

نبیؐ نے اپنے دو ناموں "محمدؐ" و "احمدؐ" سے شہرت پائی۔ قرآن مجید نے دونوں کا ذکر کیا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آپؐ کے جد عبدالمطلب نے آپؐ کا نام محمدؐ رکھا تھا اور جب ان سے محمدؐ کی وجہ تسمیہ معلوم کی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ آسمان اور زمین پر ان کی تعریف کی جائے (سیرۃ الحلبیہ)۔ اسی نام کی بشارت حضرت عیسیٰؑ کی زبانی انجیل میں دی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید نے اس کو بیان کیا ہے اور علمائے اہل کتاب نے اس کی تصدیق کی ہے۔ اللہ نے اسے اس طرح بیان فرمایا ہے: "مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد" (اور میں تمہیں اپنے بعد ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمدؐ ہوگا) (سورۂ صف (۶۱، آیت ۶)۔ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے کہ ایک شخص کے دو نام، دو القاب اور دو کنیتیں ہوں۔ جزیرۃ العرب وغیرہ میں ایسا ہوتا آیا ہے۔

یتیم الابوین:

والدِ بزرگوار کا سایہ تو آپ کی پیدائش سے پہلے ہی اٹھ گیا تھا، چھ برس کے سن میں شفقتِ مادری سے بھی محروم ہو گئے۔ جناب آمنہ آپ کو لے کر مدینہ اپنے میکے گئی تھیں۔ واپسی میں بیمار ہوئیں اور مقام ابواپر انتقال فرمایا۔ (طبقات ابن سعد و سیرت ابن ہشام)

یہ حقیقت ہے کہ خود اعتمادی اور برداشت مشکلات کے لیے بسا اوقات یتیمی مددگار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بچپن ہی میں باپ اور ماں دونوں کے سہارے سے محروم کر کے ان کے جوہر کمال میں اضافی سبب کے تصور کا خاتمہ کر دیا۔

دادا کی تربیت:

ماں باپ کے بعد جناب رسالت مآب کی تربیت کا فریضہ آپ کے جد بزرگوار جناب عبدالمطلب نے انجام دیا۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر اپنی اولاد کی اولاد پر اپنی محبت اور توجہ مرکوز کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کی جناب عبدالمطلب حضورؐ کے بچپن ہی میں ان کی عظمت و جلالت دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے جو مسند کعبہ کے پاس بچھائی جاتی تھی اس پر ان کی عدم موجودگی میں ان کے بیٹوں میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ بیٹھ جائے مگر رسولؐ جب آتے تو بے تکلف اس مسند پر بیٹھ جاتے۔ کبھی چچا ہٹانا بھی چاہتے تو دادا فرماتے کہ میرے بچہ کو یہیں بیٹھنے دو۔ واللہ اس کی ایک بڑی شان ہے جو ظاہر ہو کر رہے گی (ابن ہشام)۔

جناب ابوطالبؑ کی مشفقانہ پرورش:

حضور اکرمؐ کی عمر آٹھ برس تھی کہ آپؐ کے بزرگ مرتبہ اور انتہائی شفیق دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ دادا بھی ایسے دور اندیش تھے کہ پوتے کو یوں ہی بے آسرا نہیں چھوڑا۔ اپنے انتہائی ذمہ دار اور بردبار بیٹے کو رسولؐ کی پرورش کے لیے منتخب کیا۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ نسلِ ابراہیمؑ میں جو صفات و اخلاق تو ارث کے طور پر چلے آ رہے تھے اور جن کی تکمیل کے لیے قدرت نے اس آخری رسولؐ کو بھیجا تھا ان صفات کے حامل اولاد عبدالمطلب میں جناب ابوطالب ہی نظر آتے تھے۔ لہٰذا ان ہی کی آغوشِ عطوفت اس پیغمبرؐ کے لیے موزوں و مناسب معلوم ہو رہی تھی۔ جناب ابوطالب نے جس شفقت و محبت سے رسول اللہؐ کی پرورش فرمائی وہ تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جانے کی مستحق ہے۔ آثار و مشاہدہ سے یہ بات نمایاں تھی کہ جیسی محبت انہیں رسول اللہؐ سے ہے وہ اپنی اولاد سے بھی نہیں ہے۔

محرمِ مریم جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ:

نورِ رسالت کی حفاظت کے لیے اللہ نے پہلے سے فانوس تیار کر رکھا تھا۔ وہ فانوس

جناب ابوطالبؑ اور جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ کی آغوش کی صورت میں تھا۔ جناب ابوطالبؑ باہر کی دنیا کے لیے سینہ سپر بنے تو جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ درون خانہ کفالت کی ذمہ دار قرار پائیں۔ یہ شرف ان ہی کے لیے وقف تھا۔ جب جناب عبدالمطلب نے وقت وفات آپؐ سے پوچھا کہ بیٹا تم اپنے چچاؤں میں سے کس کے پاس رہنا پسند کرو گے تو سرکار رسالتؐ نے جناب ابوطالبؑ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس لیے کہ جناب عبدالمطلبؑ کے بعد آپ ہی وصی ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ تھے اور ان کے گھر میں آپ کی پھوپھی جناب فاطمہ بنت اسدؑ تھیں جو دل و جان سے زیادہ آپ کو عزیز تھیں۔ (جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ جناب ابوطالبؑ کی عم زاد تھیں)۔

جناب ابوطالبؑ یتیم عبداللہ مرسلِ اعظمؐ کو گھر لے کر آئے۔ اپنی شریک حیات کو آواز دی جو پہلے ہی سے محبت و شفقت رسول میں سرشار تھیں اور فرمایا: ''فاطمہؑ یہ مرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ کوشش کرنا کہ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے آرام اور ضروریات کا پورا خیال رکھنا۔'' جناب فاطمہ بنت اسدؑ شوہر کے اس کلام کو سن کر مسکرائیں اور خوش دلی سے معصومؐ کے لیے بانہیں پھیلا دیں۔ پھر فرمایا: ''اے مرے سرتاج! کیا محمدؐ جو میرا بیٹا ہے اس کے بارے میں مجھے نصیحت کر رہے ہو۔ یہ مجھے اپنے نفس اور اولاد سے زیادہ محبوب ہے۔'' جناب ابوطالبؑ یہ جواب سن کر خوش ہو گئے۔ بی بی نے تمام عمر اپنے اس وعدہ کا پاس کیا۔ وہ اپنی تمام اولادوں سے زیادہ جناب رسول اکرمؐ پر مہربان رہیں اور سب پر ان کو مقدم رکھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ شعب ابی طالبؑ میں جناب رسالت مآبؐ کا بستر تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ اپنی اولاد ان کے بستر پر اس لیے لٹائی جاتی تھی کہ اگر دشمن آئے تو حضورؐ کی جان بچ جائے، چاہے ان کی اولاد قربان ہو جائے۔ آپ کی مرسلِ اعظمؐ سے یہ ہمدردی صرف اس

لیے نہیں تھی کہ وہ آپؐ کے بھتیجے تھے بلکہ اس لیے تھی کہ وہ عارف نبوت و معجزات رسالت تھیں۔ شیخ مفیدؒ کتاب "روضۃ الواعظین" میں نقل کرتے ہیں کہ شب ولادت باسعادت جناب رسالت مآبؐ، جناب فاطمہ بنت اسدؑ جناب آمنہؑ بنتِ وہب کے پاس موجود تھیں۔ جو عجائب وغرائب جناب آمنہؑ نے اس رات مشاہدہ کیے، جناب فاطمہ بنت اسدؑ نے بھی دیکھے۔ صبح کو جب جناب ابوطالب طواف خانہ کعبہ کر کے گھر تشریف لائے تو جناب فاطمہ بنت اسدؑ نے عرض کی کہ رات کو اس قدر عجائب و خوارق عادات مشاہدے کیے کہ زبان ان کے بیان سے قاصر ہے۔ آج آمنہؑ کے ہاں ایک مولود مسعود پیدا ہوا ہے۔ جس کے وجود نے عالم کو نورانی کر دیا۔ یہاں تک کہ ہم نے درختان ہجر (ایک شہر مستہائے ملک یمن میں ہے) آنکھوں سے دیکھے۔ جناب ابوطالبؑ یہ مژدہ فرحت افزا سن کے خوش ہوئے اور کہا: "اے فاطمہ! تم کو بھی یہ عنایتِ الٰہی ملنے والی ہے۔ کچھ سال بعد تمہارے ہاں بھی ایک فرزند پیدا ہو گا جو دنیا کو اپنے نور سے روشن کر دے گا۔ جو عجائبات تم نے اب دیکھے ہیں اس وقت بھی مشاہدہ کرو گی۔

مآخذ

(۱) "منارہ ہدایت، خاتم الانبیا محمد مصطفیٰؐ" مؤلفین: سید منذر حکیم اور عدی غریباوی، مترجم: نثار احمد زین پوری۔

(۲) "تاریخ اسلام" مولانا سید علی نقی النقوی۔

(۳) "فخر مریم و صدف امامت، زندگانی حضرت فاطمہ بنت اسد سلام اللہ علیہا" مولفہ الحاج مولانا مقبول احمد نوگانوی ممتاز الافاضل۔

☆☆☆☆☆

ہمارے نبیؐ

سورۂ جمعہ کی دوسری آیت میں ارشاد باری ہے: (ترجمہ) ''اس اللہ نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا ہے جو انہیں میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے، ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اگرچہ یہ لوگ بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔'' اس آیۂ وافی ہدایہ کی روشنی میں حضور ختمی مرتبت کی چند صفات عالیہ کا مطالعہ اس مضمون کا ہدف ہے۔

ا۔ امی عالم:

حضور اکرم کا یہ امتیاز تھا کہ آپؐ نے کسی بشر سے پڑھنا اور لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ ارشاد رب العزت ہے: (ترجمہ) ''اور اے پیغمبرؐ، آپؐ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے ورنہ یہ اہل باطل شبہ میں پڑ جاتے'' (سورہ ۲۹/العنکبوت، آیت ۴۸)۔ قرآن کی بیان کی ہوئی اس حقیقت کی کسی نے تردید نہیں کی ہے۔ آپ اس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جو اپنی نری جاہلیت کے حوالہ سے مشہور اور علوم ومعارف سے بہت دور تھی۔ اس زمانہ کو زمانۂ جاہلیت کا نام دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ نام اس عظیم الشان عالم نے دیا ہے جو علم وجہالت اور عقل وحماقت کی حقیقت سے کما حقہ باخبر تھا۔

مزید برآں وہ ایسی کتاب لائے تھے جو علم وثقافت، فکر ونظر کی دعوت دیتی ہے اور علوم ومعارف کے بہت سے اقسام واصناف پر مشتمل ہے، آپؐ نے لوگوں کو نئے اسلوب سے

کتاب وحکمت کی تعلیم دینا شروع کی۔ یہاں تک کہ ایک ایسی منفرد تہذیب کو وجود بخشا کہ جس نے اپنے علوم ومعارف کے ذریعہ مشرق ومغرب کو متزلزل کر دیا اور اس کی ضوفشانی و تابناکی آج تک اسی طرح برقرار ہے۔

دنیا والوں کے لحاظ سے آپؐ امی تھے لیکن جاہلیت ونادانی اور بت پرستوں سے جنگ کرتے رہے۔ انہیں استوار دین اور عالمی شریعت کے ساتھ بشریت کی طرف بھیجا گیا، جو وقت گزرنے کے ساتھ بشریت کو چیلنج کرتی چلی آرہی ہے (لیکن ابھی تک کوئی اس کا جواب نہیں لا سکا ہے)۔ بے شک آپؐ اپنے علم ومعارف، حکیمانہ کلمات، عقلی وثقافتی رجحان اور اپنی تربیت کے اسالیب کے لحاظ سے معجزہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''پس تم اللہ اور اس کے رسولؐ نبی امی پر ایمان لاؤ جو کہ اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کا اتباع کرو، ہوسکتا ہے اس طرح تم ہدایت پا جاؤ۔''

(سورہ ۷/الاعراف، آیت ۱۵۸)

نیز فرماتا ہے:

''اور اللہ نے تمہیں کتاب وحکمت سے نوازا اور تمہیں ان چیزوں کا علم دیا جن کو تم نہیں جانتے تھے اور یہ تم پر اللہ کا بڑا کرم ہے۔'' (سورہ ۴/النساء، آیت ۱۱۳)

اس وقت اللہ نے ان پر وحی نازل کی اور انہیں کتاب وحکمت کے علم سے سرفراز کیا اور انہیں نور، سراج منیر، برہان، شاہد، رسول مبین، امین، خیر خواہ، ناصح، بشارت دینے والا، یاد دلانے والا اور ڈرانے والا قرار دیا۔ (مائدہ: ۱۵/۱۹، احزاب ۴۶، نساء ۱۷۴، فتح ۸، زخرف ۲۹، اعراف ۶۸، غاشیہ ۲۱، اسراء ۱۰۵)۔ اللہ نے ان کے سینہ کو کشادہ کیا اور انہیں وحی قبول کرنے اور اس معاشرہ کی ہدایت کرنے کے لیے تیار کیا جو عصبیت اور جاہلیت والی انانیت

میں غرق تھے۔ تبلیغ وتربیت اور تعلیم کے میدان میں بشریت نے آپ کو عظیم الشان قائد پایا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا کہ جاہلیت سے بھرا معاشرہ چند برسوں میں کتاب ہدایت اور مشعل علم کا ایک طاقت ور وامین نگہبان ومحافظ بن گیا اور تحریف وتصحیف کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے عزم محکم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اس دائمی کتاب اور اس رسول امّی کا معجزہ ہے جو جاہلیت کے معاشرے میں خرافات اور اساطیر سے بہت دور تھا۔ اصل میں خدائی نورِ بصیرت آپؐ کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔

۲۔ مسلمِ اول:

خالقِ کائنات، سرچشمۂ وجود، اللہ کے سامنے سر جھکانا، اس کی عظیم قدرت اور اس کی حکمت کے نفاذ کے سامنے سراپا تسلیم ہونا نیز ایک، اکیلے اور بے نیاز معبود کی بندگی کا اقرار کرنا وہ منزل ہے جس سے ہر انسان کو گزرنا چاہیے تاکہ وہ خدائی انتخاب واصطفیٰ کے لائق بن جائے۔ قرآن مجید نے نبی کریمؐ کے لیے اسی کی گواہی دی ہے۔ ارشاد ہے: (ترجمہ) آپ کہہ دیجیے کہ میرے رب نے صراط مستقیم کی طرف میری ہدایت کی ہے یعنی ایک مضبوط دین ابراہیم کی جو باطل سے کترا کے چلتے تھے اور مشرکین سے نہ تھے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں (سورۂ انعام، آیت ۱۶۱ تا ۱۶۳)۔ یہ تمغۂ کمال ہے جس کو اس بندۂ مسلم نے حاصل کیا ہے اور اس کی بندگی میں سب پر فوقیت لے گئے ہیں۔ اس مثالی عبودیت کی جھلک آپؐ کے قول وفعل میں نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں: ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔'' (امالی طوسی ج ۲ ص ۱۴۱)۔ آپؐ وقتِ نماز کا انتظار فرماتے تھے۔ بارگاہ الٰہی میں پہنچنے کا آپ کو شدید اشتیاق رہتا تھا۔ چنانچہ اپنے موذن حضرت بلالؓ سے

فرماتے تھے: ''اے بلالؓ ہمیں خوش کرو۔'' (بحار الانوار ج ۸۳ ص ۱۶)۔ آپؐ اپنے اہل و عیال سے گفتگو کرتے تھے وہ بھی آپؐ سے محوِ سخن رہتے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں ہیں (اخلاق النبی وآدابہ ص ۲۵۱)۔ جب نماز پڑھتے تھے تو آپؐ کے سینہ اقدس سے ایسا زمزمہ بلند ہوتا تھا جیسے پتیلی میں کچھ پکنے کی آواز ہوتی ہے (اخلاق النبی وآدابہ ص ۲۰۱)۔ اللہ کے خوف میں اتنا روتے تھے کہ آپ کا مصلّٰی تر ہو جاتا تھا (سنن النبی ص ۳۲)۔ اتنی نمازیں پڑھتے تھے کہ آپؐ کے پیروں پر ورم آ جاتا تھا۔ صحابہؓ کے کہنے پر آپ فرماتے تھے: ''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

(اخلاق النبی ص ۱۹۹، صحیح بخاری ج ا ص ۳۸۱ ح ۱۰۷۸)

آپ پورے ماہ رجب و شعبان اور ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھتے تھے (وسائل الشیعہ ج ۴ ص ۳۰۹)۔ رمضان آتا تو آپؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور نماز و دعا میں بہت گڑگڑاتے تھے (سنن النبی ص ۳۰۰)۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں تو آپؐ ازواج سے بھی پرہیز کرتے تھے، شب بیداری کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ آپؐ اپنی پوری طاقت کو عبادت میں صرف کرتے تھے (کافی ج ۴، ص ۱۵۵)۔ ''دعا عبادت کا لب لباب ہے۔'' (محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۲۸۲)۔ ''دعا مومن کا اسلحہ ہے، دین کا ستون ہے اور زمین و آسمان کا نور ہے۔'' (محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۲۸۴)۔ آپ ہمیشہ اللہ سے لو لگائے رہتے تھے، دعا اور تضرع کے ذریعہ اللہ سے اپنا رشتہ مضبوط رکھتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے دعا کرتے تھے۔ ہر روز اللہ سے ستر مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ باوجودیکہ آپ معصوم تھے پھر بھی اللہ کی بارگاہ میں ہر روز ستر بار توبہ کرتے تھے (بحار الانوار ج ۱۶ ص ۲۱۷)۔ جب بیدار ہوتے تھے تو پہلے اللہ کو سجدہ کرتے تھے (بحار الانوار ج ۱۶ ص ۲۵۳)۔ ہر روز تین سو ساٹھ بار اللہ کی حمد فرماتے اور کہتے: ''الحمد للہ رب العالمین کثیرا علیٰ کل حال۔ (کافی ج ۲ ص

۵۰۳)۔ قرآن خوانی تو آپ کا شغف اور محبوب مشغلہ تھا۔ جب آپؐ نے عبادت میں بہت زیادہ جانفشانی کی تو جبرئیلؑ نازل ہوئے اور آپ کی خدمت میں اللہ کا پیغام پہنچایا: "طٰہٰ، ہم نے آپؐ پر اس لیے قرآن نازل نہیں کیا ہے کہ آپؐ خود کو مشقت میں ڈالیں۔" (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱،۲)۔

۳۔ اللہ ہی پر بھروسہ:

اپنے رسولؐ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "کیا اپنے بندے کے لیے اللہ کافی نہیں ہے؟" (سورۂ زمر، آیت ۳۶)۔ نیز فرماتا ہے: "اور غالب ورحیم اللہ پر بھروسہ کیجیے جو آپ کو اس وقت بھی دیکھتا رہا ہے جب آپ نبوت پر قائم ہوئے اور سجدہ کرنے والوں (کے صلب ورحم میں) آپؐ کے منتقل ہونے کو (بھی دیکھتا رہا)۔ (سورۂ شعراء، ۲۱۷ تا ۲۱۹)۔ یقیناً رسول اعظمؐ اللہ پر ایسے ہی توکل واعتماد کرتے تھے جیسا کہ اللہ کا ارشاد گزرا ہے۔ جناب جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: "ذات الرقاع میں ہم رسولؐ کے ہمراہ تھے۔ ہم نے ایک سایہ دار درخت دیکھا۔ اسے رسولؐ کے لیے چھوڑ دیا۔ رسولؐ نے اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی اور آرام کرنے لگے۔ ایک مشرک نے اس تلوار کو اٹھا لیا اور رسولؐ سے کہنے لگا: آپ مجھ سے ڈرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے کہا: اب آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ بچائے گا۔ یہ سن کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر پڑی۔ تلوار کو آنحضرتؐ نے اٹھا لیا اور فرمایا: اب میرے ہاتھ سے تجھے کون بچائے گا؟ اس نے کہا: مجھ پر احسان کیجیے، آپؐ نے فرمایا: کیا تم یہ گواہی نہیں دوگے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور میں اللہ کا رسولؐ ہوں؟ اس نے کہا: یہ گواہی تو میں نہیں دوں گا لیکن میں یہ عہد کرتا ہوں کہ میں آپؐ سے جنگ نہیں کروں گا اور ان لوگوں کا ساتھ نہیں دوں گا جو آپؐ سے جنگ کرتے ہیں۔ آپؐ نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں

کے پاس گیا اور کہنے لگا: میں سب سے زیادہ نیک آدمی کے پاس سے آرہا ہوں۔(ریاض الصالحین (للنووی) ص۵، حدیث ۸۷، صحیح مسلم ج۴، ص ۳۶۵)۔

۴۔ شجاعت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "جو لوگ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے (سورۂ احزاب، آیت ۳۹)۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کہ جن کے سامنے عرب کے سورماؤں کا زہرہ آب ہو جاتا تھا، فرماتے ہیں: جب میدان کارزار گرم ہوتا تھا اور دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے سے گتھ جاتی تھیں تو اس وقت ہم رسولؐ کے پاس پناہ لیتے تھے اور آپ دشمن کی فوج سے بہت زیادہ قریب ہوتے تھے (فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ ج۱ص ۱۳۸)۔

جنگ احد میں صحابہ آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس وقت آپ کی ثابت قدمی کی منظر کشی مقدادؓ نے اس طرح کی ہے: "اس ذات کی قسم جس نے انہیں حق کے ساتھ مبعوث کیا میں نے نہیں دیکھا کہ رسولؐ اپنی جگہ سے ایک بالشت بھی پیچھے ہٹے ہوں جب کہ دشمنوں کا سارا زور آپ کی طرف تھا۔ آپؐ کے اصحاب میں ایک جماعت آپؐ کے پاس جمع ہوتی تھی تو دوسری متفرق ہو جاتی تھی۔ میں نے بارہا دیکھا کہ آپؐ اپنی کمان سے تیر چلا رہے ہیں یا پتھر پھینک رہے ہیں، یہاں تک کہ دونوں طرف سے پتھراؤ شروع ہو گیا۔" (مغازی واقدی ج۱ص ۲۳۹، ۲۴۰)۔

۵۔ بے مثال زہد:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اور ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو دنیوی زندگی کی رونق سے مالا مال کر دیا۔ آپؐ اپنی نگاہ کو ان کی طرف ہرگز نہ ڈالیں۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ ہم انہیں آزمائیں گے اور آپؐ کے پروردگار کا رزق اس سے کہیں بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

(طٰہٰ، آیت ۱۳۱)۔ ابو امامہ نے جناب رسالت مآبؐ سے روایت فرمائی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ”مجھے میرے رب کا پیغام پہنچا کہ میں بطحائے مکہ کو تمہارے لیے سونے سے بھر دوں؟ میں نے عرض کی: نہیں معبودا! میں ایک دن شکم سیر اور ایک دن بھوکا رہنا چاہتا ہوں۔ جب مجھے بھوک لگے تو میں تیری بارگاہ میں تضرع و زاری کروں اور جب شکم سیر ہوں تو تیری حمد کروں اور تیرا شکر ادا کروں۔ (سنن ترمذی ج ۴ ص ۵۱۸ ح ۲۳۴۷)۔

رسولؐ اپنی چٹائی پر محو خواب ہوتے تھے اس سے آپؐ کے پہلو میں درد ہو گیا۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپؐ کے لیے فرش فراہم کر دیں؟ فرمایا: دنیا (کی لذتوں) سے مجھے کیا واسطہ؟ میں تو دنیا میں اس سوار کی مانند ہوں کہ جس نے درخت کے سایہ میں تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر روانہ ہو گیا۔ (سنن ترمذی ج ۴ ص ۵۱۸ ح ۲۳۷۷)۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ کئی کئی دن بھوکے رہتے تھے، آپؐ کے اہل و عیال بھی اسی حال میں رہتے تھے۔ وہ اکثر جو کی روٹی کھاتے تھے۔ (سنن ترمذی ج ۴ ص ۵۰۱ حدیث ۲۳۶۰)۔ جناب عائشہؓ کہتی ہیں: آل محمدؐ نے کبھی دن میں دو کھانے نہیں کھائے مگر یہ کہ ایک کھانا خرما ہوتا تھا۔ (صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۳۷۱ حدیث ۶۰۹۰)۔ نیز کہتی ہیں: رسولؐ کی وفات کے وقت بھی آپؐ کی ایک بکری یہودی کے یہاں تیس سیر جو کے عوض گروی تھی۔ (صحیح بخاری ج ۳ ص ۱۰۶۸، ح ۲۷۵۹)۔ انس بن مالکؓ سے روایت ہے جناب فاطمہ زہراؑ آپؐ کی خدمت میں روٹی کا ایک ٹکڑا لائیں تو آپؐ نے فرمایا: اے فاطمہؑ! یہ ٹکڑا کیسا ہے؟ عرض کی: یہ روٹی کا ٹکڑا ہے، میرا دل نہ مانا لہٰذا میں آپؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی۔ فرمایا: تین دن بعد آج یہ پہلا لقمہ ہے جو تمہارے باپ کے منہ میں گیا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ ابن سعد ج ۱ ص ۴۰۰)۔ قتادہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہم انس کے پاس تھے اور ان کے پاس ایک نانبائی تھا انہوں نے کہا: رسولؐ نے جیتے جی نرم

روٹی اور بھنی بکری نہیں کھائی۔(مسند احمد ج ۳ ص ۵۸۲ حدیث ۱۱۸۸۷)۔

۶۔ بردباری اور کرم:

جناب ابن عباسؓ کہتے ہیں: رسولؐ بڑے کریم وفیاض تھے۔ ماہ رمضان میں زیادہ سخاوت کرتے تھے۔ جناب جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ سے جب بھی کچھ مانگا گیا آپؐ نے انکار نہیں کیا(سنن دارمی ج ۱ ص ۳۴)۔ روایت ہے کہ رسولؐ ایک کپڑے والے کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے چار درہم میں ایک قمیض خریدی۔ اس کو پہن کر برآمد ہوئے تو انصار میں سے ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے قمیض پہنا دیجیے، اللہ آپ کو جنت کا لباس عطا کرے گا۔ آپؐ نے قمیض اتاری اور اسے پہنا دی۔ پھر وہ دکان دار کے پاس آئے اور اس سے چار درہم میں دوسری قمیض خریدی۔ آپؐ کے پاس دو درہم باقی بچے، دیکھا کہ راستہ میں ایک کنیز رو رہی ہے۔ آپؐ نے اس سے دریافت کیا: کیوں رو رہی ہو؟ اس نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! میرے آقا نے مجھے دو درہم دیے تھے کہ آٹا لے آؤ، وہ درہم گم ہو گئے۔ رسولؐ نے دو درہم اسے دے دیے۔ کنیز نے پھر عرض کی: میں ڈرتی ہوں کہ گھر والے کہیں مجھے ماریں نہ، لہٰذا رسولؐ اس کے ساتھ اس کے آقا کے گھر تشریف لے گئے۔ باہر ہی سے سلام کیا، ان لوگوں نے رسولؐ کی آواز پہچان لی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ آپؐ نے پھر سلام کیا۔ پھر کوئی جواب نہ ملا۔ آپؐ نے پھر سلام کیا تو ان لوگوں نے سلام کا جواب دیا۔ آپؐ نے دریافت کیا تم نے میرا پہلا سلام نہیں سنا تھا؟ انہوں نے عرض کی: سنا تھا لیکن ہم چاہتے تھے کہ آپؐ ہماری سلامتی کی زیادہ دعا کریں۔ ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان، تشریف آوری کا باعث کیا ہے؟ فرمایا: مجھے یہ خوف تھا کہ تم اس کنیز کو مارو گے۔ اس کے مالک نے کہا: آپؐ اس کے ساتھ تشریف لائے ہیں، لہٰذا میں نے اسے راہ خدا میں آزاد کیا۔ رسول اللہؐ نے دعائے خیر دی اور انہیں جنت کی بشارت دی اور

فرمایا: "یقیناً اللہ نے ان دس درہموں میں برکت عطا کی۔ اس کے ذریعہ سے اللہ نے اپنے نبی کو قمیض پہنائی اور ایک آدمی کو انصار میں سے قمیض پہنائی اور اس دس درہم میں سے ایک کنیز کو آزاد کرایا۔ میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے اپنی قدرت سے ہمیں یہ چیزیں عطا کیں۔ (المعجم الکبیر (طبرانی) ج ۱۲ص ۳۳۷، حدیث ۱۳۶۰۷)۔

ماہ رمضان آتا تو آپؐ اسیروں کو رہا کر دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا کرتے تھے۔ (حیات النبیؐ وسیرۃ، ج ۳ص ۳۱۱)۔ جناب عائشہ کہتی ہیں: نبیؐ اپنے ساتھ کی گئی بدسلوکی کا انتقام نہیں لیتے تھے۔ ہاں حرمت الٰہی کی پامالی کا انتقام لیتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے آپؐ نے کبھی کسی کو نہیں مارا۔ اگر مارا تو اللہ کی راہ میں مارا۔ آپؐ نے کسی سوالی کو محروم نہیں کیا۔ مگر یہ کہ اس نے گناہ کا سوال کیا ہو کیوں کہ آپ معصوم تھے۔ گناہ سے بہت دور تھے۔ (حیات النبیؐ وسیرۃ ج ۳ص ۳۰۶)۔

عبید بن عمر سے روایت ہے: اگر رسولؐ کے پاس ایسے مجرم کو لایا جاتا تھا کہ جس پر حد نہیں ہوئی تھی تو آپؐ اسے معاف کر دیتے تھے۔ (حیات النبیؐ وسیرۃ ج ۳ص ۳۰۶)۔ انس کہتے ہیں: میں نے دس سال تک رسولؐ کی خدمت کی ہے لیکن کبھی آپؐ نے مجھ سے اف تک بھی نہیں کہا اور میں جو کام بھی انجام دیتا تھا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ تم نے کیوں کیا؟ اور جو کام میں نہیں کرتا تھا اس پر کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ انجام کیوں نہیں دیا؟ (صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۲۶۰ حدیث ۵۷۳۸)۔ ایک اعرابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے اپنی ردا کو اتنی شدت کے ساتھ کھینچا کہ اسکا ایک کونہ آپؐ کی گردن پر لگا، اور کہنے لگا: اے محمدؐ! مجھے مال خدا میں سے دیے جانے کا حکم دیں۔ آپؐ نے اس کی طرف دیکھا، تبسم کیا اور اسے عطا کرنے کا حکم دیا؟ آپؐ نے زندگی بھر عفو وسخاوت سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے چچا جناب حمزہؓ کے قاتل کو بھی معاف کر دیا تھا۔ اس یہودی عورت کو بھی معاف کر دیا تھا جس

نے آپ کی خدمت میں بکری کا زہر آلود گوشت پیش کیا تھا۔ ابوسفیان کو معاف کر دیا تھا اور جو اس کے گھر میں داخل ہو گیا تھا اس کو بھی معاف کر دیا تھا۔ اور قریش کے ان لوگوں سے درگزر کیا تھا جو اپنے رب کے حکم سے روگرداں تھے اور اس سے اپنی پوری طاقت کے ساتھ ٹکرائے، جس وقت آپ عزت و اقتدار کے بلند ترین درجہ پر فائز تھے۔ اس وقت فرمایا تھا: ''اے اللہ! میری قوم کی ہدایت فرما، کیوں کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔۔۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ (محمد فی القرآن، ص ۶۰ تا ۶۵)۔ اللہ نے فرمایا: ''اور اگر آپ تُند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس سے بھاگ جاتے لہٰذا انہیں معاف کر دیجیے اور ان کے لیے استغفار فرمائیے۔'' (سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹)۔

اللہ نے آپ کی رحم دلی اور شفقت و رافت کو اس طرح بیان کیا ہے: ''یقیناً تمہارے پاس تمہیں میں سے وہ رسولؐ آیا ہے جس پر تمہاری مصیبت شاق ہوتی ہے اور تمہاری ہدایت میں رغبت رکھتا ہے اور مومنوں پر شفیق و رحیم ہے۔ (سورۂ توبہ، آیت ۱۲۸)۔

۷۔ حیا و انکساری:

جناب ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کو پردہ نشیں کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیا تھی۔ آپ اگر کسی چیز سے نفرت کرتے تھے تو اس کا اندازا آپؐ کے چہرے سے ہو جاتا تھا۔ (صحیح بخاری ج ۳ ص ۱۳۰۶ حدیث ۳۳۶۹)۔ حضرت علیؑ سے روایت ہے: جب رسولؐ سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تھا اور آپ اسے پورا کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو فرماتے تھے: ہاں اور اگر اسے انجام دینے کا قصد نہیں رکھتے تھے تو خاموش رہتے تھے، لیکن آپ کسی چیز کے بارے میں نہیں، نہیں کہتے تھے۔ (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۳)۔ یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: میں غلام کی طرح کھاتا ہوں اور غلام کی طرح بیٹھتا ہوں کیوں کہ میں بھی ایک بندہ ہی ہوں۔ (الطبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۷۱ مجمع الزوائد ج ۹

ص ۱۹)۔ آپؐ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ آپؐ بچوں کو بھی سلام کرتے تھے۔ (حیات النبیؐ وسیرۃ ج ۳ ص ۳۱۳، بحوالہ ابن سعد)۔ نبیؐ ایک شخص سے ہم کلام ہوئے تو وہ شخص آپؐ کے رعب سے تھر تھر کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں! میں بادشاہ نہیں ہوں، میں تو اس خاتون کا بیٹا ہوں جو روکھی سوکھی روٹی کھاتی تھی۔ (سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۱۰۱ حدیث ۳۳۱۲)۔ ابو امامہ سے روایت ہے کہ رسولؐ عصا ٹیکتے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: ''ایسے مت کھڑے ہوا کرو جیسے عجم والے ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔'' (سنن ابی داؤد ج ۴ ص ۳۵۸ حدیث ۵۲۳۰)۔

اپنے اصحاب سے آپؐ مذاق کرتے تھے لیکن حق کے علاوہ کوئی بات نہیں کہتے تھے (سنن ترمذی ج ۴ ص ۳۰۴، حدیث ۱۹۹۰)۔ مسجد بنانے اور خندق کھدوانے میں آپؐ بھی اصحاب کے ساتھ کام کرتے تھے (مسند احمد ج ۳ ص ۸۰ اور طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۴۰)۔ باوجودیکہ آپ عقل مند ترین انسان تھے پھر بھی اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے (الدر المنثور ج ۲ ص ۳۵۹، مواہب اللدنیہ ج ۲ ص ۳۳۱)۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے مسکین کی زندگی اور مسکین کی موت دینا اور مسکینوں کے ساتھ محشور کرنا اور بلا شبہ بدقسمت ترین شخص وہ ہے جو دنیا کے فقر اور آخرت کے عذاب کا ایک ساتھ شکار ہو۔

یہ تھیں وہ خوبیاں اور صفات جنہیں آپؐ نے اپنی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اور اپنے بعد اپنے اہل بیت و ائمہؑ معصومین کا ایک سلسلہ قائم کیا کہ اب رہتی دنیا تک انسان ان زندگیوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی دنیا اور آخرت کو سنوار سکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر خلق کیا اسی طرح رسول اکرمؐ کو اسوۂ کامل سے مزین فرما کے دنیا میں بھیجا۔ حضورؐ نے بھی اپنے اہل بیت کو انہی خوبیوں اور صفات سے مالا مال کیا۔ کسی کو ''بضعۃ'' (یعنی

اپنے وجود کا ٹکڑا) کہا، تو کسی کو اپنا ''نفس'' قرار دیا۔ کسی کو ''میت'' کے درجے پر فائز کیا تو کسی کو ''اولنا واوسطنا وآخرنا وکلنا محمدؐ'' کی منزل پر پہونچایا۔ اللہ کریم نے اس سلسلے کے آخری فرد کو قیامت تک ''قائم'' رہنے کا بندوبست کیا۔ اس جاں نثار گروہ نے آپ کی تعلیمات کی آبیاری کی اور دنیا کے سامنے اسلام کا اصل روپ پیش کرنے میں اپنا تن من دھن ایک کر دیا۔ اب آپؐ پر ایمان لانے والوں کا اولین فریضہ ہے کہ ان صفات عالیہ کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں۔ ربیع الاول میں لاتعداد سیرت کے جلسے ہوتے ہیں، محرم الحرام اور صفر المظفر میں مجالس عزا برپا ہوتی ہیں جن میں ان اوصاف (اوصاف پیغمبرؐ) کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ صرف زبانی طور پر ان کو اپنانے کا درس دینے اور سن لینے سے ان مجالس اور محافل کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ ضرورت ہے کہ انہیں اپنی زندگیوں پر لاگو کیا جائے اور اپنی دنیا اور آخرت کو سنوار لیا جائے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔

(ماخوذ از ''منارۂ ہدایت، خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰؐ''، مولفین سید منذر حکیم اور عدی غریباوی۔ مترجم: نثار احمد زین پوری)

ہجرتِ رسولؐ

قرآن مجید کے چوتھے سورے، سورۂ النساء کی آیت ۹۹ کا ترجمہ: ''اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا تو وہ زمین میں بڑی کشائش اور وسعت پائے گا۔''

آنحضرت کو اعلانِ نبوّت کے بعد شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ کے حکم سے حضورؐ نے سب سے پہلے اپنے عزیز و اقربا کو دعوتِ اسلام دی۔ لیکن کسی کو اپنا ہم نوا نہ پایا۔ سوائے جنابِ ابوطالبؑ اور حضرت علیؑ کسی نے بھی آپ کی بات نہ مانی۔ رسول تبلیغ اسلام سے دست بردار نہ ہوئے، بلکہ آپ کی فعالیت و کارکردگی میں وسعت پیدا ہو گئی۔ آپ کا اتباع کرنے والوں کی فعالیت میں بھی اضافہ ہوا۔ لوگوں کی نظر میں یہ نیا دین پرکشش بن گیا۔ قریش نے جب دیکھا کہ مدینہ کے مسلمان نبی اکرمؐ کی مدد کر رہے ہیں تو انہوں نے اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھا اور غیظ و غضب میں آپے سے باہر ہو گئے اور چاہا کہ نبیؐ اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہو جائیں۔ اسلام کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے لیے سازشیں کرنے لگے۔

ا۔ لالچ اور دھمکی:

قریش نے پہلے لالچ دیا۔ جب اس سے کام نہ چلا تو دھمکیاں دیں۔ جنابِ ابوطالبؑ نے حضورؐ کو قریش کی ترغیب اور دھمکیوں کے بارے میں کہا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے چچا اللہ واحد کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور چاہیں

کہ میں تبلیغِ رسالت چھوڑ دوں تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ اللہ اسے کامیابی سے ہمکنار کرے یا اس میں میری جان ہی چلی جائے۔"

جناب ابوطالبؑ بھتیجے کی صداقت اور سچائی کو سمجھتے تھے اس لیے فرمایا: "بیٹے جاؤ اور جیسے تمھارا دل چاہے تبلیغ کرو۔ اللہ کی قسم! میں کسی بھی چیز کے عوض تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔"

سب سے پہلے عتبہ بن ربیعہ بات چیت کے لیے آیا۔ اس نے مال و متاع کا لالچ دیا۔ حضورؐ نے اس کا جواب قرآن کی آیت ایک تا پانچ، سورۂ فصلت کی تلاوت فرمائی: "حٰم۔ یہ رحمان و رحیم اللہ کی نازل کی ہوئی ہے۔ اس کتاب کی آیتیں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ یہ سمجھنے والی قوم کے لیے عربی کا قرآن ہے۔ اس قرآن کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر نازل کیا گیا ہے۔ لیکن اکثریت نے اس سے روگردانی کی ہے۔ کیا وہ کچھ سنتے ہی نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل ان باتوں سے پردے میں ہیں، جن کی تم دعوت دے رہے ہو۔"

۲۔ سحر کی تہمت:

اسی دوران حج کا زمانہ قریب آیا تو قریش نے حضور اکرمؐ کے اثر و نفوذ کو روکنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ سب ضعیف العمر اور جہاں دیدہ ولید بن مغیرہ کے پاس جمع ہوئے۔ کسی نے کہا کہ حضورؐ پر ساحر یا کاہن ہونے کی تہمت لگائی جائے۔ کسی نے شاعر اور مجنون مشہور کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ سب کسی ایک بات پر متفق نہ ہو سکے۔ اندر ہی اندر انفرادی طور پر یہ پروپگنڈہ کرنے کی کوشش کی لیکن سب باتیں بے کار ثابت ہوئیں۔ حضور اکرم کی اعلانِ نبوت سے قبل کی بے داغ شخصیت و کردار زندگی نے قریش کے اس منصوبے کو ناکام کر دیا۔

۳۔ اذیت و آزار:

تبلیغ رسالت سے روکنے کے لیے تمام تر کوششیں ناکام ہوتے دیکھ کر اب قریش نے سنگ دلانہ موقف اختیار کرنا شروع کر دیا۔ جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے انہیں قید کیا جانے لگا۔ موقع پاتے ہی انہیں زدوکوب کرنے لگے۔ امیہ بن خلف نے جناب بلالؓ کو مکہ کی تپتی زمین پر لٹا کر اذیتیں دیں۔ قبیلہ مخزوم عمار یاسر اور ان کے ماں باپ کو مکہ کی شدید گرمی میں کھینچ لائے۔ ادھر سے رسول کا گزر ہوا تو فرمایا: "اے یاسر کے خاندان والو! صبر سے کام لو تمہاری وعدہ گاہ جنت ہے۔ ان لوگوں نے ان مظلوموں کو اتنی سخت سزا دی کہ جناب عمارؓ کی والدہ سمیہ شہید ہو گئیں۔ عالمِ اسلام میں یہ پہلی شہید خاتون تھیں۔

خود حضور اکرم کو ذاتی اذیتوں سے دوچار کیا۔ ایک مرتبہ آپؐ پر گندگی اور کوڑا ڈال دیا۔ اس پر آپؐ کے چچا جناب ابو طالبؑ کو بہت غصہ آیا اور قریش کو ان کی اس حرکت کا جواب دیا۔ ابوجہل کی حرکت کا جواب جناب حمزہ بن عبدالمطلب نے دیا۔

۴۔ مقاطعہ اور شعب ابو طالبؑ کی محصوری:

جب جناب ابو طالبؑ نے قریش کی ہر پیش کش کو مسترد کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ میں رسول کی حمایت کروں گا چاہے انجام کچھ بھی ہو تو قریش نے ایک دستاویز لکھی جس میں بنی ہاشم کے ساتھ خرید و فروخت، نشست و برخاست اور بیاہ شادی نہ کی جانے کی بات تھی۔ جنابِ ابو طالبؑ اور جنابِ خدیجہؓ نے دیگر افرادِ بنو ہاشم کے ساتھ شعب ابو طالبؑ میں رہنا منظور کر لیا، صرف اور صرف حضورِ اکرم کی جان اور مشن کی حفاظت کی خاطر۔ اس دوران بنو ہاشم نے بڑی سختیاں برداشت کیں۔ بھوک، پیاس اور تنہائی کی اذیتیں جھیلیں۔ اللہ نے قریش کی اس دستاویز پر جس کو انہوں نے خانۂ کعبہ میں لٹکا رکھا تھا دیمک کو مسلط کر دیا۔ چنانچہ دیمک نے باسمک اللّٰھم کو چھوڑ کر ساری عبارت کو کھا لیا۔ حضور اکرمؐ کے کہنے پر جناب

ابوطالبؑ نے جا کر سرداران قریش کو یہ بات بتائی تو انہوں نے اس دستاویز کو دیکھا تو حضور اکرمؐ اور جناب ابوطالبؑ کی بات کو صحیح پایا۔ اس طرح اس محصوری اور مقاطعہ کا خاتمہ ہوا۔

یہ اذیت کا دور ختم تو ہو گیا لیکن بڑی تباہی لایا۔ ان سختیوں کے نتیجے میں مہربان چچا چل بسے اور کچھ ہی دنوں کے بعد زوجۂ باوفا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضورؐ نے اس سال کو عام الحزن قرار دیا۔

سفرِ طائف:

مکہ کی سرزمین پر مشرکین کی ایذا رسانیاں جب شدت اختیار کر گئیں تو آپؐ نے چاہا کہ کچھ دن کے لیے مکہ والوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ شاید اس طرح ان کے جوشِ مخالفت میں کچھ کمی آ جائے۔ آس پاس کے علاقوں میں تبلیغ کی راہیں استوار کی جائیں۔ کہیں تو ایسے لوگ ملیں جن میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو۔ اس نیت سے آپؐ جناب زید بن حارثہ کے ساتھ عازمِ طائف ہوئے۔ حضرت علی علیہ السلام کو اپنے ساتھ نہ لے جانے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوطالبؑ کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے کسی کو حرمِ نبوت اور حریمِ رسالت کی حفاظت کے لیے گھر پر چھوڑنا ضروری تھا۔

طائف مکۂ معظمہ سے تقریباً نوے (۹۰) کلومیٹر کے فاصلے پر اس وقت اور آج بھی ایک پرفضا مقام ہے۔ حضور اکرمؐ کے اجداد کی کچھ زمینیں یہاں پر تھیں جن پر مقامی لوگوں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ آپؐ نے وہاں دس دن قیام کیا اور فرداً فرداً ہر آدمی سے بات کی مگر ان لوگوں نے پیغامِ حق کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ الٹا لوگوں کو حضورؐ کے خلاف اکسایا اور آپؐ پر پتھراؤ کیا۔ حضورؐ زخمی ہو گئے اور واپس مکہ آ گئے۔

بالآخر:

مشرکین مکہ کی جانب سے اس بات کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ حضورؐ کو قتل کر کے

شمع اسلام کی لو تیز ہونے سے پہلے اسے بجھا دیں گے۔ یہ کہنا صریحاً غلط ہے کہ ہجرت جان کے خوف سے کی گئی۔ ہجرت کا منصوبہ پہلے سے قائم تھا اور اس کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اعلانِ نبوت کے بعد اہلِ مکہ کا رویہ حضور اکرمؐ اور اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ جب شدائد میں اضافہ ہو گیا تو آپؐ نے اسلام قبول کرنے والوں کو رائے دی کہ آپ لوگ یہاں سے نکل کر ادھر ادھر منتشر ہو جائیں۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کی جائے کیوں کہ وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ پہلی مرتبہ یہ گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل یہ قافلہ حبش پہنچا۔ چند مہینوں کے بعد ان لوگوں کو وطن کی یاد آئی یا نئی جگہ کی کشائش نے یہ سوچنے پر مجبور کیا ہو کہ اتنے دن کی دوری سے ممکن ہے کفار قریش نے محسوس کیا ہو کہ یہ لوگ سخت گیری سے دین نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لیے اپنے رویّہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہو۔ چنانچہ یہ لوگ واپس مکہ آ گئے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ مشرکین نے اور زیادہ تشدد سے کام لیا اور مظالم میں اضافہ ہو گیا۔ واپس آنے والوں نے اہلِ حبش کے اپنے ساتھ حسنِ سلوک کا بھی چرچا کیا جس پر مشرکین اور مشتعل ہوئے۔ ان حالات کی وجہ سے حضور اکرمؐ نے بعثت کے ساتویں سال دوبارا ہجرتِ حبشہ کا حکم دیا۔ اس بار تراسی مرد، گیارہ قریشی خواتین اور سات باہر کی، سب ملا کر ایک سو ایک افراد جناب جعفر طیارؓ کی سرکردگی میں حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ (مہاجرین کی تعداد میں اختلاف ہے)۔

جنابِ ختمی مرتبتؐ کا مکہ سے مدینہ ہجرت کا فیصلہ، قرآنِ مجید کی اس آیت کی مطابقت میں تھا جس کا حوالہ مضمون کے شروع میں دیا گیا ہے۔ جس سرزمین میں انسان پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے ابتدائی ایام گزارتا ہے، اس سرزمین سے محبت فطری امر ہے۔ حضورؐ کا بچپن مکہ میں گزرا تھا، اس جگہ سے محبت و چاہت قدرتی تھی۔ لیکن دشمنوں نے آپؐ پر مکہ کی سرزمین تنگ کر دی۔ لہٰذا انہوں نے مکہ سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری طرف جب دشمنانِ اسلام کو یہ بھنک پڑی کی جنابِ رسالت مآب مکہ سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں تو انہوں نے آپ کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی شروع کردی۔

شبِ ہجرت میں کیا ہوا:

سورۂ البقرہ، آیت ۲۰۷ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور لوگوں میں اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ ایسے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے۔'' اس آیت کی تفسیر میں خطیبِ اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی فرماتے ہیں: ''جب کفارِ مکہ نے جنابِ رسالت مآبؐ کے قتل پر کمر باندھی اور یہ طے کیا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک نمائندہ اس قتل میں شریک ہوتا کہ بنی ہاشم ان سب سے قصاص طلبی نہ کرسکیں۔ ایک رات انہوں نے منصوبہ بنا کر حضورؐ کے گھر کو آ گھیرا اور برہنہ تلواریں لے کر اس کے منتظر ہوئے کہ جونہی صبح کو حضرتؐ اپنے گھر سے نکلیں گے ان کو تلواروں کی باڑوں میں رکھ لیا جائے گا۔ ان کے اس ارادۂ بد سے اللہ تعالیٰ نے اوّل شب ہی میں آگاہ کردیا تھا اور یہ حکم دے دیا تھا کہ حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سُلا کر آپؐ غارِ ثور کی طرف چلے جائیں۔ وہاں سے مدینہ کا رُخ کریں۔ جب گھر سے نکلیں تو مٹھی بھر خاک **شَاهَتِ الْوُجُوْه** کہہ کر ان کی طرف پھینکنا۔ وہ وقتی طور پر اندھے ہو جائیں گے۔ تم ان کے درمیان سے نکلے چلے جانا۔ جب وحی نے یہ اطلاع دی تو آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا، کفارِ مکہ نے میرے قتل کا ارادہ کیا ہے۔ تم میرے بستر پر میری عبا اوڑھ کر سو رہو۔ وہ لوگ سمجھیں گے کہ میں سو رہا ہوں اور میں غارِ ثور کی طرف جاتا ہوں۔ تم میرے جانے کے بعد جن لوگوں کی امانتیں میرے پاس ہیں ان کو ان کے مالکوں تک پہنچا کر، زنانِ بنی ہاشم کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف کوچ کرنا میں وہاں تمہارا منتظر رہوں گا۔ حضرت علیؑ نے عرض کی اگر میرے یہاں رہنے سے آپ کی جان بچ جائے گی تو میری جان جائے یا رہے میں یہ

خدمت ضرور انجام دوں گا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں یہ آیت (سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۷) حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ ومیکائیلؑ سے فرمایا، میں تم دونوں میں بھائی چارہ قرار دیا اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ کی تم میں کون ایسا ہے کہ اپنی زیادہ عمر کا حصہ اپنے بھائی کو دے دے۔ دونوں نے اس سے انکار کیا۔ تب اللہ نے ان دونوں سے فرمایا کہ میں نے نبیؐ اور علیؑ میں بھائی چارہ (مواخات) قرار دیا ہے۔ دیکھو علیؑ نے اپنی جان نبیؐ پر کیوں کر نثار کی ہے اور بسترِ نبیؐ پر کیسا بے خوف سو رہا ہے۔ لہٰذا تم دونوں زمین پر جاؤ اور علیؑ کی حفاظت اس کے دشمنوں سے کرو۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں زمین پر آئے اور جبرئیلؑ علیؑ کے سرہانے اور میکائیلؑ پائنتی ان کی حفاظت کرنے لگے اور کہتے جاتے تھے مبارک ہو اے علیؑ! مبارک ہو اے علیؑ تمہارا مثل کون ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس ہمدردی پر فخر ومباہات کرتا ہے۔"

اس واقعہ کے مضمرات:

۱۔ حضرت علیؑ کے ایمان کا اندازہ کیجیے کہ رسولؐ کی صداقت پر کس پایہ کا یقین تھا کہ ہلکا سا کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا۔ ایسے موقعوں پر فطرتاً انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جان بچی تو جہان بھلا۔ رسولؐ اپنی جان تو بچانا چاہتے ہیں اور مجھے خون آشام تلواروں کی دھاروں پر رکھ رہے ہیں۔ ایسے خوں خواروں کے نرغے میں ہلاکت سے کیسے بچ سکتا ہوں۔ لیکن ایسے واہی خیالات علیؑ جیسے کامل الایمان انسان کے دل میں کیسے گزر سکتے تھے۔ انہوں نے ایمان کی بھرپور قوت کے اعتبار سے جواب دیا کہ میں دل وجان سے یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔

۲۔ اس کے ساتھ دوسرے خطرے کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حضورؐ اپنی امانتوں کو سپرد

کر رہے ہیں اور فرما رہے جس کی جو امانت ہو اسے دے کر آنا۔ حضرت علیؑ کے لیے یہ کیسا نازک موقع تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ مکہ کا چپہ چپہ ذرہ ذرہ اس بنا پر ان کے خون کا خواہاں تھا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ کے معتمدِ خاص اور چچازاد بھائی تھے گھر گھر جا کر امانت سپرد کرنا جہاں کوئی اپنا ہمدرد اور مددگار نہ ہو، حضرت علیؑ کی انتہائی شجاعت کی دلیل ہے۔ کتنا اعتماد تھا ان کو اللہ کی مدد پر کہ ذرا نہ گھبرائے اور بخوشی اس خدمت کو منظور کر لیا۔

۳۔ تیسرا مرحلہ اور زیادہ سخت تھا یعنی زنانِ بنی ہاشم کو اپنے ساتھ مدینے لے جانا۔ کیا یہ کوئی معمولی بات تھی؟ اوّل تو سواریوں کا مہیا کرنا۔ پھر گرمی کے موسم میں ریگستان کا سفر۔ پہاڑوں سے گزر۔ کئی عورتوں کی حفاظت تنِ تنہا کے سپرد۔ ہر قدم پر دشمن کے پیچھا کرنے اور قتل و غارت کرنے کا خوف۔ بہادر سے بہادر آدمی کے دل کو لرزانے کے لیے کافی تھا۔ مگر حضرت علیؑ کے پاس خوف کہاں!

۴۔ یہ سفر کس مصیبت سے طے کیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ دو اونٹ بمشکل کرائے پر لیے۔ خود پیدل چلے۔ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ مدینہ پہنچے تو اس حال میں کہ پائے مبارک اور پنڈلیاں لہولہان تھیں۔ قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ کیا یہ خدمات ایسی معمولی تھیں کہ مسلمانوں نے اس طرح نظر انداز کیں کہ آپؑ کے متعلق اتنا لکھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں ہے۔ اس کا مفہوم عام لوگوں کے سر تھوپ کر رہ گئے۔

۵۔ اس پر خوف رات میں دوسرا ہوتا تو نہ معلوم فرطِ اضطراب سے اپنا کیا حال بنا لیتا۔ مگر دیکھیے حضرت علیؑ کس اطمینان سے سو رہے ہیں۔ کسی نے آپؑ سے پوچھا کہ آپؑ تمام رات عبادت کرتے ہیں کیا کسی رات آپؑ پیر پھیلا کر سوئے بھی

ہیں؟ فرمایا، ہاں! تمام عمر میں ایک رات میں بڑے چین سے سویا ہوں اور وہ شب ہجرت تھی۔ اللہ رے نفسِ مطمئنہ، جتنا خوف زیادہ اتنا ہی قلب کو اطمینان زیادہ۔

۶۔ حضرت علیؑ نے اس رات اپنے نفس کو اللہ کی مرضی کے بدلے بیچا تو اس رات کے بعد اللہ کی مرضی علیؑ کی مرضی بنی۔

۷۔ حضرت علیؑ نے بسترِ رسولؐ پر سو کر کتنے فضائل حاصل کیے۔ رسولؐ کے جانشین بنے، جانِ رسولؐ کے محافظ بنے، اسلام کے جاں نثار بنے، اسلام کے سب سے بڑے محسن بنے۔

۸۔ جب مشرکین تلواروں کو تانے خانۂ رسالت میں داخل ہوئے تو ان کے شور وغل نے حضرت علیؑ کو جگایا۔

آپؑ فوراً بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ محمدؐ کہاں ہیں؟ دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا اور پتہ بتا دیتا۔ مگر جناب امیرؑ کے پاس گھبراہٹ کہاں؟ بھرپور استقلال سے جواب دیا کہ کیا مجھے سونپ گئے تھے؟ جو پوچھنے آئے ہو۔ جہاں ہوں پتہ لگا لو۔

اگر اس واقعہ سے انکار کیا جائے تو یہ بتانا پڑے گا کہ شبِ ہجرت فرشِ رسولؐ پر کون سویا تھا؟ امانتیں کس نے لوٹائی تھیں؟ زنانِ بنی ہاشم کو لے کر کون گیا تھا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سب کام مولائے کائنات، امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے انجام دیے تھے۔

مآخذ

۱۔ ''تفسیر القرآن'' جلد اوّل، ادیبِ اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی۔

۲۔ ''منارۂ ہدایت، خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰؐ'' سید منذر حکیم اور عدی غریباوی، مترجم نثار احمد زین پوری۔

۳۔ ''تاریخ اسلام'' مولانا سید علی نقی النقوی۔

سوئے منتہیٰ جو گئے نبیؐ.......

پاک ہے وہ ذات راتوں رات جو لے کر گئی
مصطفیٰؐ کو بخشے زینت شبِ معراج کی

معراج جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا منفرد اعزاز ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیتوں میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

سترہویں (۱۷) سورہ، بنی اسرائیل (اسے سورۂ اسراء بھی کہا جاتا ہے) کی پہلی آیت میں ارشاد باری ہے:

"پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔"

ترپنویں (۵۳) سورہ، النجم کی پہلی سے اٹھارویں آیت میں ارشاد رب العزت ہے:

"قسم ہے ستارہ کی جب وہ ٹوٹا۔ تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہوا نہ بہکا۔ اور وہ اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتا ہے۔ اس کا کلام وہی وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے۔ اسے نہایت طاقت والے نے تعلیم دی ہے۔ وہ صاحب حسن و جمال جو سیدھا کھڑا ہوا۔ جب کہ وہ بلند ترین افق پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ دو کمان یا اس سے کم کا فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف جس راز کی بات چاہی وحی کر دی۔ دل نے

اس بات کو جھٹلایا نہیں جس کو انہوں نے دیکھا۔ کیا تم اس سے اس بات کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہو جو وہ دیکھ رہا ہے۔ اور اس نے تو اسے ایک بار اور بھی دیکھا ہے، سدرالمنتہیٰ کے نزدیک۔ جس کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے۔ اس وقت اس سدرہ (یعنی بیری کے درخت) کو وہ (نور) لپٹ رہا تھا، جو وہاں چھا رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھ نہ بھکی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں۔"

ان آیات سے واضح ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرشتۂ وحی جناب جبریلؑ کو اس کی اصل صورت میں دوسری مرتبہ دیکھا۔ پہلے آپؐ اسے نزولِ وحی کے آغاز میں غارِ حرا میں دیکھ چکے تھے۔ یہ ملاقات بہشت جاوداں کے پاس ہوئی۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے جناب رسالت مآب کسی اشتباہ کا شکار نہ تھے۔ آپؐ نے عظمت الٰہی کی عظیم نشانیاں مشاہدہ کیں۔ یہ آیات کہ جو اکثر مفسرین کے بقول واقعہ معراج سے متعلق ہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں پیش آیا۔ خصوصاً "ما ضاغ البصر و ما طغی" اس امر کا شاہد ہے کہ رسول اکرمؐ کی آنکھ کسی خطا و اشتباہ و انحراف سے دوچار نہیں ہوئی۔

اس مضمون میں مختصراً سفر معراج اور اس کا مقصد پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

معراج نبوی کا پہلا مرحلہ مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیانی فاصلہ کا سفر تھا (جس کا اشارہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہے کہ "منزہ ہے وہ خدا جو ایک رات میں اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا")۔ وہاں سے آپ کا سفر معراج شروع ہوا۔ آپؐ نے ساتوں آسمانوں کو یکے بعد دیگرے عبور کیا۔ ہر آسمان میں ایک نیا ہی منظر دیکھا۔ بعض آسمانوں میں پیغمبروں اور فرشتوں، بعض میں دوزخ اور دوزخیوں کو دیکھا اور بعض میں جنت اور جنتیوں سے ملاقات کی۔ پیغمبر اکرمؐ نے یہاں بہت سی اصلاحی اور قیمتی باتیں مشاہدہ کیں جن میں سے ہر ایک عالم ہستی کے رازوں میں سے ایک راز تھی۔ واپس آنے کے بعد حضور اکرمؐ ان کو صراحت سے اور

بعض کو کنایہ اور مثال کی زبان میں امت کی آگاہی کے لیے بیان فرماتے تھے۔

ساتویں آسمان پر آپؐ نے نور کے بہت سے حجابوں کا مشاہدہ کیا۔ وہی جگہ جہاں ''سدرۃ المنتہیٰ'' اور ''جنت الماویٰ'' تھی آپؐ اس جہان نور و روشنی میں شہود باطنی کی اوج (بلندی)، قرب الٰہی اور مقام ''قاب قوسین'' پر فائز ہوئے۔ اس سفر میں آپ کو بہت سے اہم احکام دیے گئے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ بہت سی روایات کی تصریح کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے اس عظیم سفر کے مختلف حصوں میں اچانک مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کو اپنے پہلو میں دیکھا۔ ان روایات میں کچھ ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو حضور اکرمؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے مقام کی بہت زیادہ عظمت کی گواہ ہیں۔

شیعہ اور سنی علمائے کرام کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ معراج نبیؐ جسمانی تھی اور یہ واقعہ عالم بیداری میں صورت پذیر ہوا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مقصد معراج اس طرح بیان فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا۔ نہ اس پر زمانہ گزرتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باسیوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے۔ نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آ کے آپ انہیں لوگوں سے بیان کریں۔''

پیغمبر اکرمؐ کو شہود باطنی کا تجربہ کرانا تھا۔ پیغمبر اکرم کو اللہ تعالیٰ کی خاص خاص نشانیاں ظاہری آنکھوں سے دکھانی تھیں، مثلاً فرشتے، جنت، جہنم، اور ارواح انبیاء علیہم السلام۔ بعض روایات میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنتیوں کے ایک گروہ کو جنت میں اور دوزخیوں کے گروہ کو دوزخ میں دیکھا۔

پھر مسجد اقصیٰ میں حضرات ابراہیم، موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام جیسے اولوالعزم پیغمبروں کی نماز کی امامت فرمائی۔ پھر ساتویں آسمان کا سفر کیا اور راستے میں بہت سے پیغمبروں اور فرشتوں سے ملاقات فرمائی۔ آخرِ کار سدرۃ المنتہیٰ جو ساتویں آسمان کے بعد ہے، وہاں پہنچے۔

پھر قربتِ الٰہی کی انتہاء قابَ قوسین، یعنی اللہ کے شہودِ باطنی کا تجربہ فرمایا۔ بہت سی باتیں ہوئیں، جو احادیثِ قدسی کی شکل میں موجود ہیں۔

افضل عمل:

پیغمبر اکرمؐ نے معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے عرض کی: ''مالک کون سا عمل افضل ہے؟'' جواب ملا: ''کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے اور جو کچھ میں نے تقسیم کردیا ہے اس پر راضی رہنے سے بہتر نہیں۔''

''اے محمدؐ! جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں، میری محبت ان کے شاملِ حال ہوگی۔'' (یعنی میں خود ان سے محبت کرنے لگوں گا)۔

''میری محبت کی کوئی حد، کنارا اور انتہا نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے احمدؐ! بچوں کی طرح ہر سبز و زرد، زرق برق سے محبت نہ کرو اور نہ بچوں کی طرح نعمتیں پاکر مغرور ہونا اور نہ نعمتیں پاکر مجھے بھول جانا۔''

پیغمبر اکرمؐ نے عرض کی: ''مالک! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو آپ کی بارگاہ میں قرب کا باعث ہو۔'' ارشاد ہوا:

''رات کو دن اور دن کو رات قرار دو۔'' عرض کی ''کس طرح؟'' ارشاد ہوا: ''تمہارا سونا نماز ہو اور اپنا پیٹ پورا پورا نہ بھر لینا۔'' پھر فرمایا: ''اے احمدؐ! میری محبت یہ ہے کہ فقیروں اور محروموں سے محبت کرو۔ ان کے قریب رہو، ان سے نشست و برخاست جاری رکھو تاکہ وہ خود تمہارے نزدیک ہوں۔ دنیا

پرست دولت مندوں کو اپنے سے دور رکھو، ان کے ساتھ بیٹھنے سے بچتے رہو۔"

پیغمبر اکرمؐ نے عرض کی: "دنیا والے اور آخرت والے کون ہیں؟" اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

دنیا والے وہ ہیں جو:

زیادہ کھاتے ہیں، زیادہ ہنستے ہیں، زیادہ سوتے ہیں، زیادہ غصہ کرتے ہیں، خوش کم ہوتے ہیں، برائی کرنے کے بعد عذر و معذرت نہیں کرتے، معافی مانگنے والوں کو معاف نہیں کرتے، اللہ کی اطاعت میں سستی کرتے ہیں، گناہ کرنے میں دلیر ہوتے ہیں، لمبی چوڑی تمنائیں رکھتے ہیں جب کہ موت ان کے قریب ہے، کبھی اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتے، ان سے کم ہی لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، باتیں بہت کرتے ہیں، ذمہ داری کا احساس بہت کم رکھتے ہیں، نہ نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ مصائب پر صبر کرتے ہیں، ان کی بہت زیادہ خدمت کی جائے تب بھی ان کی نگاہ میں کم ہوتی ہے، جو اچھے کام نہیں کرتے ان کی تعریف سننا پسند کرتے ہیں اور ان چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں ہوتا، اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں۔

آخرت والے وہ ہیں جو:

باحیا ہوتے ہیں، ان میں جہالت بہت کم ہوتی ہے، ان سے لوگوں کو فائدے بہت زیادہ ہوتے ہیں، لوگ ان سے راحت اور آرام میں رہتے ہیں جب کہ وہ خود تکلیف میں ہوتے ہیں، ان کی باتیں سنجیدہ ہوتی ہیں، ہمیشہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں، ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل بیدار رہتے ہیں، ان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں مگر دل ہمیشہ اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں، ہر نعمت کو استعمال کرتے ہوئے حمد بجالاتے ہیں، ان کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں، ان کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں، فرشتے ان سے خوش رہتے ہیں، غافل لوگ ان کے نزدیک مردہ ہوتے ہیں، لوگ تو ایک دفعہ مرتے ہیں مگر وہ جہاد بالنفس اور اپنی بری خواہشوں کی مخالفت میں ہر

روز ستر مرتبہ مرتے ہیں اور نئی زندگی پاتے ہیں، وہ عبادت کے لیے میرے سامنے فولادی دیوار کی طرح کھڑے ہوتے ہیں اس وقت ان کے دل میں مخلوق کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم میں ان کو پاک زندگی بخشوں گا اور ان کی ارواح کو خود قبض کروں گا۔ ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دوں گا، تمام حجابوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دوں گا اور حکم دوں گا کہ جنت خود کو ان کے لیے آراستہ و پیراستہ کرے۔"

"اے احمدؐ! عبادت کے دس حصے ہیں جن میں نو طلب حلال میں ہیں۔ جب تمہارا کھانا پینا حلال ہوگا تو تم میری حفظ و امان میں ہو گے۔"

"اے احمدؐ! جانتے ہو، کون سی زندگی زیادہ گوارا اور باقی رہنے والی ہے؟"

وہ زندگی جو زیادہ باقی رہنے والی ہے:

جس کا صاحب ایک لمحے کے لیے بھی میری یاد سے غافل نہ ہو۔ میری نعمتیں عطائیں نہ بھولے۔ میرے حق سے بے خبر نہ رہے۔ رات دن میری خوشی حاصل کرنے کی کوششیں کرے۔ دنیا اس کی نظر میں حقیر و معمولی ہو اور آخرت اس کے نزدیک بڑی اور اہم ہو۔ میری رضا کو اپنی رضا پر ترجیح دے۔ کسی گناہ کے سرزد ہونے پر مجھے یاد کرے (توبہ کرے)۔ اپنے دل کو ان چیزوں سے پاک رکھے جو مجھے پسند نہیں۔ شیطان اور شیطانی خیالات سے نفرت کرے اور شیطان کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ اگر وہ یہ سب کرے گا تو میں اس کے دل میں ایک خاص محبت ڈال دوں گا پھر اس کا سارا دل میرے اختیار میں ہوگا، وہ ان چیزوں کے بارے میں بات کرے گا جو میں اہلِ محبت کو بخشتا ہوں۔ میں اس کا دل اور کان کھول دوں گا، تو وہ اپنے دل اور کان سے غیب کی باتیں سنے گا اور اپنے دل سے میرے جلال اور عظمت کو دیکھے گا۔

معراج کی تفصیل بہت زیادہ ہے، جس کو بیان کرنے کے لیے کتاب نہیں کتابیں

درکار ہیں۔ اس مختصر مضمون میں معراج سے متعلق صرف چند روایات پیش کی جاتیں جو معصومین علیہم السلام نے بیان فرمائی ہیں۔

قدر کی شب کی طرح والفجر تک پھیلی ہوئی
ماورائے فکر ہے وسعت شبِ معراج کی

سدرۃ المنتہیٰ فرشتوں کی رسائی کی آخری حد ہے، اس سے آگے فرشتے نہیں جاسکتے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد جبرئیل امینؑ آنحضرتؐ سے الگ ہوگئے۔ اس سے آگے آپؐ کے ساتھ نہیں گئے۔ اس مقام سے گزرنے پر حضرتؐ نے عجائبات کا مشاہدہ فرمایا۔

ایک روایت جو حضرت امام رضاؑ سے منقول ہے، آپ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت امام موسیٰؑ ابن جعفرؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے پدر بزرگوار کے اصحاب میں سے ایک مجلس میں حاضر نہ ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ یہ شخص کہاں ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ بیمار ہیں۔ حضرتؑ امام جعفر صادق علیہ السلام بنفسِ نفیس عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے محسوس فرمایا کہ اس کی بیماری سخت ہے۔ فرمایا: ''تو اللہ پر حسن ظن ہو کھ، تجھے اپنی موت کے موقع پر اللہ پر اعتماد و بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اللہ سبحانہٗ بندے کے متعلق جو کچھ کرتا ہے وہ ان کی بہتری اور مفاد کے لیے کرتا ہے۔ اللہ پر حسن ظن رکھنا بہت اچھا ہے۔'' اس نے کہا: ''فرزندِ رسولؐ! میرا عقیدہ و ایمان اللہ پر بہت مضبوط ہے یعنی رحمت الٰہی سے مایوس نہیں ہوں، سوائے اس بات سے کہ مجھے اپنی بیٹیوں کے بارے میں فکر لاحق ہوگئی ہے۔ اسی فکر و پریشانی نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔'' امامؑ نے فرمایا: ''اے اللہ کے بندے، جس اللہ پر تمہارا ایمان و امید ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہاری اچھائیوں اور نیکیوں میں اضافہ کرے گا، اسی اللہ پر بھروسہ و امید رکھو کہ وہ تمہاری بیٹیوں کی کفالت اور حفاظت کرے گا۔'' مزید فرمایا: ''اے وہ انسان جس کی پشت گناہوں کے وزن کی وجہ سے

ختم ہوگئی ہے، گناہوں کی معافی کی امید تو اللہ سے رکھے مگر تیس چالیس سال کی عمر میں بیٹیوں کی کفالت کرنے میں ایمان محکم اور امید کامل نہ ہو۔ کیا بیٹیوں کو تم نے خلق کیا ہے؟ بے کار پریشان کیوں ہو؟ جب تک تم زندہ ہو، بیٹیوں کی کفالت تمہارے ذمہ ہے، جب تم نہ ہوگے تو ان کی کفالت کے لیے اللہ تعالیٰ دوسرے شخص کو معین فرمائے گا۔ بیٹیوں کی فکر کے خیالات شیطان ملعون کے پیدا کردہ ہیں۔" آپ نے اپنے اجداد کے سلسلے سے جناب رسالت مآب کا فرمان بیان فرمایا: "مقام سدرۃ المنتہیٰ میں میں اکیلا تھا، میں نے سدرہ کے درخت کی ایک شاخ کو دیکھا کہ جو اپنے ابھرے ہوئے پھلوں کے سبب زمین کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ ان پھلوں میں کچھ سے دودھ، کچھ سے شہد، کچھ سے تیل، کچھ سے روئی جیسی کوئی شے اور کچھ سے لباس گرتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اللہ نے میرے دل میں القا کیا کہ یہ کارخانے آپ کی امت کے بیٹے اور بیٹیوں کے لیے بنائے گئے ہیں اور لڑکیوں سے کہہ دیجیے کہ ہم نے انہیں پیدا کیا ہے، ہم ہی انہیں رزق دیتے ہیں۔ جسے ہم دانت دیتے ہیں تو انہیں استعمال کرنے کے لیے روٹی بھی فراہم کرتے ہیں۔"

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "جب میرے جد بزرگوار مقام سدرہ سے آگے (ملاءِ الاعلیٰ۔ وہ عالم جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی توجہ نہیں ہے) گئے تو وہاں نیکیوں، درجات بلند اور گناہوں کے کفاروں کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ فرمایا: "کفارے تین ہیں: (۱) وہ وضو جو سردی کی شدت میں کیا جائے (۲) نماز جماعت کے لیے قدم اٹھانا (ہر قدم جو جماعت کی نماز میں جانے کے لیے اٹھایا جائے کے عوض نامۂ اعمال میں دس نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے، دس گناہوں کو مٹا دیا جاتا ہے اور دس درجات کو بلند کیا جاتا ہے۔ (۳) نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار۔

مزید ارشاد ہوا: درجات کی بلندی کے لیے تین اعمال ہیں: (۱) جب کوئی مومن

دوسرے مومن سے ملے تو سلام میں پہل کرے، دوسرے کے سلام کا منتظر نہ رہے۔ (۲) کھانا کھلائے، چاہے اپنے بیوی بچوں ہی کو کھلائے۔ (۳) درجات کو بلند کرنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ ایک نماز ہے کہ جب ساری خلقت سو جائے تو وقت سحر اٹھ کر نماز شب (تہجد) پڑھی جائے۔

شب معراج میں رسول اکرمؐ نے جو عجائبات مشاہدہ فرمائے، اس سلسلے میں امام ششم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول روایت میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "معراج میں مجھ پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کی ایک سوئی کے ناکے کے برابر مقدار کھول دی گئی۔ "سوئی کے ناکے" سے مراد یہ ہے کہ عظمت الٰہی بہت زیادہ بلکہ بہت ہی زیادہ ہے، جو بیان میں آ ہی نہیں سکتی، اس میں سے ایک سوئی کے ناکے کے برابر (جو کہ کم ترین مقدار ہے) عظمت الٰہی آپؐ پر وا کی گئی۔ معرفت کی یہ بلندی عنایت الٰہی تھی جو ہمارے پیغمبر اکرم کو ودیعت کی گئی تھی۔ امامؑ نے فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم کا ہاتھ آنحضرتؐ کے سینہ پر رکھا، دوسری روایت کے مطابق دست قدرت آپؐ کے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا تو آپؐ نے سینہ میں خنکی محسوس کی۔ لطف و کرم کا ہاتھ یا دست قدرت سے مراد گوشت والا ہاتھ نہیں ہے بلکہ "ہاتھ" بمعنی طاقت و قدرت کا ہاتھ۔ (حقیقت یہ ہے کہ واقعہ معراج کو مادی مثالوں کے ذریعہ بیان کرنا ایک بہت مشکل کام ہے)۔

حضرت علی علیہ السلام کے قدم مبارک دوش رسولؐ پر:

عرب کے مشہور شاعر جناب حسان بن ثابتؓ فرماتے ہیں: (عربی اشعار کا ترجمہ)

"مجھ سے کہا گیا کہ تم علیؑ کی شان میں قصیدہ کہو۔ علیؑ کی محبت اس آگ کو بجھا دیتی ہے جو ہر طرف سے بند کر دی گئی ہے۔"

"میں نے ہاتفِ غیبی سے کہا، اس ذات کی مدح کرنے کا اقدام نہیں

کروں گا، اس لیے کہ صاحبان عقول اس کے متعلق حیران ہیں، یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اس کو معبود بنالیا۔"

"اور جناب رسالت مآبؐ نے ہم سے فرمایا کہ جب آپ شب معراج آسمان کی طرف جارہے تھے تو وہ عذاب پانے والوں پر چھاگئے۔"

"جب حضور اکرمؐ عالم قرب الٰہی میں محو ہوئے تو ان کے شانے پر دست قدرت رکھا گیا جس کے لمس سے سینے میں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔"

"علیؑ وہ ہیں جس نے اپنے قدموں کو اس مقام پر رکھا جہاں پر دست الٰہی رکھا تھا۔ یعنی بت شکنی کے موقع پر نبوت کے کندھوں پر قدم رکھا۔ اتنی با عظمت ذات کی میں کیا تعریف بیان کروں۔"

مختصر یہ کہ جب جناب رسالت مآب عظمت الٰہی کے مشاہدے میں محو تھے تو دست رحمت کے رکھے جاتے ہی آپؐ نے سینے میں ٹھنڈک محسوس کی۔ ایسے میں ندائے غیب آئی "اے محمدؐ! کیا آپ نے اپنے بندوں کا امتحان لیا ہے؟

ہمارے بندوں کے درمیان آپ کا سب سے زیادہ فرماں بردار اور تابع حکم کون ہے؟" جناب رسالت مآبؐ نے عرض کی "پروردگار! تیرے بندوں میں میں نے علیؑ کو سب سے زیادہ تابعدار پایا ہے۔" اللہ نے فرمایا "اے محمدؐ! آپ نے صحیح کہا۔" پھر ندا آئی "کیا آپؐ نے کسی کو اپنا وصی اور جانشین معین فرمایا ہے؟" آپ نے کہا "اے مرے پروردگار تو ہی منتخب فرما۔" ندا آئی "ہم نے علیؑ کو منتخب کیا۔"

حضرت علیؑ جانشین پیغمبرؐ ہیں:

"میم" کا اور "عین" کا بس راج ہے معراج میں
ہیں محمدؐ اور علیؑ حجت شب معراج کی

ندا آئی ''امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہدایت کا علم ہیں، متقین کے امام ہیں۔ اے رسولؐ یہ خوش خبریاں ہم نے آپ کو دی ہیں، انہیں علیؑ تک پہنچا دیں۔'' رسول کریمؐ نے تعمیل حکم کرتے ہوئے فرمایا: ''اے علیؑ! مقام سدرۃ المنتہیٰ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے آپ کی احوال پرسی کی اور آپ کو امام بنایا ہے۔ حضرت علیؑ نے کہا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں، میں اس کے قبضۂ قدرت میں ہوں۔ اگر وہ مجھے عذاب دے تو یہ اس کا عدل ہے اور میری کوتاہی کی بنا پر ہے۔ اگر وہ اپنے وعدے کی تکمیل کرے تو وہ فضل و کرم کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔'' جناب رسالت مآبؐ نے ہاتھ بلند کیے اور مولائے کائنات کے لیے دو دعائیں فرمائیں:

''اے مرے معبود! علیؑ کے دل کو علم و معرفت سے منور فرما۔''

''علیؑ کی مسرت، محبت اور پسند کو اپنے (اللہ) پر ایمان قرار دے۔''

ندائے قدرت آئی ''بے شک، ہم نے علیؑ کے بارے میں آپ کی دعا قبول کی، لیکن میں ان کو آزمائشوں میں مبتلا کروں گا کہ کوئی پیغمبر بھی اس قسم کی آزمائشوں میں مبتلا نہیں ہوا ہوگا۔''

جن آزمائشوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبیؐ سے کیا تھا، وہ وصال پیغمبرؐ کے بعد علیؑ کا پچیس سال کا خانہ نشینی کا وہ زمانہ ہے جس میں آپ نے شدید مصائب و آلام جھیلے اور یہ سب تاریخ میں محفوظ ہیں۔

مآخذ:

(۱) ''قصص القرآن'' (واقعات انبیاء در قرآن) مفسر قرآن ڈاکٹر سید محمد حسن رضوی۔

(۲) ''انوار القرآن'' ترجمہ و تفسیر علامہ السید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ۔

(۳) ''قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ'' مولف حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی۔

(۴) ''معراج'' مولف: شہید محراب آیت اللہ سید عبد الحسین دستغیبؒ۔ مترجم: مولانا اصغر علی ملتانی۔

ہنس کر بولی بنتِ اسدؑ سے کعبہ کی دیوار.....

کعبہ کبے ولادتِ اطہر کا واقعہ
میری زباں پہ ہے درِ خیبر کا واقعہ
آغوشِ مَہد کلَّہِ اژدر کا واقعہ
روح الامیں سناؤ ذرا پر کا واقعہ
جبریل کچھ بیاں کریں کچھ ہم رقم کریں
ممدوح جب ہے ایک تو مدحت بہم کریں

سردار نقوی

طلوعِ اسلام سے پہلے انسانیت جاہلیت اور جہالت کے اندھیروں میں غرق تھی۔ عورت کی اس معاشرہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ عورت اتنی بے توقیر تھی کہ اسے دنیا میں زندہ رہنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اپنے ہاتھوں سے باپ اپنی بچی کو زندہ دفن کر دیا کرتا تھا۔ اس ماحول میں حضور اکرمؐ کی بعثت ہوئی۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ لوگوں کو اسلام سے روشناس کرانے میں آپ کو کتنی جدوجہد کرنی پڑی ہوگی۔ اسلام نے انسانیت کو وقار عطا کیا۔ خود زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ رہنے دینے کے اصول سکھلائے۔ عورت کی تکریم کی تائید کی گئی۔ اس سلسلے میں بنی ہاشم کے گھرانے اور جناب عبدالمطلبؑ اور جناب ابو طالبؑ کا الگ ہی وطیرہ تھا۔ ان کے یہاں جہالت کی رمق بھی نہیں تھی۔ چنانچہ جناب آمنہ

سلام اللہ علیہا، جناب فاطمہ بنتِ اسد، جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا و دیگر خواتین بنی ہاشم کے فضائل سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اس خاندان میں بیٹی کو کسی طرح بھی بیٹوں سے کم تر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خواتین کی تکریم کرنا، ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا، ان کے ہاں آنا جانا، معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ ہندوانہ سوچ ہے کہ بیٹی کے گھر پانی بھی نہیں پینا چاہیے۔

مشہور روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ اکثر جناب فاطمہ زہراؑ کے گھر جایا کرتے تھے اور آیۂ تطہیر کے نزول کے بعد روزانہ دروازۂ بتول پر آ کر آیۂ تطہیر کی تلاوت فرماتے تھے۔ جب بھی شہر سے باہر جاتے تو سب سے آخر میں جناب فاطمہ زہراؑ کے گھر تشریف لے جاتے اور جب مدینہ واپس آتے تو سب سے پہلے جناب سیدہؑ کے پاس جاتے۔ اسی طرح مولائے کائنات حضرت علیؑ، ضربت سے قبل والے دن روزہ افطار کے لیے اپنی بیٹی جناب اُمِ کلثومؑ کے گھر پر تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں بیٹی کی بہت تکریم ہے۔

بیٹی کے گھر جانے کا ایسا ہی واقعہ ولادتِ علیؑ کے روز جناب فاطمہ بنت اسدؑ کا اپنی بیٹی جناب اُمِ ہانی کے گھر موجود ہونے کا ہے۔ جنابِ اُمِ ہانی جنابِ ابو طالبؑ کی صاحبزادی اور امیر المومنین جناب علی ابن ابی طالبؑ کی ہمشیرۂ معظمہ ہیں۔ ۱۳ رجب سن ۳۰ عام الفیل کو جناب فاطمہ بنت اسدؑ اپنی بیٹی جناب اُمِ ہانی کے گھر تشریف فرما تھیں۔ جناب اُمِ ہانی کا گھر خانۂ کعبہ کے بہت قریب، رکن یمانی کی سیدھ میں چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس جگہ سے اور آگے جا کر بابِ اُمِ ہانی اب تک موجود ہے۔ اسی سے متصل بابِ علیؑ تھا جس کا نام موجودہ حکمرانوں نے بابِ عبد العزیز کر دیا۔ ان دونوں ابواب کے ناموں کی وجہ تسمیہ یہی تھی کہ یہ مقامات جناب ام ہانی کے مکان اور رکن یمانی کی سیدھ میں تھے۔ یعنی جناب اُمِ ہانی کا گھر رکن یمانی اور بابِ علیؑ (موجودہ بابِ عبد العزیز) کے درمیان تھا۔ اس لیے وہ گھر سے نکل کر خانۂ کعبہ پہنچ گئیں۔

حضرت علیؑ کی ولادت کا واقعہ:

"یزید بن قعنب کہتے ہیں میں، ابن عباس اور قبیلہ عبدالعزیٰ کے چند لوگ خانۂ کعبہ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ہم نے جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ کو دیکھا جو کہ حاملہ تھیں اور ان کے حمل کو نو ماہ گزر چکے تھے۔ وہ درد میں مبتلا تھیں۔ انہوں نے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو کر عرض کی "اے مرے پروردگار، میں تجھ پر، تیرے رسولؐ پر اور جو تو نے کتابیں بھیجیں ان پر ایمان رکھتی ہوں۔ اپنے جد جناب ابراہیمؑ کے پیغام کی تصدیق کرتی ہوں۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ انہوں نے اس بیت اللہ کو بنایا ہے۔ اس کا واسطہ جس نے اس بیت اللہ کو تعمیر کیا اور اس بچے کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے، تجھے قسم دیتی ہوں اس کی ولادت آسان فرما۔"

ہنس کر بولی بنتِ اسد سے کعبہ کی دیوار
شیر کی دختر، شیر کی مادر، یہ گھر تیرے نام

یزید بن قعنب کہتے ہیں: اس وقت ہم نے دیکھا کعبہ کی دیوار شق ہوئی اور فاطمہؑ کعبہ میں داخل ہوئیں اور غائب ہو گئیں اور دیوار آپس میں مل گئی۔ ہم کھڑے ہو گئے تاکہ جا کر خانۂ کعبہ کا تالہ کھولیں۔ تالہ نہ کھلا، ہم سمجھ گئے کہ یہ سب اللہ کی مرضی سے ہوا ہے۔

جب جناب فاطمہ بنت اسدؑ کعبہ میں داخل ہوئیں اور حضرت علیؑ پیدا ہوئے تو آنکھیں بند تھیں اور دودھ بھی نہ پیا تھا۔ آپ سخت پریشان ہوئیں۔ یا اللہ یہ کیسا بچہ ہے۔ جب جناب رسالت مآب کو ولادت کی خبر پہنچی تو آپؐ بہت خوش ہوئے۔ خانۂ کعبہ میں تشریف لائے۔ آنحضرتؐ جیسے ہی بچی کے قریب پہنچے، حضرت علیؑ نے آنکھیں کھول دیں اور ہمکنے لگے۔ حضرتؐ نے گود میں لے کر پیار کیا اور اپنی زبان منہ میں دے کر چسانے لگے۔ یہ لعابِ دہنِ رسالت، علم کا سرچشمہ تھا جو سینۂ رسولؐ سے نکل کر علیؑ کے دل میں پہنچ

رہا تھا۔ اسی لئے جناب علی مرتضیٰ فرمایا کرتے تھے کہ میرے سینے میں جو علم ہے وہ لعاب رسول کا اثر ہے۔ مجھے رسولؐ نے علم اس طرح بھرایا ہے جیسے پرندے اپنے بچے کو بھراتے ہیں۔ حضرت علیؑ نے آغوشِ رسولؐ میں قرآن کی تلاوت فرمائی۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ قرآن کی رو سے جناب عیسیٰؑ گہوارے میں کلام کر چکے ہیں۔

محمد بن محمود قزوینی شافعی نے لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ پیدا ہوئے اور جناب رسالت مآبؐ انہیں دیکھنے کے لیے خانۂ کعبہ میں آئے تو حضرت علیؑ رسول اللہؐ کو دیکھ کر مسکرائے اور عرض کی "السلام علیکم یا رسول اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ" اور آپ کی طرف متوجہ ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ حالانکہ قرآن اس وقت تک نازل بھی نہیں ہوا تھا۔ اور سورۂ مومنون کو شروع سے اس کی گیارہویں آیت کے آخری لفظ "خٰلِدُوْنَ" تک تلاوت کیا۔

سورۂ مومنون، ابتدا سے گیارہویں آیات کا ترجمہ:

"یقیناً صاحبان ایمان کامیاب ہو گئے۔ جو اپنی نمازوں میں گڑگڑانے والے ہیں۔ اور لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ علاوہ اپنی بیویوں اور اپنے ہاتھوں کی ملکیت کنیزوں کے کہ ان کے معاملے میں ان پر کوئی الزام آنے والا نہیں ہے۔ پھر اس کے علاوہ جو کوئی اور راستہ تلاش کرے گا وہ زیادتی کرنے والا ہوگا۔ اور جو مومنین اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ وارثان جنت ہیں، جو فردوس کے وارث بنیں گے اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں"۔

حضورِ اکرمؐ نے فرمایا:

''اے علیؑ! تمہاری وجہ سے ان مومنین نے رستگاری حاصل کر لی ہے۔''

چار دن گزر جانے کے بعد بچے کو ہاتھوں پر لیے ہوئے جناب فاطمہ بنت اسدؑ خانۂ کعبہ سے باہر آئیں۔ اس طرح انہیں سابقہ دو خواتین پر برتری حاصل ہوگئی۔ چونکہ مزاحم کی بیٹی جناب آسیہ چھپ کر اللہ کی عبادت کرتی تھیں۔ ایسی جگہ پر اللہ کی عبادت کرنا مجبوری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جنابِ عمران کی بیٹی جنابِ مریمؑ نے کھجور کے خشک درخت کو ہلایا تو اس سے تازہ کھجوریں گریں اور انہوں نے کھائیں۔ لیکن جب فاطمہ بنت اسدؑ خانۂ کعبہ میں داخل ہوئیں تو بہشتی میوے اور کھانا کھایا۔ جس وقت انہوں نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو غیب سے آواز آئی: ''فاطمہ! اس بچے کا نام علیؑ رکھنا کیونکہ اس کا رتبہ بلند ہے اور اللہ علی اعلیٰ کہہ رہا ہے کہ میں نے اس کا نام اپنے نام پر رکھا ہے اور اس کی تربیت اپنے آداب اور اخلاق سے کی۔ اسے اپنے علم سے آگاہ کیا۔ یہ وہ ہے جو خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کرے گا۔ خانۂ کعبہ کی چھت پر اذان دے گا اور میری تقدیس کرے گا۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جو اسے دوست رکھتا ہے اور اس کے فرمان کی اطاعت کرتا ہے۔ بدبخت ہے وہ جو اس سے دشمنی رکھتا ہے اور اس کی نافرمانی کرتا ہے۔''

حضرت ابوطالبؑ اپنے فرزند کی خوش خبری سن کر آگے بڑھے تو اس اسدِ کردگار نے اپنے والدِ عالی قدر کو سلام کیا: ''السلام علیک یا ابتہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ''۔

گھر آنے کے بعد حضورِ اکرمؐ اس بچے کے سرپرست بن گئے۔ آپؐ اس بچے کی آمد سے بہت خوش تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ بچہ ان کا یاور و مددگار اور جانشین ہوگا لہٰذا آپؐ نے بچپنے سے ہی اس بچے پر نظرِ التفات رکھی۔ اس کا گہوارا اپنے بستر کے قریب رکھا۔ اس کا کھانا پینا، دیکھ بھال، تربیت سب ذمہ داریاں اپنے اوپر رکھیں۔ فرماتے تھے ''یہ میرا بھائی،

دوست، مددگار، میرا برگزیدہ، میری پناہ گاہ، میرا وصی، میرا داماد، میری وصیت کا امین اور میرا جانشین ہے۔"

جہاں کہیں بھی آپؐ جاتے، حضرت علیؑ کو اپنے ہمراہ رکھتے۔ درحقیقت حضرت علیؑ ایک فرع (شاخ) جیسے تھے، جو کہ ہر وقت اپنی اصل (جڑ) سے ملحق رہتی ہے۔ وہ حضور کے لیے ایسا سایہ تھے جو سایہ والے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

سورۂ رحمٰن کی آیت ۶۰ کا ترجمہ ہے: "کیا احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟" حضور اکرمؐ اس احسان کا بدلہ چکا رہے تھے جو ان کی اپنی پرورش اور حفاظت کے لیے جناب ابوطالبؑ نے فرمائی تھی۔ اسی طرح حضور اکرمؐ کے بیٹے جناب ابراہیمؑ (جو حضرت امام حسینؑ کے ہم سن تھے) کو حضرت علیؑ خوب کھلاتے تھے اور انہیں اپنے کاندھے پر بٹھا کر مدینہ کی سیر کروایا کرتے تھے۔ یہ اس احسان کا بدلہ تھا جو ان کی اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کے سلسلے میں حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا۔

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ چہاردہ معصومینؑ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں بسر ہوتا تھا: جوشؔ ملیح آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

اہلِ بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی
ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ

حضرت علیؑ کا نسب:

حضرت علیؑ جناب ابوطالبؑ کے، جناب ابوطالبؑ جناب عبدالمطلبؑ کے، جناب عبدالمطلبؑ جناب ہاشم کے، جناب ہاشم جناب عبدِ مناف کے، جناب عبدِ مناف جناب قصی کے، جناب قصی جناب کلاب کے، جناب کلاب جناب مرہ کے، جناب مرہ جناب کعب کے، جناب کعب جناب لوی کے، جناب لوی جناب غالب کے، جناب غالب

جناب فہر کے، جناب فہر جناب مالک کے، جناب مالک جناب نضر کے، جناب نضر جناب کنانہ کے، جناب کنانہ جناب خزیمہ کے، جناب خزیمہ جناب مدرکہ کے، جناب مدرکہ جناب الیاس کے، جناب الیاس جناب مضر کے، جناب مضر جناب نزار کے، جناب نزار جناب معد کے اور جناب معد جناب عدنان کے بیٹے ہیں۔

جناب ابوطالبؑ نے تینتالیس (۴۳) سال تک حضرت عبدالمطلب جیسی برگزیدہ، بلند پایہ اور عظیم المرتبت ہستی کے زیرِ سایہ رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کی، علوم و معارف کی وادیوں کو طے کیا، مکارم اخلاق اور صفات حسنہ سے متصف ہوئے، تہذیب و تمدن کی بلند قدروں کو زندگی کا شعار بنایا اور علمی و ادبی رفعتوں کے نقطۂ کمال پر فائز ہو کر اپنے دور میں ایک بلند پایہ ادیب، ممتاز سخن طراز، عظیم مفکر، عدیم المثال دانش ور اور بہترین قائد تسلیم کیے گئے۔ علمی، ادبی اور فکری صلاحیتوں کے ساتھ آپ وجیہ صورت، بلند قامت، پر عزم، پر حوصلہ، پر وقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے سے ہاشمی جلالت و تمکنت اور خدو خال سے قریشی سطوت آشکار تھی۔ زبان سے فصاحت و بلاغت کے سوتے پھوٹتے تھے اور بیان سے علم و حکمت کے چشمے ابلتے تھے۔ آپ اپنے اسلاف کے اعلیٰ کردار کا نمونہ اور اولاد عبدالمطلبؑ میں عادات و اطوار کے لحاظ سے اپنے باپ کی سیرت کا آئینہ تھے۔ حضرت ابوطالبؑ اعتدال پسندی، انصاف پروری اور حلم و بردباری کے جوہر سے آراستہ تھے۔ عرب کے نامور حکماء و ادباء آپ سے استفادہ کرتے اور اخلاق فاضلہ کا درس لیا کرتے تھے۔

حضرت علیؑ کی والدہ فاطمہ بنتِ اسد، جناب اسد کی صاحب زادی تھیں۔ اسد ہاشم کے بیٹے اور ہاشم عبد مناف کے اور عبد مناف قصی کے بیٹے ہیں۔ جناب فاطمہ بنت اسدؑ، حضرت علیؑ کی والدہ، رسول اللہؐ کی ماں کی جگہ پر تھیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے ان کے دامن میں پرورش پائی تھی۔

جنابِ فاطمہ بنت اسدؑ کا اعزاز:

کہتے ہیں کہ جب جناب آمنہ بنت وہبؑ کے بطن سے رسول اکرمؐ پیدا ہوئے جناب فاطمہ بنت اسدؑ نے اپنے شوہر جناب ابوطالبؑ کو بھتیجے کی ولادت کی مبارک باد دی۔اسی وقت جناب ابوطالبؑ کے دل پر جیسے الہام ہوگیا کہ اللہ انہیں ایک فرزند عطا کرے گا جو آنحضرت کا بھائی، وصی اور جانشین ہوگا۔انہوں نے اپنی زوجۂ عالیہ سے کہا: ''تقریباً تیس سال بعد اللہ ہمیں بھی ایک بیٹا عطا کرے گا جو کہ نبوت کے علاوہ ہر لحاظ سے محمدؐ جیسا ہی ہوگا۔

جناب ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؑ روتے ہوئے اور انا للہ و انا الیہ راجعون کا ورد کرتے ہوئے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضورؐ کے استفسار پر آپ نے فرمایا: یا رسول اللہؐ میری والدہ فاطمہ بنت اسدؑ رحلت فرما گئی ہیں جناب ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ خبر سن کر جناب رسالت مآب بھی گریہ فرمانے لگے اور فرمایا کہ اے علیؑ اللہ آپ کی والدہ پر رحمت فرمائے۔وہ آپؑ ہی کی نہیں میری بھی ماں تھیں۔ میری قمیض اور عمامہ لے جائیں اور انہیں کفن دیں۔انہیں بہترین غسل دیں اور میرے آنے سے پہلے جنازہ کو نہ اٹھائیں، کیونکہ ان کی تدفین اور دوسرے امور میرے ذمہ ہیں۔ کچھ دیر بعد پیغمبرؐ تشریف لائے۔ جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ کا جنازہ آپؐ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے نماز جنازہ ادا فرمائی۔

حضور اکرمؐ نے جناب فاطمہ بنتِ اسد کے جنازے پر چالیس تکبیریں کہیں اور میت کو قبر میں اتارنے سے پہلے بذات خود قبر میں اترے اور فرشِ قبر پر ساکت حالت میں کچھ دیر لیٹے رہے۔اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: اے علیؑ! اے حسنؑ قبر میں داخل ہو جاؤ۔آپ دونوں قبر میں داخل ہوگئے۔ جناب رسالت مآب نے جو کام ضروری تھے انجام دیے۔

فارغ ہو کر فرمایا: اے علیؑ! اے حسنؑ! قبر سے باہر نکل جاؤ۔ بس وہ دونوں قبر سے باہر آ ئے۔ جناب رسالت مآبؐ نے قبر کے سرہانے آ کر فرمایا "اے فاطمہؑ! میں محمدؐ بنی آدم کا سردار ہوں، افتخار نہیں کر رہا ہوں۔ جب منکر اور نکیر آپ کے پاس آئیں اور آپ سے پروردگار کے بارے میں سوال کریں تو کہہ دیجیے گا کہ اللہ میرا رب اور محمدؐ میرے پیغمبر اور اسلام میرا دین اور قرآن میری کتاب اور میرا بیٹا میرا امام اور ولی ہے۔" پھر بارگاہ الٰہی میں دعا مانگی: "اے اللہ! فاطمہ کو ان کے محکم کلمات پر ثابت قدم رکھ۔" اس کے بعد اپنے ہاتھ سے کچھ مٹی قبر میں ڈالی اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر مارتے ہوئے فرمایا: "مجھے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، فاطمہ نے میرے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر لگنے کی آواز سنی ہے۔" بس جناب عمار یاسرؓ کھڑے ہوئے اور کہا "یا رسول اللہؐ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہو جائیں، فاطمہ کی میت پر ایسی نماز پڑھی جیسی کہ آج سے پہلے کسی میت پر نہیں پڑھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "یا ابو یقظان وہ اس نماز کے لائق ہے۔ وہ مجھ میں سے ہے۔ حضرت ابو طالبؑ سے ان کے کئی بیٹے تھے، ان کے پاس کافی دولت تھی جب کہ ہمارے پاس بہت ہی کم۔ فاطمہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلاتی تھیں، جب کہ دوسرے بھوکے ہوتے تھے۔ مجھے لباس پہناتی تھیں جب کہ دوسروں کے پاس لباس بوسیدہ یا نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجھے صاف ستھرا رکھتی تھیں جب کہ دوسرے بچے خاک آلود ہوتے تھے۔" جناب عمار یاسرؓ نے کہا: "یا رسول اللہؐ! آپ نے ان کی میت پر چالیس تکبیریں کیوں کہیں؟" آپ نے فرمایا: "ہاں! اے عمارؓ، میں نے اپنی دائیں طرف دیکھا تو فرشتوں کی چالیس صفیں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے ہر صف کے لیے ایک تکبیر کہی۔" جناب عمارؓ نے عرض کی: "آپ قبر میں کیوں لیٹ گئے تھے؟ جب کہ آپ کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔" فرمایا: "قیامت کے دن لوگ برہنہ محشور ہوں گے۔ میں نے اللہ سے التجا کی کہ ان کو لباس کے ساتھ زندہ فرمائے۔

مجھے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں قبر سے باہر نہیں نکلا مگر یہ کہ دو نورانی چراغ ان کے سر کے قریب اور دو نورانی چراغ ان کے ہاتھوں کے قریب اور دو نورانی چراغ ان کے پاؤں کے قریب دیکھے اور دو فرشتوں کو دیکھا جو ان کی قبر میں رہیں گے اور ہمیشہ ان کی بخشش اور مغفرت کی دعا طلب کریں گے۔"

مآخذ

(۱) "فضائلِ امیر المومنینؑ" تالیف: حجۃ الاسلام والمسلمین علی رضا صابری یزدی۔ مترجم: حجۃ الاسلام والمسلمین سید اشتیاق حسین کاظمی۔

(۲) "سیرتِ علی حقائق و معارف اسلام" مصنفہ: مفسرِ قرآن عالی جناب ادیب اعظم مولانا السید ظفر حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی نقوی الامروہوی۔

(۳) "تفسیر اسلام" مولفہ علامہ فروغ کاظمی۔ ناشر عباس بک ایجنسی، رستم نگر، درگاہ حضرت عباسؑ، لکھنؤ۔ یوپی، انڈیا۔

(۴) "قرآن، حدیث اور تاریخ کی مثالی خواتین" از ڈاکٹر احمد بہشتی، مترجم: جناب نثار احمد زین پوری، ناشر: انصاریان پبلیکیشنز، قم احسن علی بک ڈپو، کراچی۔

(۵) تراجم و تفاسیر قرآن: (الف) مفسر قرآن ڈاکٹر سید محمد حسن رضوی (ب) جناب علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ (ج) مولانا سید ظفر حسن نقوی امروہویؒ۔

حضرت علیؑ کی مظلومیت

جناب سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اپنی نبوت کے اعلان کا حکم آیا تو آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بلایا اور دعوت طعام دی۔ جب سب جمع ہو گئے تو ضیافت کے بعد آپؐ نے اللہ کے حکم کے تحت انہیں دعوت اسلام دی۔ یہ بھی کہا کہ جو آج میری نصرت، حمایت یا میرے مشن میں میری مدد کرے گا وہی میرا وصی، میرا وزیر، میرا مشیر اور میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا۔ حضورؐ نے یہ اعلان تین بار کیا مگر حاضرین میں سے کسی نے ان کی دعوت کا جواب نہیں دیا سوائے حضرت علیؑ کے۔ ہر بار حضرت علیؑ نے فرمایا، "یا رسول اللہؐ میں اپنی آخری سانس تک آپ کی نصرت کروں گا۔" چنانچہ حضور اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے سر پر ہاتھ رکھا اور انہیں اپنا وزیر، مشیر، اور اپنے بعد اپنا خلیفہ قرار دیا۔ حضور اکرمؐ اور حضرت علیؑ کو اس دن تمام قرابت داروں کی نیتوں کا اندازا ہوا کہ حضورؐ کی دعوت اسلام پر کسی نے لبیک نہ کہا۔

دعوت اسلام تو اتری نہیں حلقوم سے
ذوالعشیرہ میں اگرچہ ڈٹ کے کھائیں روٹیاں

کم سنی میں حضرت علیؑ کے احساسات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

دعوت ذوالعشیرہ کے بعد حضرت علیؑ نے اپنی زندگی کو حضورؐ کی حفاظت اور حمایت کے لیے وقف کر دیا۔ ہر جنگ میں پیش پیش رہے۔ کسی جنگ میں پیٹھ نہیں دکھلائی۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو تہِ تیغ کیا اور پرچم اسلام کو سربلند کیا۔

یہ پہلے دن کا وعدہ دونوں (جناب رسالت مآبؐ اور جناب مولائے کائنات) نے دمِ آخر تک نبھایا۔

حضورؐ نے اپنی حیات کے آخری سال میں حج سے واپسی پر اپنے پرانے وعدے (دعوت ذوالعشیرہ) کا ادعا کیا۔ بہت سی باتوں اور نصائح کو ایک پھر دہرایا اور فرمایا۔ من کنت مولاہ وہذا علی مولا۔۔۔۔۔۔۔ میں جس جس کا مولا ہوں یہ علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ تمام حجاج نے اس موقع پر حضرت علیؑ کو مبارک باد دی۔

لیکن کچھ ہی دنوں میں مسلمانوں کی اکثریت نے رسولؐ کے فرمان کو بھلا دیا۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ حضورؐ کی ظاہری حیات کے چند روز رہ گئے۔ اصحابؓ کے مجمع سے حضورؐ نے کاغذ اور قلم مانگا تاکہ وہ ایک تحریر لکھوا دیں جس سے مستقبل میں مسلمانوں میں کوئی گمراہی نہ ہو۔ اس موقع پر حضورؐ کی خواہش کو پورا نہیں کیا گیا اور کاغذ وقلم نہیں دیا گیا۔ امکان یہی تھا کہ حضورؐ اپنے بعد حضرت علیؑ کو خلیفہ نامزد کر دیں گے۔ علیؑ کی مظلومیت کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔

اب حضورؐ کی رحلت کا وقت آن پہنچا۔ غسل وکفن کے لیے صرف حضرت علیؑ رہ گئے اور تمام لوگ سقیفہ میں خلافت کا قضیہ طے کرنے پہنچ گئے۔ اس اثنا میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ گھر آئے اور حضرت علیؑ سے سقیفہ چلنے اور خلافت کا تصفیہ میں مدد کرنے کی درخواست کی۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں اس وقت حضورؐ کے غسل وکفن میں مشغول ہوں، یہ کام چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔ جہاں تک حضورؐ کے بعد خلیفہ بنائے جانے کا مسئلہ ہے، تو کیا لوگ دعوتِ ذوالعشیرہ اور خطبۂ غدیر کو بھول گئے ہیں؟

یہاں بھی حضرت علیؑ نے کمال صبر کا مظاہرہ کیا۔ حضرت علیؑ کی مظلومیت کی یہ بھی بڑی دلیل ہے۔

اس کے بعد حضرت علیؑ گوشہ نشین ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد ہی جناب فاطمہؑ نے فدک کا مقدمہ پیش کیا، جو کہ رد کر دیا گیا۔ گواہیاں مانی نہیں گئیں۔ یہ صدمہ صرف جناب سیدہ کو ہی نہیں حضرت علیؑ کو بھی شاق گزرا۔ یہاں بھی حضرت علیؑ نے صبر اور مظلومیت کا نیا باب روشن کیا۔

اب حضرت علیؑ سے جبراً خلیفۂ وقت سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس ظلم پر بھی حضرت علیؑ نے صبر اور مظلومیت کا سہارا لیا۔

خلافت سوئم کے بعد حضرت علیؑ کو خلافت کی پیش کش کی گئی جو انہوں نے کئی دن تک قبول نہیں کی۔ بعد میں اپنی شرائط پر یہ عہدہ قبول کیا اور امت کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسلام دشمن عناصر اپنی سازشوں میں مصروف رہے۔ ان پر کئی جنگیں مسلط کی گئیں۔ جنگ صفین، جنگ نہروان اور جنگ جمل۔ ان تمام قضیوں کو حضرت علیؑ نے تدبر، تحمل اور بردباری سے نمٹایا۔ دشمنوں کو اپنا ہر حربہ ناکام ہوتا نظر آیا تو انہوں مسجد کی حرمت کو پامال کرنے کی کوشش کی۔ ایک خارجی عبدالرحمان ابن ملجم کو انعام کا لالچ دے کر حضرت علیؑ کو مسجد میں عین نماز میں شہید کرنے کی کوشش کی گئی۔ ضربت لگنے کے تین دن بعد امامؑ اول امیر المومنین حضرت علیؑ شہادت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے۔

آٹھویں امام حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''یا علیؑ! تم میرے بعد مظلوم ہو گے۔ افسوس ہے اس پر جو تمہارے ساتھ جنگ کرے اور خوش نصیب ہے وہ جو تمہارے ساتھ مل کر جہاد کرے۔ یا علیؑ تم وہی ہو جو میرے بعد میری زبان اور میرے کلام میں گفتگو کرو گے۔ افسوس ہے اس پر جو تمہارے کلام کو قبول نہ کرے اور خوش نصیب ہے وہ جو تمہارے کلام کو قبول کرے۔ یا علیؑ تم میرے بعد اس امت کے سردار اور پیشوا اور میرے جانشین ہو گے، جو تم سے جدا ہوا وہ

قیامت کے دن مجھ سے جدا ہوگا اور جو تمہارے ساتھ رہا قیامت کے دن میرے ساتھ ہوگا۔

یا علیؑ جس نے تم پر ظلم کیا اس نے مجھ پر ظلم کیا اور جس نے تمہارے ساتھ انصاف کیا اس نے مجھ سے انصاف کیا اور جس نے تمہارا انکار کیا اس نے میرا انکار کیا اور جس نے تمہیں دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے تم سے دشمنی کی اس نے مجھ سے دشمنی کی اور جس نے تمہاری اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے تمہاری نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی ہے۔"

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا "جس نے میرے بعد میرے جانشین علیؑ پر ستم کیا گویا کہ اس نے میری نبوت اور مجھ سے پہلے والے پیغمبروں کی نبوت کا انکار کیا ہے۔"

پیغمبر اکرمؐ نے مزید فرمایا: "یا علیؑ میرے بعد تم پر ظلم وستم ہوگا۔ افسوس ہے اس پر جو تم پر ظلم کرے اور تمہارے حق پر تجاوز کرے اور خوش بخت ہے وہ جو تمہاری پیروی کرے اور تم پر جرات پیدا نہ کرے۔"

حضرت علیؑ کا کنویں سے باتیں کرنا:

جناب میثمؒ نے فرمایا کہ ایک رات میرے مولا امیر المومنینؑ کوفہ سے باہر مسجد جعفی پہونچے۔ وہاں قبلہ رخ ہو کر چار رکعت نماز پڑھی۔ تسبیح کے بعد ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور اللہ سے گڑگڑا کر دعا کی۔ دعا کے بعد مسجد سے باہر آئے۔ میں بھی حضرتؑ کے پیچھے چل پڑا۔ حضرتؑ صحرا میں پہنچے۔ آپؑ نے میرے گرد لکیر کھینچی اور کہا اس دائرے سے خارج نہ ہونا۔ اس کے بعد وہ خود روانہ ہوئے۔ رات بہت تاریک تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میں نے علیؑ کو ان کے اتنے دشمنوں کے ہوتے ہوئے اکیلا چھوڑ دیا۔ خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو اللہ اور اس کے رسول کو کیا عذر پیش کروں گا۔" چنانچہ حضرت علیؑ کی حکم عدولی کی اور ان کے پیچھے گیا۔ میں نے دیکھا کہ حضرتؑ نے اپنے سر مبارک کو کنویں میں داخل کیا ہوا تھا اور کنویں کے

ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ کنواں بھی حضرتؑ سے باتیں کر رہا تھا۔ حضرتؑ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کون ہو تم؟ میں نے اپنا نام بتایا تو کہا میں نے تم سے اپنے پیچھے نہ آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے عرض کی کہ مولا آپؑ کے دشمنوں کے خوف کی وجہ سے میرے دل کو آرام نہیں تھا۔ فرمایا: جو کچھ میں کہہ رہا تھا کوئی چیز سنی؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا: اے میثمؒ میں اپنے سینے میں کچھ ضروری امور محسوس کر رہا ہوں۔ زمین پر ایک گڑھا کھودوں گا اور اپنے راز اس سے بیان کروں گا اور زمین میں جو پودا اگے گا اس بیج سے ہو گا جو میں نے اس میں بویا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی وصیت:

جس وقت ابن ملجم لعنت اللہ علیہ نے آپؑ کے سر پر ضرب لگائی تو حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ سے یہ وصیت فرمائی: "میں تم سے تقویٰ الٰہی کی وصیت کرتا ہوں۔ دنیا تم پر جو ظلم کرے توجہ نہ کرنا اور جو کچھ تمھارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اس کے لیے غمگین نہ ہونا۔ حق بیان کرنا اور آخرت میں اجر کے لیے کام کرنا۔ ظالم کا دشمن بننا اور مظلوم کے مددگار بننا۔ میں تم دونوں اور تمام بیٹوں اور اپنے خاندان کو اور جس کے ہاتھ میں میرا وصیت نامہ پہنچے، وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ الٰہی اختیار کریں۔ اپنے کاموں کو منظم اور اختلافات کو ختم کریں۔ میں نے تمہارے جدِ بزرگوارؐ سے سنا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان صلح کر لینا ایک سال کی نماز اور روزوں سے افضل ہے۔ اللہ کے لیے، اللہ کے لیے یتیموں کی فکر میں رہیں۔ روٹی کے لقمے کے لیے انہیں منھ کھولنے سے روکیں (یعنی یتیموں کو کھانا کھلائیں اور ان سے لاپرواہی نہ کریں)۔ اللہ کے لیے، اللہ کے لیے اپنے پڑوسیوں کی فکر میں رہیں۔ اس لیے کہ پیغمبر اکرمؐ کی پڑوسیوں کے بارے میں خاص وصیت ہے اور ان کے بارے میں اس قدر سفارش کی ہے کہ ہم نے گمان کیا کہ انہیں اپنا وارث بنانا چاہتے ہیں۔

اللہ کے لیے، اللہ کے لیے قرآن مجید پر توجہ کرو اور ہوشیار رہو کہ دوسرے لوگ قرآن

عمل کرنے میں تم سے سبقت نہ لے جائیں۔

اللہ کے لیے، اللہ کے لیے نماز کے امور میں توجہ کرو کیونکہ نماز تمہارے دین کا ستون ہے۔

اللہ کے لیے، اللہ کے لیے اپنے خانہ خدا کے بارے میں بھی توجہ کرو، جتنی بھی قدرت رکھتے ہو اس کو خالی نہ چھوڑو۔ اس لیے کہ اگر اس سے چشم پوشی کی تو تمہیں فرصت نہیں دی جائے گی۔

اللہ کے لیے، اللہ کے لیے اپنے مال اور جان اور زبان سے اللہ کی راہ میں جہاد کے بارے میں توجہ کریں اور روابط کی محافظت کرنا لازم ہے اور ایک دوسرے کی نسبت جود و سخاوت رکھیں اور ایک دوسرے سے لاپرواہی اور رابطہ توڑنے سے پرہیز کریں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کریں، کیونکہ ظالم تم پر مسلط ہو جائیں گے۔ بس اس وقت دعا کرتے ہو تو اللہ تمہاری دعا قبول نہیں کرتا ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے عبدالمطلب کے بیٹوں کی طرف دیکھا اور فرمایا: ہوشیار رہیں، قتل کرنے اور خون بہانے میں ہاتھ نہ ڈالیں! اس پر بھی توجہ رکھیں کہ میرے قتل کے بدلے میں فقط میرے قاتل کو قتل ہونا چاہیے۔ توجہ کریں، جس وقت میں اس کی ضربت کی وجہ سے اس دنیا سے چلا گیا، اس کی ضربت کے بدلے میں فقط اس کو ایک ضرب ماریں اور اس کو مثلہ نہ کریں۔ اس لیے کہ میں نے رسولؐ سے سنا کہ مثلہ کرنے سے پرہیز کریں اگرچہ پاگل کتا ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت علیؑ کا اپنے قاتل کی تواضع کرنا:

ضربت لگنے کے بعد مولائے کائنات نے ابن ملجم کے بارے میں وصیت فرمائی:

''اس کو کھانا اور پانی دینا، اس کی قید کو آسان کرنا۔ اگر میں زندہ رہا تو اپنے خون کا خود مالک ہوں، چاہوں تو اسے بخش دوں اور اگر چاہوں تو قصاص لوں۔ اگر میں چل بسا اور تم نے اسے قتل کیا تو اس کو مثلہ نہ کرنا۔''

پھر مولا نے اپنے فرزند اکبر حضرت امام حسن علیہ السلام سے فرمایا: ''اے حسنؑ

میرے قاتل کی آنکھوں پر پٹی نہ باندھو اور اسے میرے کھانے سے کھانا دے دو۔ جو پانی مجھے پلاتے ہو وہی اس کو بھی پلاؤ۔ اگر میں زندہ رہا تو اپنے حق کا فیصلہ خود کروں گا اور اگر چل بسا تو اسے ایک ضربت لگانا اور اس کو مثلہ نہ کرنا۔ اس لیے کہ میں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے کہ مثلہ کرنے سے پرہیز کیا جائے چاہے وہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت:

جناب رسالت مآبؐ نے حضرت علیؑ کو شہادت کی بشارت دی:

آنحضرت نے فرمایا: اے علیؑ! تمہیں شہادت مبارک ہو۔ میرے بعد تم پر ظلم ہوگا۔ تمہیں قتل کیا جائے گا۔ حضرت علیؑ نے عرض کی: یارسول اللہ آیا اس وقت میرا دین سالم (دین حق پر ثابت قدم ہونا) ہے؟ فرمایا: ہاں تمہارا دین سالم ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: "میں نے حضور اکرمؐ کو دیکھا کہ آپؐ حضرت علیؑ کو بغل میں لیے ہوئے ہیں، بوسہ لیتے ہوئے فرما رہے ہیں: میرا باپ اس تنہا شہید پر قربان ہو جائے۔"

حضرت علی علیہ السلام موت سے نہیں ڈرتے:

حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: اللہ کی قسم ابو طالبؑ کا فرزند اس بچے سے زیادہ موت سے انس رکھتا ہے جو بچہ اپنی ماں کے پستانوں سے انس رکھتا ہے۔

ابن نباتا فرماتے ہیں "میں نے جناب امیرؑ سے کہا: رسول اکرمؐ خضاب لگایا کرتے تھے۔ آپؑ کیوں نہیں لگاتے؟ فرمایا: میں منتظر ہوں کہ اس امت کا بدبخت ترین انسان میرے سر کے خون سے میری محاسن کو خضاب کرے گا۔ یہ وہی وعدہ ہے جس کی مجھے میرے حبیبؐ نے خبر دی ہے۔"

ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا:

متعدد روایات میں بیان ہوا ہے کہ جب مولائے کائنات کے سر پر ضربت لگی، آپ

نے فرمایا: ''رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔''

حضرت علیؑ کے لاتعداد کارنامے ہیں۔ ولادت سے شہادت تک ان کی زندگی دین کی آبیاری، حضور اکرمؐ کی حفاظت، جنگوں میں سبقت، کارِ خیر کی دعوت وغیرہ وغیرہ کی اتنی مثالیں ہیں کہ ان کا بیان کرنا ناممکن ہے۔

فقیر نے بہت غور کیا، کتابیں کھنگالیں کہ امیرالمومنینؑ نے وقت ضربت یہ جملہ کیوں کہا کہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔ پھر احساس ہوا کی مولاؑ کا ایک ایک سانس اسلام اور حضور اکرمؐ کی نصرت و حفاظت میں صرف ہوا۔ ہر جنگ میں پیش پیش رہے۔ لاتعداد موقعوں پر کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے لیکن کبھی نہیں کہا کہ میں آج کامیاب ہوگیا۔

جس وقت کسی معرکہ کو سر کر کے آپؑ تشریف لاتے تو تمام اصحاب و انصار کے چہرے خوشی سے دمکتے تھے، جب کہ حضرت علیؑ سنجیدہ رہتے تھے۔ شاید انہیں شہید نہ ہو سکنے کا احساس ہوتا تھا۔ اب دوران نماز، عین حالت سجدہ میں ابن ملجم کے وار سے انہیں ادراک ہوا کہ آج میری شہید ہونے کی آرزو کا وقت آپہنچا۔ موت تو ہر بشر کو آنی ہے۔ موت کی بے شمار قسمیں ہیں لیکن شہادت کی موت افضل ترین موت ہے۔ آج ان کے دل کی مراد بر آئی تو بے ساختہ یہ الفاظ زبان پر آگئے۔ ''رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔''

میرا سلام اپنے مولاؑ کو، جو اپنی موت پر بھی اللہ کا شکر گزار تھا۔

مآخذ

''فضائل امیرالمومنینؑ''، تالیف حجۃ الاسلام والمسلمین علی رضا صابری یزدی، ترجمہ حجۃ الاسلام

شہزادیؑ کی ولادت

''عورت اگر بیٹی ہے تو رحمت، اگر بیوی ہو تو شوہر کے نصف ایمان کی وارث، اگر ماں ہے تو اس کے قدموں تلے جنت۔ لیکن جناب سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شان دیکھیے، اس باپ کے لیے رحمت جو خود رحمت اللعالمین ہیں، اس شوہر کے لیے نصف ایمان جو خود 'کلِ ایمان' ہیں اور آپ کے قدموں میں ان بیٹوں کی جنت جو خود جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔''

اگر کوئی پوچھے کہ قمری سال کا کون سا دن سب سے مبارک ہوتا ہے؟ تو میرا خیال ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۲۰ جمادی الثانی۔ یہ ہماری شہزادی، نبی کریمؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، گیارہ اماموں کی والدۂ ماجدہ، خاتونِ محشر، شہزادیٔ کونین، سیدۃ النساء العالمین جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت کی مبارک تاریخ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ربیع الاول کی ۷ یا ۱۲، جو حضور اکرمؐ کی پیدائش کی تاریخ ہے سب سے زیادہ مبارک ہے۔ بلاشبہ یہ بھی ایک مکرم تاریخ ہے کہ اس دن سرکارِ دوجہاںؐ دنیا میں تشریف لائے۔ لیکن ۲۰ جمادی الثانی وہ تاریخ ہے جو خود حضورؐ کے نزدیک بھی سال کی سب سے مکرم و معظم تاریخ رہی ہوگی۔

شہزادیؑ کی والدۂ ماجدہ، ملیکۃ العرب جناب خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ ان کا تعلق قریش کے ایک شریف اور معزز خاندان سے تھا۔ جناب خدیجہؑ نے جو کچھ بھی میراث میں پایا وہ تجارت میں لگا دیا۔ اس غرض سے انہوں نے دیانت دار افراد کو ملازم رکھا۔ ایک بار کاروباری

غرض سے ایک قافلہ شامؔ کو روانہ کرنا تھا جو جناب رسالت مآبؐ کے حوالے کیا گیا۔ یہ تجارت اسلامی اصولوں کے مطابق نہایت دیانت داری سے فرمائی گئی، سو واپسی پر آپؐ نے خطیر منافع جناب خدیجہؓ کے سپرد کیا۔ اس قافلہ کی نیک قیادت کا احوال جب جناب خدیجہؓ نے سنا تو حضورؐ کی شخصیت آپؓ کے دل میں گھر کر گئی۔ اپنے چچا زاد بھائی جناب ورقہ ابن نوفل کے توسط سے آپؓ نے شادی کا پیغام جناب رسالت مآب کو دیا، جو آپؐ نے اپنے چچاؤں سے مشورہ کے بعد قبول فرمایا۔ اس طرح عرب کی یہ عظیم خاتون حضورؐ کے عقد میں آئیں۔

یہ عقد حضور کے جاں نثار چچا جناب ابو طالبؑ نے پڑھایا۔ خطبۂ نکاح کی ابتدا "الحمد لله رب العالمین" سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ الفاظ اتنے پسند آئے کہ انہیں قرآن مجید کے پہلے سورے کی پہلی آیت بنا دیا۔

شادی کے مقاصد میں ایک مقصد نسل کا آگے بڑھنا بھی ہے۔ یہ خصوصیت بھی شہزادی کونین کے حصے میں آئی کہ سرور کائنات کی نسلِ مبارک ان کے ذریعہ آگے چلی۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ سب کی نسلیں ان کے بیٹوں سے چلتی آئی ہیں لیکن میری نسل حضرت علیؑ اور جناب زہراؑ سے آگے چلے گی۔ اس بات کی سند سورۂ کوثر بھی ہے۔ جس میں اللہ فرماتا ہے کہ اے رسولؐ ہم نے آپ کو کوثر (خیرِ کثیر یا جناب فاطمہؑ) عطا کی (جس سے آپ کی نسلِ مبارک چلے گی)۔

اس وقت حضور اکرمؐ قدرے تنگ دست اور تنہا تھے۔ اس مبارک شادی سے آپ کی تنگ دستی اور تنہائی دور ہوئی اور ایک بہترین مشیر و غم گسار مل گیا۔ جناب رسالت مآبؐ اور جناب خدیجہؓ ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے اور دونوں میں مثالی محبت تھی۔ ایک بار آپ نے فرمایا، اللہ کی قسم اللہ نے مجھے ان سے بہتر بیوی عطا نہیں کی۔ وہ اس وقت ایمان لائیں جب دوسرے کفر پر تھے۔ انہوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب دوسرے میری تکذیب کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا مال میرے اختیار میں دے دیا جب میں تنگ دست

تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری نسل ان سے چلائی۔

شہزادیؑ کے بشری وجود کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اس کے لیے دو (۲) روایات ملتی ہیں:

(۱) علامہ نسفی وغیرہ نے لکھا ہے کہ جب شبِ معراج جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بہشت میں تشریف لے گئے اور آپ حضرت خدیجہؑ کے قصر میں داخل ہوئے تو حضرت جبرئیلؑ نے ایک سیب اس قصر کے درخت سے لے کر کہا کہ اے محمدؐ اس سیب کو تناول فرمایئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس سے جو توانائی آپ کے جسمِ مبارک میں پیدا کرے گا وہ ایک لڑکی کی پیدائش کا باعث بنے گی۔ آپؐ اور جناب خدیجہؑ اس سے فیض یاب ہوں گے۔ جنابِ رسالت مآبؐ نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ جب حضرت خدیجہؑ کے شکمِ مبارک میں جناب فاطمہؑ تشریف لائیں تو حمل کے پورے عرصے بہشت کی خوشبو اپنے بدن میں پاتی رہیں اور جب آپؑ کی ولادت ہوگئی تو وہ خوشبو جناب سیدہؑ کی طرف منتقل ہوگئی۔ (شرف النبوہ، ذخائر العقبیٰ)۔ جنابِ رسالت مآبؐ فرمایا کرتے تھے کہ جب جناب جبرئیلؑ مجھ کو بہشت میں لے گئے تو انہوں نے ایک سیب دیا۔ میں نے اسے کھایا اور اسی کا اثر میرے جسم میں ہوا اور خدیجہؑ تک منتقل ہوا تو جناب فاطمہؑ پیدا ہوئیں۔ (شرف النبوہ، ذخائر العقبیٰ، ینابیع المودۃ)

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت خدیجہؑ نے ایک دن جنابِ رسالت مآبؐ سے بہشت کے کسی میوے کے دیکھنے کی آرزو کی۔ جناب جبرئیلؑ دو سیب لے کر نازل ہوئے اور کہا کہ یارسول اللہ جس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ فرماتا ہے کہ ایک سیب اس میں سے آپ کھایئے اور دوسرا جناب خدیجہؑ کو کھلایئے۔ اس طرح میں آپؐ دونوں سے جناب فاطمہؑ کو پیدا کرنے والا ہوں۔ جو کچھ جبرئیل امینؑ نے کہا تھا وہ رسول اکرمؐ بجالائے۔

(۲) ایک دن جنابِ رسالت مآبؐ کے حضور جناب جبرئیلؑ نازل ہوئے اور عرض کی کہ اللہ نے آپ پر سلام بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ چالیس دن رات آپ جناب خدیجہؑ سے

علیحدگی اختیار کرلیں اور عبادت اور تہجد میں مشغول رہیں۔ پیغمبر اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چالیس دن تک جناب خدیجہؓ کے گھر نہ گئے۔ اس مدت میں رات کو نماز اور عبادت میں مشغول رہتے اور دن میں روزہ رکھتے۔

آپؐ نے جناب عمار کے توسط سے جناب خدیجہؓ کو پیغام بھیجا کہ اے معزز خاتون، میرا آپ سے کنارہ کشی کرنا کسی دشمنی اور کدورت کی وجہ سے نہیں ہے۔ آپ پہلے کی طرح میرے نزدیک معزز اور محترم ہیں بلکہ اس علیحدگی اور کنارہ کشی میں اللہ کے حکم کی پیروی کر رہا ہوں۔ اللہ مصلحتوں سے آگاہ ہے۔ اے خدیجہؓ آپ بزرگوار خاتون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر روز کئی کئی مرتبہ آپ کے وجود سے اپنے فرشتوں پر فخر کرتا ہے۔ رات کو دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آرام کیا کیجیے۔ میں اللہ کے حکم کا منتظر ہوں۔ اس مدت میں اپنے چچا جناب ابوطالبؑ کے گھر رہوں گا۔

جناب خدیجہؓ نے حضور کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ اس مدت میں کبھی کبھی اپنے محبوب کی جدائی میں غمگین رہتے ہوئے رویا کرتیں۔ جب اسی طرح چالیس دن مکمل ہو گئے تو اللہ کی طرف سے فرشتہ حضور اکرمؐ کے لیے بہشت سے غذا لایا اور عرض کی کہ آج کی رات اس بہشتی غذا کو تناول فرمائیے۔ آپؐ نے اس بہشتی غذا سے افطار فرمایا۔ جب آپؐ عبادت کے لیے کھڑے ہوئے تو جناب جبرئیلؑ نازل ہوئے اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسولؐ آج کی رات مستحبی نماز رہنے دیجیے اور جناب خدیجہؓ کے پاس تشریف لے جائیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کر رکھا ہے کہ آپؐ کے ذریعہ ایک پاکیزہ بچہ خلق فرمائے۔

حضور اکرمؐ جناب خدیجہؓ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جناب خدیجہؓ کا بیان ہے کہ "حسب معمول اس رات بھی دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آرام کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ سوائے محمدؐ کسی کو یہ دستک دینے کی اجازت نہیں۔ ایسے میں جناب رسالت مآبؐ کی دل نشین آواز میرے کانوں میں آئی۔

آپ فرما رہے تھے کہ "دروازہ کھولو، میں محمدؐ ہوں۔" میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ آپؐ خندہ پیشانی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر بعد جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کا نور مطہر ان کے مادی وجود میں آنے کا سبب بنا۔"

جناب خدیجہؑ نے جب سے حضور اکرمؐ سے شادی کی تھی، شہر کی عورتوں نے آپؑ کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا کہنا تھا کہ اے خدیجہؑ تم مال دار تھیں تو تمہیں مکہ کے کسی مال دار گھرانے میں شادی کرنی چاہیے تھی۔ تم نے ہماری بات نہیں مانی اس لیے ہم اب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ اس طرح آپ تنہائی کا شکار ہو گئیں۔ جناب فاطمہؑ کے شکم میں آنے کے بعد جناب خدیجہ مسرور اور شادمان رہنے لگیں۔ آپ اس بچے سے جو آپؑ کے شکمِ مبارک میں تھا مانوس رہنے لگیں اور اسی سے راز و نیاز کرتی رہتی تھیں۔

ایک روز جناب جبرئیلؑ جناب رسالت مآبؐ اور جناب خدیجہؑ کی خدمت میں بشارت لے کر حاضر ہوئے کہ یا رسول اللہؐ وہ بچہ جو جناب خدیجہؑ کے شکمِ مبارک میں ہے وہ ایک باعظمت لڑکی ہے، جس سے آپ کی نسل قائم رہے گی اور وہ دین کے ان پیشواؤں اور اماموں کی جو آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین ہوں گے، ماں ہوگی۔ جب حضور اکرمؐ نے اس بشارت کو جناب خدیجہؑ سے بیان فرمایا تو آپؑ بہت خوش ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بڑی سعادت بخشنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ اس تصور سے کہ اب ان کے ہاں وہ خوش بخت ذات شریفہ تشریف لانے والی ہے، جس سے دین مبین کے معصوم پیشوا پیدا ہوں گے، آپ کا دل باغ باغ ہو گیا۔

ولادت کا وقت آن پہنچا۔ جناب خدیجہ دردِ زہ سے بے قرار تھیں۔ اس دوران کسی کو اپنی سابقہ سہیلیوں اور قریش کی عورتوں کے پاس روانہ کیا اور کہلوایا کہ پرانی باتوں کو بھول جاؤ اور اس مشکل وقت میں میری مدد کرو۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص واپس آیا اور کہا کہ سب نے آپ کی خواہش کو رد کرتے ہوئے کہا کہ تم نے ہماری نصیحت قبول نہیں کی تھی اور ہماری مرضی

کے خلاف ایک فقیر یتیم سے شادی کرلی تھی، اس لیے اب ہم تمہاری کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ ان عورتوں کا دل دکھانے والا پیغام سن کر آپ بہت رنجیدہ ہوئیں اور صبر اختیار کیا۔ پروردگار عالم سے لو لگائی اور دعاؤں میں مصروف ہو گئیں۔

اس وقت اللہ کے فرشتے، جنت کی حوریں اور مقدس آسمانی عورتیں آپؑ کی مدد کے لیے آئیں اور آپؑ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد سے ہم کنار ہوئیں۔ تکلیف آسان ہوئی۔ شہزادی کونین سلام اللہ علیہا نے اس جہان کو اپنے وجود سے سرفراز فرمایا اور اپنے نورِ ولایت سے مشرق و مغرب کو روشن اور منور کر دیا۔

خان بہادر مولوی سید اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی اپنی کتاب ''سیرۃ فاطمۃ الزہرا صلوات اللہ علیہا'' میں امام قندوزیؒ کی ''ینابیع المودۃ'' کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''حضرت خدیجہؓ سے مروی ہے کہ جب مجھ کو جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کا حمل ہوا تو مجھے کوئی گرانباری نہیں معلوم ہوتی تھی اور وہ مجھ سے میرے بطن میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ جب ولادت کا وقت قریب ہوا تو چار خواتین معظمہ جن کے انوار و جمال کا وصف بیان نہیں ہو سکتا، تشریف لائیں اور وہ زنانِ بنی ہاشم سے مشابہ تھیں۔ میں ان سے ڈری۔ یہ دیکھ کر ایک عورت نے مجھ سے کہا: ''اے خدیجہؓ تم ہم سے مت ڈرو۔ میں سارۃ زوجۂ ابراہیم علیہ السلامؑ ہوں، دوسری آسیہ بنتِ مزاحم ہیں، یہ تمہاری اور دخترِ نیک اختر کی بہشتِ بریں میں رفیق ہوں گی۔ تیسری مریمؑ بنتِ عمران مادرِ عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چوتھی کلثومؑ خواہر موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ہم تمہارے پاس اللہ کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ ہم لوگ وقتِ ولادت تمہارے پاس موجود رہیں اور اس حالت میں تمہاری اعانت کریں۔ یہ کہہ کر ایک ان میں سے داہنی جانب، دوسری بائیں جانب، تیسری سامنے اور چوتھی پیچھے بیٹھ گئیں۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا پاک و پاکیزہ پیدا ہوئیں۔ جب آپؑ بطنِ مادر سے دنیا میں

تشریف لائیں تو اس قدر نور ساطع ہوا کہ مکے کے گھر روشن ہو گئے۔ مغرب و مشرق میں کوئی گھر ایسا نہ رہا جو اس نور سے منور نہ ہو گیا ہو۔ دس حورانِ جناں میری خدمت میں آئیں جن کے ہاتھ میں ایک ایک صراحی اور ایک ایک طشتِ بہشت تھا۔ یہ صراحیاں آبِ کوثر سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ مخدومہ جو میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے جناب سیدہؑ کو اپنے مبارک ہاتھوں پر اٹھا کر آبِ کوثر سے غسل دیا جو حورانِ جناں فردوسِ معلّی سے اسی واسطے لائی تھیں۔ ان ہی معظمہ نے دو سفید جامے جن کی سفیدی دودھ سے زیادہ سفید تھی اور جس کی خوشبو مشک و عنبر سے زیادہ لطیف تھی، نکالے۔ ایک کو آپؑ کے جسمِ مطہر پر لپیٹا اور دوسرے کو چہرۂ اقدس پر (مقنع) اوڑھنی بنایا۔ پھر جناب سیدہؑ سے مخاطب ہو کر باتیں کیں۔ جناب سیدہ نے بہ زبانِ فصیح ارشاد فرمایا: ''میں گواہی دیتی ہوں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کوئی معبود نہیں ہے اور میرے پدرِ عالی مقام اس کے رسول اور سب رسولوں کے سردار ہیں۔ میرے شوہر تمام اوصیاء کے سردار اور میرے بیٹے جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔'' یہ فرما کر اس صدیقۂ کبریٰ نے ان چاروں مخدراتِ عظمیٰ کو سلام کیا۔ ان چاروں نے خوش ہو ہو کر آپؑ کے سلام کا جواب دیا اور دیدہ بوسی فرمائی۔ حوران جنت اس قدرتی منظر کو دیکھ کر بے حد بشاش و مسرور ہوئیں اور ایک دوسرے نے آپس میں جناب خاتونِ جنت علیہا التحیۃ والثنا کی تقریب ولادت کا اعلان کیا۔ اس طرح اہلِ فلک نے ایک دوسرے کے ساتھ مراسمِ تہنیت ادا کیے۔

کسی بھی بچہ یا بچی کی ولادت کے بعد اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنی بچی کا نام فاطمہؑ رکھا۔ فاطمہ فطم کے مصدر سے اسمِ صفت ہے اور فطم عربی لغت میں کاٹنے، وضع کرنے اور جدا ہونے کے معنوں میں آیا ہے۔ یہاں پر معنی کٹا ہوا اور جدا شدہ ہیں۔ فاطمہؑ کس چیز سے علیحدہ اور جدا ہیں؟ اس سلسلے میں جناب رسالت مآب کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں نے اپنی بیٹی کا نام فاطمہؑ رکھا ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے اسے اور اس کے شیعیان کو دوزخ کی آگ سے دور رکھا۔" (لہوف)۔ یہ حدیث جناب ابنِ عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ (بحار)۔ ایک اور حدیث میں حضور اکرمؐ نے فرمایا: "میں نے فاطمہؑ کا نام فاطمہؑ اس لیے رکھا کہ وہ دنیا کی لذت سے دور ہیں اور ان کے پورے وجود میں رنگ الٰہی ہے۔" (ریاحین الشریعہ)

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی پرورش نبوت کے گھر میں اپنے باپ رسول اللہ کی آغوش میں ہوئی۔ وہ اس گھر میں پروان چڑھیں جو فرشتوں کی آماجگاہ اور مرکز نزولِ وحی و آیاتِ قرآن تھا۔ وہ جگہ جہاں مسلمانوں کا اولین گروہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لایا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا۔ ان کے دلوں کو اللہ نے آزمایا اور قرآن میں ان کی مدح فرمائی۔ دین کی تعلیم و تربیت حضرت زہراؑ نے حضرت محمدؐ جیسے معلم سے حاصل فرمائی، جو معلمِ انسانیت تھے۔ جب تک دین باقی ہے، دین و دانش کا چراغ آپؐ کے دم سے روشن و تابندہ رہے گا۔

حضرت فاطمہؑ امام خمینیؒ کی نظر میں:

☆ جس طرح وہ بی بی بے نظیر تھیں ہم سب کو ان کی سیرت پر عمل کرنا چاہیے اور تمام دستور اسلامی ان اور ان کی اولاد کے وسیلے سے حاصل کرنے چاہیے۔ (صحیفۂ امام)۔

مآخذ

۱۔ "سیرۃ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا" خان بہادر مولوی سید اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی۔

۲۔ "فاطمہ زہراؑ، اسلام کی مثالی خاتون" مولف آیت اللہ ابراہیم امینی، مترجم حجۃ الاسلام اختر عباس صاحب۔

۳۔ "سیرت فاطمہ سلام اللہ علیہا" مولف: اسد اللہ محمدی نیا۔ مترجم جناب سید ظفر حسین نقوی۔

۴۔ "حیات فاطمہ (س)" تالیف: ڈاکٹر سید جعفر شہیدی، مترجم جناب سید حسنین گردیزی۔

''جنابِ فاطمہؑ اور تربیتِ اولاد''

جناب فاطمہ زہراؑ کی اولادیں:

جناب فاطمہ زہراؑ کی کل پانچ اولادیں تھیں۔ تین فرزند اور دو صاحب زادیاں۔ اولادوں میں سب سے بڑے حضرت امام حسنؑ تھے۔ اسی بنا پر مولائے کائنات، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی کنیت ''ابوالحسن'' تھی۔ حضرت امام حسنؑ کی ولادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کے بعد جناب زینب کبریٰ اور ان کے بعد جناب ام کلثوم سلام اللہ علیہا دنیا میں تشریف لائیں۔ ان کے بعد حضرت محسنؑ شکم مادر میں شہید ہوگئے۔ ان کا نام جناب رسالت مآبؐ اپنی زندگی میں ہی رکھ گئے تھے۔

جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اولاد رسول کہلائیں۔ جناب رسالت مآبؐ کی نسل جناب فاطمہؑ کی اولادوں سے ہی پھیلی۔ قرآن مجید کی آیۂ مباہلہ (سورۂ آل عمران، آیت ۶۱) اور سورۂ کوثر (سورہ ۱۰۸) سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

جناب فاطمہؑ کے دونوں بیٹوں، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کے بارے میں جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ یہ دونوں جوانان جنت کے سردار ہیں اور یہ دونوں (اپنے اپنے وقت کے) امام ہیں، خواہ بیٹھے رہیں خواہ کھڑے رہیں۔

ولادت حضرت امام حسن علیہ السلام:

سبطِ اکبر حضرت امام حسن علیہ السلام کی ولادت باسعادت ۱۵ رمضان المبارک سن ۳

ہجری مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپؑ اولاد فاطمہؑ میں سب سے بڑے تھے۔ پیدائش کے بعد جب آپؑ کو حضور اکرمؐ کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے ان کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی۔ اس کے بعد فرمایا کہ جبرئیلؑ میرے پاس آئے تھے، انہوں نے کہا کہ چونکہ حضرت علیؑ کو تم سے وہی نسبت ہے جو جناب ہارونؑ کو جناب موسیٰؑ سے تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس فرزند کا نام انہیں کے فرزند کے نام پر شبرؑ رکھو اور عربی میں حسنؑ کہو جو شبرؑ کے ہم معنی ہے۔ اس طرح ان کا نام شبرؑ اور حسنؑ رکھا گیا۔

اہلِ سنت کے مشہور عالم جناب شیخ سلیمان قندوزی الحنفی نے اپنی کتاب ینابیع المودۃ میں حضرت امام حسنؑ کے بارے میں لکھا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کو لازم ہے کہ حسنؑ ابنِ علیؑ سے بھی محبت رکھے۔ مزید فرمایا کہ جو شخص حاضر ہے اس کو چاہیے کہ میرا یہ حکم ان لوگوں تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ ایک اور عالم اہلِ سنت علامہ ابن سعد کاتب الواقدی نے اپنی طبقات میں اہل بیت علیہم السلام کے فضائل کے سلسلے میں لکھا ہے کہ عمران ابن سلیمان نے بیان کیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ حسنؑ اور حسینؑ کے نام اہل جنت کے ناموں میں سے ہیں اور عرب میں قبل اسلام یہ نام کسی نے نہیں رکھے۔

ولادت حضرت امام حسین علیہ السلام:

عالم اہل سنت جناب شیخ سلیمان قندوزی الحنفی نے اپنی کتاب ''ینابیع المودۃ'' میں حضرت امام حسینؑ کے بارے میں لکھا ہے کہ ہجرت نبویؐ کے چوتھے سال ماہ شعبان کی تیسری تاریخ میں حضرت امام حسینؑ پیدا ہوئے۔ جناب رسالت مآبؐ نے ان کے بھی داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی۔ حضرت امام حسنؑ کی طرح ان کا نام بھی جناب ہارونؑ کے دوسرے فرزند کا نام پر اللہ کے حکم سے شبیرؑ اور اس کا عربی ہم معنی نام

حسینؑ رکھا گیا۔ ایک اور عالم اہلِ سنت محمد ابن خاوند شاہ نے اپنی کتاب روضۃ الصفا میں بسلسلہ حال امام حسینؑ لکھا ہے کہ اسماء بنت عمیسؓ ناقل ہیں کہ جب آنحضرتؐ حضرت امام حسینؑ کے کانوں میں اقامت کہہ چکے تو رونے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ تو خوشی کا موقعہ ہے، آپ گریہ کیوں فرماتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس مولود کے حال پر روتا ہوں کہ میرے بعد اس کو میری امت کے اشقیا نہایت ظلم و ستم کے ساتھ شہید کریں گے۔ وہ ملاعین میری شفاعت سے محروم رہیں گے۔

مذکورہ دونوں کتابوں (''ینابیع المودۃ'' اور ''روضۃ الصفا'') میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن جناب رسالت مآبؐ حضرت امام حسینؑ کو اپنے داہنے زانو پر اور اپنے صلبی فرزند حضرت ابراہیمؑ کو بائیں زانو پر بٹھائے دونوں کو پیار کر رہے تھے۔ ایسے میں جناب جبرئیلؑ نازل ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ بعد از درود و سلام فرماتا ہے کہ میری مصلحت نہیں ہے کہ یہ دونوں صاحب زادے زندہ رہیں۔ آپؐ ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کیجیے اور دوسرے سے ہاتھ اٹھا لیجیے۔ یہ سن کر آپ نے حضرت امام حسینؑ کو اختیار فرمایا اور اپنے صلبی فرزند حضرت ابراہیمؑ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد جناب ابراہیمؑ انتقال فرما گئے۔ اس کے بعد حضورؐ کا یہ طریقہ تھا کہ جب حضرت امام حسینؑ کو آتے دیکھتے تو فرماتے:

''آ اے میرے وہ بیٹے جس پر میں نے اپنے صلبی بیٹے ابراہیمؑ کو نثار کر دیا۔''

جناب شیخ سلیمان قندوزی الحنفی نے ''ینابیع المودۃ'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک روز جناب رسالت مآبؐ، اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے مکان سے نکل کر جناب فاطمہؑ کے دروازے کے سامنے سے گزرے۔ آپؐ نے وہاں حضرت امام حسینؑ کے رونے کی آواز سنی تو فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور بیٹی سے فرمایا اے میری لختِ جگر تم جانتی ہو مجھے حسینؑ کے رونے کی آواز سے تکلیف ہوتی ہے۔ حسینؑ کو جلد خاموش کرو۔

عالمِ اہلِ سنت جناب شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی کتاب "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں کہ ترمذی اور عبداللہ ابن احمد نے زوائد المسند میں سادات اشراف سے سلسلہ وار یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے جناب حسنؑ اور جناب حسینؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جو شخص مجھ سے، ان دونوں سے اور ان دونوں کے ماں باپ سے محبت رکھے گا وہ بروز قیامت میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا۔

ولادت جناب زینب سلام اللہ علیہا:

جناب زینب سلام اللہ علیہا سن ۵ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئیں۔ جب آپ دنیا میں تشریف لائیں تو اس وقت جناب رسالت مآبؐ مدینہ منورہ میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ تین روز بعد جب آپ تشریف لائے تو حسب معمول سب سے پہلے جناب فاطمہ زہراؑ کے یہاں تشریف لائے۔ حضرت علیؑ نے انہیں بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری دی اور نام تجویز کرنے کی استدعا کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگرچہ فاطمہؑ کی اولاد میری اولاد ہے لیکن میں اللہ پر سبقت نہیں کرسکتا۔ اتنے میں جناب جبرئیل امین نازل ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ بعد تحفہ درود و سلام کے فرماتا ہے کہ آپؐ اس دختر کا نام زینبؑ رکھیے۔ اس کے بعد آپؐ نے دیکھا کہ جناب جبرئیلؑ کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضورؐ نے اس کا سبب پوچھا تو جناب جبرئیل نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ آپ کی دختر تمام عمر مصائب میں مبتلا رہے گی۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے گریہ فرمایا۔ اس کے بعد حضرتؐ خاتون جنت کے پاس تشریف لائے، جناب زینبؑ کو آپ کی گود میں دیا۔ پھر فرمایا اس بچی کا نام زینبؑ ہے۔ اپنی امت کے ہر حاضر غائب کو وصیت کرتا ہوں کہ میری اس دختر کا پاس و لحاظ رکھیں۔ میری یہ بچی جناب خدیجۃ الکبریٰ سے بہت مشابہ ہے۔ یہ کہہ کر حضور اکرمؐ پھر رونے لگے۔ جناب سیدہؑ نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ اے میری پارۂ جگر اس دختر پر بڑے ظلم کیے جائیں

گے۔ یہ سب جفائیں میری امت نابکار کے ہاتھوں ہی ہوں گی۔ جناب سیدہؑ بھی یہ سن کر رونے لگیں اور پوچھا کہ اے بابا جان اس دختر کے مصائب پر رونے کا کیا ثواب ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے قرۃ العین اس کے مصائب پر رونے کا وہی ثواب ہے جو اس کے بھائیوں کی مصیبت پر رونے کا ثواب ہے۔

ولادت حضرت ام کلثوم سلام اللہ علیہا:

جناب زینبؑ کے بعد جناب ام کلثوم کی ولادت ہوئی۔ یہ بھی اپنی بہن کی طرح ماں، باپ، بہن اور بھائیوں کی آنکھ کا تارا بنی رہیں۔ ان کی شادی اپنے عم زاد جناب محمد بن جعفر طیار سے ہوئی تھی۔ واقعہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ اور جناب زینبؑ کے دوش بدوش کلمۂ حق کا پرچار اور باطل کی نفی کرتی رہیں۔ دربار یزید اور بازار کوفہ میں بہن کی طرح خطبات سے لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کرتی رہیں۔

حسن تربیت:

"درجہ بدرجہ، ترتیب و تنظیم کے ساتھ کسی فرد یا جماعت کو اس کی طاقت، ضرورت، احتیاج اور استعداد و صلاحیت کے لحاظ سے رشد و کمال کی منزل تک پہنچانے کا نام تربیت ہے۔"

تربیت دو اقسام کی ہوتی ہے، ایک جسمانی دوسری ذہنی۔ والدین یا سرپرستوں کو بچے کی جسمانی تربیت کے ساتھ ذہنی تربیت بھی دینی چاہیے، تاکہ وہ نہ صرف جسمانی طور پر مضبوط اور توانا ہو بلکہ ذہنی طور پر بھی اچھا اور پسندیدہ انسان بنے۔ قرآن مجید کے ۱۹ ویں سورے مریم کی آیات ۵ اور ۶ میں حضرت ذکریاؑ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: "تو مجھے اپنے فضل و کرم سے ایک جانشین عطا کر دے جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوبؑ کا ورثہ بھی اسے ملے اور میرے پالنے والے تو اس کو ایک پسندیدہ انسان بنانا۔"

جنابِ رسالت مآبؐ کا ارشادِ گرامی ہے: ''ہر بچہ فطرت کے طریقے پر پیدا ہوتا ہے، یہ ماں باپ ہیں جو اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔'' (سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۳۸۲)

ایک اور حدیث میں وارد ہوا: ''اللہ کی رحمت ان ماں باپ کے شاملِ حال رہے جو اولاد کو اس ڈھنگ کی تربیت دیں جس سے وہ اپنے والدین کے لیے اچھا رویہ اپنانے میں مدد حاصل کرسکیں۔'' (فروعِ کافی، جلد ۶، ص ۴۸، مستدرک، جلد ۲، ص ۳۵)

جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا: ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔''

اس ضمن میں مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: ''کسی باپ کا اپنے بیٹے کے لیے حسنِ تربیت اور کمال ادب سے بہتر اور کوئی عطیہ نہیں۔''

(مستدرک الوسائل، جلد ۲، ص ۶۲۵)

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ''آباء و اجداد کا اپنے فرزندوں کے لیے سب سے اچھا ورثہ، مال و دولت نہیں، تہذیب و تربیت ہے۔ کیونکہ مال جانے والی چیز ہے اور ادب و تہذیب کو زوال نہیں۔'' (روضۂ کافی جلد ۸، ص ۱۵۰، طبع تہران)

باپ کی، شوہر کی خدمت، تربیت اولاد کی
فاطمہؑ کا ہر عمل قرآن کی تفسیر ہے

تربیتِ اولاد کے حوالے سے شہزادی کونین سلام اللہ علیہا کے عمل پر نظر کرتے ہیں:

عید کے کپڑے:

حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کے لباس پرانے اور بوسیدہ ہو چکے تھے۔ جب عید قریب آئی تو انہوں نے جناب فاطمہؑ سے کہا: ''اماں جان! ہمسایوں کے بچوں کے عمدہ لباس تیار ہو رہے ہیں، کیا آپ ہمارے لیے عید کے نئے کپڑے نہیں بنائیں گی؟''

جناب فاطمہؑ نے فرمایا: ''ان شاء اللہ، آپ کے بھی کپڑے سل جائیں گے۔'' جب

عید کا دن آیا تو جبریلِ امین جنت کے کپڑوں میں سے دو جوڑے لے کر جناب رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آنحضرتؐ نے پوچھا: ''یہ لباس کیسے ہیں؟''

جناب جبرئیلؑ نے عرض کی: ''یارسول اللہ! حضرات حسنینؑ نے اپنی ماں سے نئے کپڑوں کے لیے کہا۔ جناب فاطمہؑ نے کہا کہ ان کے لیے نئے لباس سل رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں کہ جناب فاطمہؑ کا وعدہ غلط ہو جائے۔ اس لیے میں یہ لباس لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

کس کا خط اچھا ہے!

ایک دن حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے تختیاں لکھیں۔ دونوں بھائیوں میں بات ہونے لگی کہ کس کا خط اچھا ہے۔ دونوں شہزادے اپنی والدہ ماجدہ جناب سیدہؑ کے پاس گئے کہ آپ فیصلہ فرمائیں کہ کس کا خط اچھا ہے۔

جناب فاطمہؑ نے کسی کے حق میں فیصلہ نہ دیا۔ وہ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے فرمایا: ''اپنے بابا جان کے پاس جاؤ، وہ آپ کا فیصلہ کریں گے۔'' شہزادے حضرت علیؑ کے پاس آئے اور کہا: ''بابا جان! ہمارا فیصلہ کریں کہ کس کا خط زیادہ اچھا ہے۔'' انہوں نے بھی کسی کے حق میں فیصلہ نہ دیا تاکہ کوئی رنجیدہ خاطر نہ ہو۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: ''میرے نورِ نظر! آپ لوگ اپنے نانا بزرگوار کے پاس جایئے۔'' یہ لوگ حضور اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے اور مدعا بیان کیا۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا: ''آپ کے درمیان فیصلہ جناب جبرئیل امین کریں گے۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا کہ ان کا فیصلہ حضرت اسرافیل کریں گے۔ حضرت اسرافیل نے کہا، ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ حکمِ الٰہی ہوا کہ ان کے درمیان فیصلہ ان کی والدہ فاطمہؑ کریں گی۔

پھر جناب فاطمہؑ نے فرمایا: ''اے میرے جگر پارو! میرے پاس ایک ہار ہے۔ میں

اسے توڑتی ہوں۔تم دونوں اس ہار کے دانے چنو۔جس کے ہاتھ زیادہ دانے آئیں گے اس کا خط زیادہ اچھا مانا جائے گا۔"

یہ کہہ کر جناب سیدہؑ نے اپنا ہار توڑ دیا۔موتی زمین پر بکھر گئے۔تین موتی حضرت امام حسنؑ نے اور تین ہی حضرت امام حسینؑ نے اٹھائے۔ایک موتی باقی رہ گیا۔اسے اٹھانے کے لیے دونوں بھائی آگے بڑھے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے جناب جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ فوراً زمین پر جائے اور اس موتی کو دو حصوں میں تقسیم کر دے تا کہ ان دونوں میں سے کسی کا دل نہ ٹوٹے۔

چنانچہ جناب جبرئیلؑ امین آئے اور موتی کے دو حصے کر دیے۔دونوں بھائیوں نے آدھا آدھا حصہ اٹھا لیا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے تاریخ کا دامن بھرا ہوا ہے۔مندرجہ بالا واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزمرہ کی باتوں سے بچوں کی کس طرح تربیت کی جاتی ہے۔دونوں واقعات میں بچوں کی معصومیت، ماں کی اہمیت، ماں کے فیصلے پر اطمینان اور پھر اس اطاعت اور صبر کے نتیجے میں اللہ کا انعام دکھائی دیتا ہے۔

جناب زکریاؑ کی دعا، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا سے معلوم ہوا کہ دعا صرف اولاد کے ہونے کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے نیک اور صالح ہونے کے لیے بھی کی جانی چاہیے۔
صاحب اولاد ہونے کے بعد صرف بچے کی غذا، لباس اور مکان ہی کی نہیں بلکہ اس کی ذہنی اور فکری تربیت کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔اگر اولاد کی تربیت صحیح خطوط پر کی گئی تو یہ ایک صدقہ جاریہ ہو گا۔ایسی اولاد اپنی اولاد کو بھی اچھی تعلیم و تربیت کرے گی اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہے گا اور اس نیک عمل کا ثواب سب کو ملتا رہے گا۔

ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں جناب سیدہؑ نے تربیت کے زریں اصول ... کر دیے۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا اصول تھا کہ دونوں شہزادوں کو نماز کے اوقات میں مسجد روانہ کر دیتیں اور تاکید کرتیں کہ جو کچھ وہاں اپنے نانا سے سنو وہ سب گھر آ کر بیان کیا کرو۔ چنانچہ دونوں بھائی جو کچھ نانا سے سنتے گھر آ کر جناب سیدہؑ سے ڈسکس کرتے۔ اس عمل میں بہنیں اور گھر کے دیگر افراد بھی شامل ہو جاتے۔

تربیت کی اہمیت کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ اور معصومین علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں شہزادی کونینؑ جو سیدۃ النساء العالمین ہیں کے طرز تربیت کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی کا عمل اتنا بلند نہیں ہو سکتا جتنا ان کا ہے۔ کیونکہ یہ جزو رسالت ہیں (فاطمۃ بضعت منی، حدیث صحیح بخاری) ان کا ہر عمل قیامت تک تمام مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ مردوں کے لیے سیرت پیغمبرؐ پر عمل پیرا ہونا اور خواتین کے لیے سیرت جناب فاطمہؑ پر عمل پیرا ہونا دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے بچوں کی ایسی تربیت کی کہ ان کی تمام اولاد تمام انسانوں کے لیے نمونہ عمل بن گئی۔ تربیت میں عورت کا کردار زیادہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ "پہلا مکتب ماں کی گود" بچہ جو کچھ گھر میں سیکھتا ہے وہی باہر جا کر کرتا ہے۔

شہزادیؑ نے بچپن میں ماں سے جدائی کا صدمہ سہا۔ اعلان نبوت پر کفار مکہ کے مظالم جھیلے۔ شعب ابوطالبؑ میں مقاطعہ کی تکالیف برداشت کیں۔ چند سال جو حضورؐ کے ہجرت مدینہ کے بعد میسر ہوئے بس وہی کچھ غنیمت تھے۔ اس میں بھی باپ کے مشن کو آگے بڑھانا یعنی خواتین مدینہ کی تدریس کرنا، ساتھ ہی شوہر کی خدمت اور پھر آنے والے دور میں بچوں کو ثابت قدم رکھنے کی تعلیم و تربیت کرنا پیش نظر رہے۔

دونوں بیٹوں نے اپنے اپنے دور امامت میں دنیا کے سامنے وہ مثالیں پیش کیں جو دنیا کے سامنے ضرب المثل بن گئیں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کے دور میں ملوکیت نے

سر اٹھایا۔ تخت وتاج کا کنسپٹ نہ حضورؐ نے اپنایا نہ خلفاء نے۔ امیر شام نے مختلف حربے اختیار کر کے اسلام کو شدید زک پہنچائی۔ مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑوایا۔ ملوکیت کی بنیاد رکھی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے حلم سے کام لیا اور ایک باعزت صلح نامے کے ذریعہ فتنہ کو ختم کیا۔ یہ سب نانا کی، باپ کی اور ماں کی تربیت کا اثر تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے دور امامت میں بھی حکومت شام ایک الگ نظریہ کا پرچار کرتی رہی۔ اسلام کے لبادے میں ملوکیت جڑ پکڑتی رہی۔ چونکہ اس حکومت نے اپنے آپ کو امام حسینؑ سے براہ راست ٹکرانے کی کوشش نہیں کی اس لیے امامؑ نے بھی اس سے صرف نظر کیا۔ جب صلح نامۂ حسنؑ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یزید جیسے شخص کو حاکم شام بنا دیا گیا تو امام حسینؑ نے بڑھ کر اسے اس اقدام سے روکا اور بیعت طلب کیے جانے پر صاف صاف کہہ دیا کہ ''مجھ (حسینؑ) جیسا اس (یزید) جیسے سے کبھی بیعت نہیں کر سکتا۔''

اعلیٰ تربیت کا یہ نمونہ ہمیں جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ کی زندگیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ بعد شہادت حضرت امام حسینؑ، ان شہزادیوں نے جس طرح بھائیوں، باپ اور نانا کی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس کے پیچھے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ہی تربیت تھی۔

ماخذ

۱۔ ''فاطمہ زہراؑ کی سوانح عمری'' مولف: جناب مظفر علی خاں، شائع کردہ نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد۔

۲۔ ''اصول تربیت'' آیت اللہ علامہ سید ابن حسن نجفی، ناشر: ادارہ تمدن اسلام، کراچی۔

۳۔ ''سوال عوام کے جواب بنتِ رسولِ اسلام کے'' مولف: حجۃ الاسلام علامہ احمد قاضی گلپایگانی۔ ناشر: ادارہ منہاج الصالحین، لاہور۔

۴۔ ''سیرت فاطمہ سلام اللہ علیہا'' مولف: اسد اللہ محمدی نیا۔ مترجم: سید ظفر حسین نقوی۔ ناشر: القائم پبلی کیشنز، کراچی۔

شہزادیؑ کے بابرکت نام

جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کا اسم مطہر "فاطمہ" ہے۔ کنیت اُمّ الحسنین، ام السبطین، مشہورترین اُمّ الائمہ، القاب بتول، العذراء، الزہراء، سیدۃ النساء، افضل النساء، خیر النساء، مریم الکبریٰ، الحوراء الانسیہ، المبارکہ، الطاہرہ، المرضیہ، المحدثہ، اور الصدیقہ ہیں۔

فاطمہؑ:

کی وجہ تسمیہ کے متعلق سید علی ہمدانی "مودۃ القربیٰ" میں فرماتے ہیں: فرمایا جناب رسالت مآبؐ نے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نام فاطمہؑ اس لیے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اور اس کے دوستوں کو آتشِ جہنم سے علیحدہ فرمایا ہے۔ اسی روایت کو صواعق محرقہ میں ابن حجر نے حافظ ابونعیم اور علامہ ابوالقاسم دمشقی کی اسناد سے اور ینابیع المودۃ میں امام قندوزی نے امام دیلمی اور امام طبری کی اسناد سے تحریر کیا ہے۔ نیز علامہ مجلسی نوراللہ مرقدہ نے جلال العیون جلد اول میں جناب امام جعفر صادقؑ کی اسناد سے قلم بند فرمایا ہے۔

حضرت روایت کرتے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے جناب فاطمہؑ سے پوچھا: "اے فاطمہؑ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں فاطمہؑ کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے؟" اس وقت میں (علیؑ) نے عرض کی: "یارسول اللہؐ فاطمہؑ کو فاطمہؑ کیوں کہا گیا؟" حضور نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کی ذریت واولاد کو قیامت کے دن جہنم سے محفوظ کردیا ہے۔"

البتول:

سید علی ہمدانی مودۃ القربیٰ میں لکھتے ہیں: جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ فاطمہؑ کا نام بتولؑ اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ تمام نسوانی نجاستوں سے پاک وصاف تھیں۔ کیونکہ دختران انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم السلام کے لیے یہ عیب ہے۔ اور بعض متون احادیث میں عیب کی جگہ نقصان کا لفظ آیا ہے۔

علامہ قندوزی، ابن حجر، طبری، دیلمی اور علامہ مجلسیؒ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں اس حدیث کو ان ہی الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

یہ لقب حضرت عیسیٰؑ کی مادرِ گرامی جناب مریم بنتِ عمران کے لیے بھی ذکر ہوا ہے۔ محدثین کے اظہارات کی روشنی میں اس پاکیزہ لقب میں پوشیدہ اسرار و معارف اور رموز و مفاہیم کی روحانی حقیقتوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

العذراء

تابندہ اور روشن کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ انتہائی پاکیزگی یعنی تمام نسوانی نجاسات سے منزا۔ تفصیل اس کی الزہراؑ میں بیان کی گئی ہے۔ یہ لقب بھی حضرت مریمؑ کے لیے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی فقہی حوالہ سے بعض موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں جن کی روشنی میں اس مقدس خدائی اعزاز کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔

الزہراؑ:

علامہ مجلسیؒ جلاء العیون میں جناب امام جعفر صادقؑ کی اسناد سے تحریر فرماتے ہیں کہ جناب فاطمہؑ کا نام زہراؑ اس لیے رکھا گیا ہے کہ آپؑ جب محراب عبادت میں کھڑی ہوتی تھیں تو آپؑ کا نور اہلِ آسمان کو روشنی بخشتا تھا، جیسے ستارے اہلِ زمین کو روشنی بخشتے ہیں۔ سالہ خاتون جنت کے مولف لکھتے ہیں کہ کمال حسن کی وجہ سے جناب رسالت مآب آپ کو کثر زہراؑ کے نام سے پکارتے تھے۔ لفظ ''زہرا'' کے لغوی معنی کے متعلق لکھتے ہیں:

زہراؑ، حضرت زبدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ کا لقب ہے جو زُہرہ سے مشتق ہے، جس کے معنی سفیدی، حسن، شگوفہ وغیرہ کے ہیں۔ زُہرہ کا اسم صفت زہرا ہے۔ اس لیے حضرت سیدۃ النساء کا لقب زَہرا (حرف ''زے'' پر زبر) پڑھنا چاہیے۔ پھر تنبیہ کی سرخی سے لکھتے ہیں:
غالباً یہ ظاہر کر دینا ضروری ہوگا کہ آپ کا لقب زہرا کیوں تھا۔ چونکہ عام لوگوں کو اس کی وجہ معلوم نہیں ہے سو واضح ہو کہ جناب سیدہ نسوانی نجاسات سے تمام عمر پاک رہیں اور بچوں کی ولادتوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر قسم کی نجاسات سے دور رکھا۔ آپؑ کی کوئی نماز کبھی فوت نہیں ہوئی۔ زہراؑ کے معنی طاہرہ ہیں، جس کے معنی پاک ہیں۔ مذکورہ وجہ سے آپؑ کو اس لقب سے ملقب کیا گیا۔ جناب سیدہؑ کی پیشانی کے نور سے پورا شہر منور ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بی بیؑ کی جبینِ مقدس میں گیارہ معصوم اماموں کا نور رکھا کہ جسے جناب رسالت مآبؐ بار بار چومتے اور فرماتے تھے کہ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔ اس کا محب میرا محب اور اس کا دشمن میرا دشمن ہے۔ حضرت امام حسن سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری ماں مصلائے عبادت پر کھڑی ہوتی تھیں تو ان کے چہرۂ اقدس سے روشنی پھوٹتی تھی۔

سیدۃ النساء

حافظ دمشقی لکھتے ہیں: ''جناب فاطمہؑ خواتین جنت کی سردار ہیں۔'' سیادت و سرداری کا تعلق سیرت و کردار کی عملی رہنمائی سے ہے، ظاہری حکمرانی سے نہیں اور بی بیؑ کی سیادت کے حوالے سے روایات میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن بی بیؑ شان و شوکت کے ساتھ عرصۂ محشر میں داخل ہوں گی اور جب بی بیؑ کی آمد آمد ہو گی تو اعلان کیا جائے گا کہ اے اہلِ محشر اپنے سروں کو جھکا لو اور اپنی نگاہیں نیچی کر لو کہ فاطمہؑ بنتِ محمدؐ پلِ صراط سے گذر جائیں۔ جب وہ پلِ صراط سے گزریں گی تو ان کے ساتھ ستر ہزار حوریں ہم راہ ہوں گی۔

سیدۃ نساء العالمین:

کائنات کی سب عورتوں کی سردار۔ اس لقب میں نساء کی اضافت عالمین کی طرف

ہے۔جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ کو کائنات کی سب خواتین کی سرداری حاصل ہے،اس سے بھی استغراق وعموم مقصود ہے کہ صنفِ نسواں کی ہر اس میں شامل ہے۔گویا جناب سیدہؑ کائنات ہر دور، ہر علاقہ، ہر قوم کی سردار ہیں کہ ان کے لیے سیدہؑ کا کردار عملی رہنما کی حیثیت رکھتا ہے،خواہ فرائض وحقوق الٰہی کی بابت ہو یا عمومی زندگی کے معمولات و حقوق الناس سے ہو،انفرادی امور سے ہو یا معاشرتی واجتماعی اور ازدواجی زندگی سے مربوط مسائل سے ہو۔یعنی احکام الٰہی کی ادائیگی سے ہو یا لوگوں کے ساتھ معاملات سے ہو، ہر سلسلہ میں سیدہ فاطمہ زہراؑ کی حیات طیبہ کا ہر پہلو خواتین کے لیے نمونۂ عمل اور ان کی سعادت مندو کامیاب زندگی کے لیے مشعل راہ ہے۔

عمران بن حصین سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ جناب فاطمہؑ کی عیادت کو تشریف لے گئے۔استفسار فرمایا:''بیٹی مزاج کیسا ہے؟''شہزادی نے جواب دیا: ''درد کی شدت ہے اور درد کو فاقہ نے اور بڑھا دیا ہے۔گھر میں دانہ نہیں، جو میں کھاؤں۔''حضورؐ نے فرمایا:اے میری پیاری بیٹی!کیا تو یہ سن کر خوش نہ ہوگی کہ تو تمام خواتینِ عالم کی سردار ہے۔''

افضل النساء:

یہ دونوں القاب بھی سیدۃ النساء اہل الجنۃ اور سیدۃ نساء العالمین کی بشارت پر مشتمل ہیں۔اس میں سیدہ کی بجائے افضل کا لفظ ذکر کیا گیا ہے،افضلیت کا اعزاز جس طرح نسب کی بنیاد پر ہے اسی طرح حسب کے حوالے سے ہے۔ جناب زہراؑ دونوں حوالوں سے افضلیت و برتری کی حامل ہیں۔اللہ نے انہیں جو نسبی شرف عطا کیا وہ کائنات میں کسی خاتون کو عطا نہیں کیا۔انہیں جو ماں باپ وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔انہیں جو شوہر اور بیٹے ملے وہ کسی کو نہیں ملے۔انہیں جیسی نسل طیب وطاہر ملی ویسی کسی کو نہیں ملی۔اس نسبی امتیاز کے ساتھ ساتھ حسبی امتیازات میں بھی سیدہؑ کو کائنات کی خواتین پر برتری حاصل ہوئی کہ ان کے خانۂ اقدس میں آیات قرآنیہ اتریں، نبوت ورسالت اور امامت وولایت کے سرتاج

آئے۔ فرشتگان رحمت نے خدمات سرانجام دینے کا شرف پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کے اہل کی طرف سلام بھیجا اور انہیں اپنی خاص عنایات سے نوازا۔

خیر النساء:

خواتین میں سب سے بہتر۔ اللہ نے جناب سیدہؑ کو تمام خواتین پر برتری و بہتری عطا فرمائی۔ یقیناً یہ عظیم اعزاز سیدہ کی ذاتی خصوصیات اور حسبی کمالات کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں و اعزازات کی بنیاد پر خاص عظمت کا حامل ہے۔ امام زمانہؑ جناب سیدہؑ کی نسلِ پاک سے ہیں۔ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مہدیؑ میری بیٹی فاطمہ کی نسل سے ہوگا۔ اللہ نے جناب سیدہؑ کو منبع و مصدر خیر، مرکزِ خیر، محورِ خیر، مظہرِ خیر اور مجسم خیر قرار دیا کہ جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپؑ تمام خواتین سے بہتر و برتر، افضل و اعلیٰ اور ان کے لیے خیر ہیں۔

مریم الکبریٰ:

جناب سید المرسلین کی صاحب زادی اور حضرات ائمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین کی والدہ گرامی ہونے کے شرف مخصوصہ کی وجہ سے حضرت مریمؑ پر آپ کو ترجیح فاضل علی المفضول حاصل ہے۔ حقیقت میں حضرت مریمؑ کے باپ نہ حضرت فاطمہؑ کے باپ کے مقابل ثابت اور نہ ان کی اولاد ان کی اولاد کے مساوی۔

الحوراء الانسیہ:

امام طبری نے جناب جابر انصاریؓ کی اسناد سے ذخائر العقبیٰ میں لکھا ہے: فرمایا جناب رسالت مآبؐ نے کہ میری بیٹی فاطمہؑ ایک حور ہے خلقت بنی آدمؑ میں۔ روض الفائق میں تحریر ہے: ''انس ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ میری بیٹی فاطمہؑ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور فاطمہؑ ایک حور ہے خلقت انسانی میں۔

المبارکہ:

علامہ مجلسی تحریر فرماتے ہیں کہ جناب سیدہؑ تمام صفات علم و کمال اور اکرام و احترام

میں صاحبِ برکت تھیں، اسی وجہ سے آپؑ کو مبارکہ کہا گیا ہے۔

الطاہرہ:

کسی تصریح کا محتاج نہیں۔ بالاتفاق فریقین آیۂ تطہیر کی شانِ نزول میں آپؑ بدرجۂ اولا شریک تھیں۔ اس لیے اس مبارک لقب کے لیے بھی بدرجۂ اولیٰ مستحق ہیں۔ علامہ بدخشی نے نزول الابرار میں اور علامہ مجلسیؒ نے جلاء العیون میں آپؑ کے القاب کی تفصیل میں اس لقب کو بھی داخل کیا ہے۔

الراضیہ اور المرضیہ:

اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو جانے والی۔ جناب سیدہؑ سچی و مخلص عبادت گزار تھیں۔ سیرت محمدی کا خالص پر تو تھیں۔ آپؑ نے اپنے عمل سے اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا درس دیا۔ اللہ پر بھروسہ، اس کی رضا کی جستجو اور اس کی رضا پر قائم رہنے کی عملی تصویر بن کر دکھا دیا۔

نزل الابرار اور جلاء العیون میں یہ لقب بھی مندرج ہے اور رسالۂ خاتون جنت کے مولف نے بھی اس کو نزل الابرار سے نقل کیا ہے۔

المحدثہ:

علامہ بدخشی نے نزل الابرار میں اس کو لکھا ہے مگر کوئی توجیہ نہیں کی ہے۔ ممکن ہے کہ جب آپؑ شکمِ مادر میں تھیں تو اپنی والدۂ ماجدہ جناب خدیجہؑ سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ چنانچہ ماں کو حزن و ملال میں تسکین و تشفی دینے کے سبب آپؑ کو محدثہ کہا گیا ہو۔ علامہ مجلسیؒ اپنی کتاب "جلاء العیون میں فرماتے ہیں: "فرشتے شہزادیؑ سے باتیں کیا کرتے تھے۔" جناب امام محمد باقرؑ کی اسناد سے منقول ہے کہ جب جناب سیدہؑ پیدا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو بھیجا جس نے جناب رسالت مآبؐ کی زبان پر جاری کیا کہ جناب سیدہؑ کا نام فاطمہؑ رکھا گیا ہے۔ اللہ نے اس فرشتہ کے ذریعہ شہزادیؑ سے فرمایا: "اے فاطمہ تم کو جہل سے سوئے علم، میں نے علیحدہ کیا اور تم کو ہر طرح کی نجاسات سے بری رکھا۔"

الصدیقہ:

علامہ بدخشی نے نزل الابرار میں اور ان سے مولفِ رسالۂ خاتون جنت نے نقل کیا ہے اور علمائے اہلِ بیت طاہرین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس لقب کو آپؑ کے القاب مخصوصہ میں اس خصوصیت کے ساتھ شمار کیا ہے کہ پھر آپ کے مقابلے میں کوئی دوسرا اس کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۶۱ کے مطابق اللہ نے حکم دیا کہ نصاریٰ علم آ جانے کے باوجود جب حضورؐ کی بات نہیں مانتے تو اتمام حجت کے لیے ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفوس کو لے کر آئیں اور بددعا کریں۔ اللہ جھوٹوں پر لعنت کرتا ہے۔ اس موقع پر حضورؐ "نسائنا" (عورتوں) کی بجائے صرف جناب سیدہؑ کو لے کر گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بی بی عالمین کی صدیقہ خواتین کی واحد نمائندہ تھیں۔ اور ہوا بھی یہی، بنی نجران کے عیسائی جناب پنجتنؑ پاک کو دیکھ کر گھبرا گئے اور مباہلہ سے دست بردار ہو گئے۔ وہ لوگ کئی دن سے حضور اکرمؐ، جناب امیرؑ، اور حضرات حسنینؑ کو دیکھ رہے تھے۔ اب جو ان کے ساتھ شہزادی کونینؑ کو دیکھا تو بوکھلا گئے۔ یہ بی بی کی صداقت کی سند ہے کہ عالمین کے اولین و آخرین میں ان سے بڑی کوئی صدیقہ نہیں ہے۔ مباہلہ میں شہزادیؑ کا جانا ثابت کرتا ہے کہ وہ صدیقۂ کونینؑ ہیں۔

اُمّ اَبِیْھَا:

شہزادیٔ کونینؑ کے بارے میں حضور سرورِ کائنات کا فرمان ہے: "اُمّ اَبِیْھَا" (فاطمہؑ تو (گویا) اپنے باپ کی ماں ہے۔"

حضور اکرمؐ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ النجم کی ابتدائی آیات میں ارشاد فرمایا: "میرا نبیؐ اپنی خواہش نفس سے گفتگو نہیں کرتا بلکہ یہ تو بس وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔" اس آیت سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ نبی جب گفتگو کرتا ہے تو زبان اس کی ہوتی ہے لیکن فرمان ربِ اکبر کا ہوتا ہے۔ نبی جب بھی بات کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے احکامات دنیا تک پہونچائے گا۔ جب کسی کے مرتبے اور منزلت کی نشان دہی کرے گا تو وہ

نہ تو مبالغہ آرائی کرے گا نہ کوئی خلاف حقیقت بات کہے گا۔ وہ جو بھی کہے گا حق و حقیقت پر مبنی ہوگا۔

چنانچہ حضور اکرم کا یہ فرمانا کہ "فاطمہؑ اپنے باپ کی ماں ہے۔" یہ میرے نزدیک اسی طرح محترم ہے جس طرح کوئی ماں اپنی اولاد کے لیے۔ یہ فضیلت ایسی ہے جو اولین و آخرین میں جناب سیدہؑ کے علاوہ کسی عورت کو نصیب نہیں ہوئی۔ حضورؐ کے علاوہ کسی بھی باپ نے یہ نہیں کہا کہ اس کی بیٹی اس کی ماں ہے۔

یہ باپ بھی کون ہے؟ انبیا علیہم السلام کا سرور و سردار، مرسلین کا پیشوا، باعثِ تخلیق کائنات، فخر موجودات، سرورِ دو جہاں، رحمت اللعالمین، شفیع المذنبین، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لولاک لما خلقت الافلاک۔"

جناب سیدہ کو حضورؐ نے "اُمّ اَبِیھَا" کیوں کہا، اس موضوع پر آیت اللہ حسن رضا غدیری قبلہ کی کتاب "فاطمہؑ اپنے باپ کی ماں" سے استفادہ کیا جائے، جس میں انہوں نے تفصیل سے اس عنوان کی تشریح کی ہے۔ ہم اس کتاب (صفحہ ۱۰۸) سے، شکریہ کے ساتھ صرف ایک پیراگراف نقل کرتے ہیں:

اصل اور اصل الاصل:

"سیدۂ کائنات سلام اللہ علیہا کو خاتم الانبیاءؐ نے اپنی "ماں" کے الفاظ کی بجائے "اُمّ اَبِیھَا" (اپنے باپ کی ماں) کے الفاظ سے موسوم فرمایا ہے۔ اس لطیف انداز بیان میں جو اہم ترین نکتہ ملحوظ ہے وہ یہ کہ اس میں شخص کی بجائے شخصیت سے نسبت کا اظہار مقصود ہے۔ عمومی و نسبی نسبتی حوالہ میں عام طور پر اس طرح کے اظہارات بالعکس معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی باپ کو اولاد کی "اصل" کہا جاتا ہے جو کہ ظاہری وجود کے حوالے سے یقیناً درست ہے۔ اگر حضورؐ اس نسبی قرابت کو بیان کرنا چاہتے تو یوں ارشاد فرماتے کہ "انا اصلہا" میں اس کی "اصل" ہوں۔ یا یوں ارشاد فرماتے کہ "میں اصل ہوں اور فاطمہؑ درخت ہیں۔"

(انا اصل وفاطمۃ شجرۃ)۔ کیونکہ درخت سے پھل حاصل ہوتا ہے اور اولاد کا سلسلہ بیٹے یا بیٹی سے چلتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ سیدۂ کائنات کو اصل اور جڑ اور خود اپنے آپ کو درخت کہہ کر آنحضرتؐ نے دنیا والوں کے ظاہری وجودی حوالوں اور نسبتوں کے معیار سے بالاتر ہو کر اپنے اور سیدۂ کائنات کے وجودی نورانی معیار کی امتیازی جہت کو بیان فرمایا ہے جو ان ہی ہستیوں کا خاصہ ہے۔ اگر ہم اس حوالہ سے فرمان نبویؐ کی تفسیر و توضیح میں یہ کہیں کہ آنحضرتؐ کا اشارہ اس حقیقت کی طرف ہو سکتا ہے کہ چونکہ ماں، اولاد کی نسبت وجودی مصدریت اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا ذریت و نسل رسول اللہؐ کی وجودی مصدریت و سرچشمہ ہیں لہٰذا آنحضرتؐ نے انہیں اپنے باپ کی ماں کا لقب عطا فرمایا جو کہ اصل اور مصدریت کی حقیقت کا حامل جامع و مانع لفظ ہے۔ ورنہ یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ حضورؐ کی ذات گرامی قدر، سیدۂ کائنات کا وجودی، ظہوری، ذاتی وصفاتی سرچشمہ اور حقیقی مصدریت کا پاکیزہ عنوان ہے۔ سیدہؑ کا وجود اصل ہے اور حضورؐ کا وجود اصل الاصل ہے۔"

جناب سیدہؑ کے اور بہت سے نام اور القابات ہیں۔ مضمون طویل نہ ہو جائے اس غرض سے ہم نے شہزادیؑ کے صرف چند القابات کا انتخاب کیا ہے۔

مآخذ

(۱) "سیرۃ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا" از خان بہادر مولوی سید اولاد حیدر فوق بلگرامی مرحوم۔

(۲) "صحیفۃ الزہراؑ" از علامہ السید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ۔

(۳) "فاطمہؑ، اپنے باپ کی ماں" از آیت اللہ حسن رضا غدیری قبلہ۔

سبطِ اکبر حضرت امام حسن علیہ السلام

حضرات حسنینؑ کی سیادت، سرداری، سربراہی یا امامت کے لیے ختمی مرتبت، حضور اکرم، حضرت محمد مصطفیٰؐ کی یہ حدیث سند ہے، جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اَلْحَسَنُ و اَلْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اھلِ الجَنَّۃ"

نام و نسب:

اسمِ مبارک: (شبّر) حسنؑ، کنیت ابو محمد، مشہور لقب مجتبیٰ، آپؑ کے پدرِ بزرگوار، حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ بن عبدالمطلبؑ اور والدۂ ماجدہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ بنتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابن عبداللہؑ بن عبدالمطلبؑ تھیں۔ کائنات عالم میں نسب کے اعتبار سے آپؑ اور آپؑ کے بہن بھائیوں سے زیادہ نجیب الطرفین کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔

ولادت باسعادت:

حضرت امام حسنؑ ۱۵ رمضان المبارک، ۳ ہجری کو مدینۂ منورہ میں پیدا ہوئے۔ مشکوٰۃ شریف میں لکھا ہے امّ الفضلؓ بنت الحارث زوجہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؑ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے، جس کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا، چچی جان وہ خواب کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، میں نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہو کر میری گود

میں آگرا ہے۔ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا: ''یہ خواب بہت نیک ہے، عن قریب میری فاطمہؓ کے ہاں فرزند پیدا ہوگا۔ جسے آپ اپنی گود میں پرورش کریں گے۔'' جناب ام الفضل ؓ کا بیان ہے کہ کچھ دن بعد ایسا ہی ہوا۔

''حضرت ابورافعؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی اکرمؐ کو دیکھا کہ آپ نے سیدہ فاطمہؓ کے ہاں حسنؓ بن علیؓ کی ولادت ہونے پر ان کے کانوں میں نماز والی اذان دی۔'' (اس حدیث کو امام ترمذی، ابوداؤد اور احمد نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے)۔

''حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے حسنین کریمینؓ کی طرف سے بطور عقیقہ ایک ایک دنبہ ذبح کیا۔'' (اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا اور انہوں نے ایک ایک کی بجائے دو دو دنبہ ذبح کرنا روایت کیا ہے)۔

''حضرت علیؓ بیان فرماتے ہیں کہ جب حضرت فاطمہؓ کے ہاں حضرت حسنؓ پیدا ہوئے تو انہوں نے ان کا نام حمزہ رکھا اور جب حضرت حسینؓ پیدا ہوئے تو ان کا نام ان کے چچا کے نام پر جعفر رکھا۔ (حضرت علیؓ فرماتے ہیں) مجھے حضور نبی اکرمؐ نے بلا کر فرمایا: مجھے ان کے یہ نام تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (حضرت علیؓ فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ پس آپؐ نے ان کے نام حسنؓ و حسینؓ رکھے۔'' (اس حدیث کو امام احمد، ابو یعلی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث کی سند صحیح ہے)۔

شہادتِ حسنؓ کی پیشن گوئی:

علامہ طبری بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضور اکرمؐ مسجد میں حسنین کریمینؓ کو اپنے زانوؤں پر بٹھائے ہوئے پیار کر رہے تھے۔ جناب حسنؓ کا منہ چومتے تھے اور جناب حسینؓ کا گلا۔ جناب حسینؓ نے گھر جا کر امی جان سے دریافت فرمایا، امی جان میرا منہ سونگھیے، کیا اس سے بو آتی ہے؟

کیونکہ نانا جان بھائی کا منہ چومتے تھے اور میرا منہ نہیں چومتے تھے بلکہ گلے کا بوسہ لیتے تھے۔ حسینؑ اپنی مادرِ گرامی کے ہمراہ آنحضرتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے واقعہ بیان کیا۔ یہ سن کر آنحضرتؐ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا، بیٹی مجھے روح الامینؑ نے خبر دی ہے کہ حسنؑ کو زہر دیا جائے گا، اس کا کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کے منہ سے باہر نکلے گا اور حسینؑ اللہ کی راہ میں ذبح کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر آنحضرتؐ آبدیدہ ہو گئے اور جناب فاطمہؑ بھی رونے لگیں۔"

معصومین علیہم السلام کی زندگیاں سراپا مصائب کا مجموعہ رہی ہیں۔ حضرت امام حسنؑ کی عمر کا وہ حصہ جو آپؑ نے اپنی والدہ اور ناناؐ کے سایۂ عاطفت میں بسر کیا بس وہی کچھ پرسکون نظر آتا ہے۔ مگر وہ بھی کتنا آپؑ ابھی آٹھ سال کے تھے کہ مشفق نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چند ماہ بعد ہی مادرِ مہربان بھی گزر گئیں۔ اس کے بعد تو مصائب کی آندھیاں تھیں اور جانِ ناتواں۔ ان معصومینؑ کی زندگیوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اتنی سختیوں اور آلام کی شدت کے باوجود پائے استقامت میں ذرا بھی کجی دکھائی نہیں دیتی۔

قرآن اور شہزادہ حسنؑ:

سورۂ احزاب (۳۳) آیت ۳۳:

حضرت صفیہ بنتِ شیبہؓ سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرمؐ ایک روز صبح کے وقت تشریف لائے۔ اس حال میں کہ آپؐ نے ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی جس پر سیاہ اون سے کجاووں کے نقش بنے ہوئے تھے۔ حضرت حسنؑ بن علیؑ آئے تو آپ نے انہیں اس چادر میں داخل کر لیا۔ پھر حضرت حسینؑ آئے اور آپؐ کے ہمراہ چادر میں داخل ہو گئے۔ پھر حضرت فاطمہؑ آئیں، آپؐ نے انہیں اس چادر میں داخل کر لیا۔ پھر حضرت علیؑ آئے تو آپؐ نے انہیں بھی چادر میں لے لیا۔ پھر آپؐ نے یہ آیۂ مبارکہ پڑھی: (ترجمہ) "اے اہلِ بیت!۔ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) آلودگی دور کر دے اور تم کو کمال درجہ طہارت سے نواز دے۔ (اس حدیث کو امام مسلم اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے)۔

سورۂ آلِ عمران (۳) آیت ۶۱):

''حضرت سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ جب آیۂ مباہلہ (ترجمہ):

......آپ فرمادیں آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ......

نازل ہوئی تو حضور نبی اکرمؐ نے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو بلایا، پھر فرمایا: یا اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔''

یہاں صرف دو آیات قرآنی کا حوالہ پیش کیا گیا ہے ورنہ حضرت امام حسنؑ کا ذکر قرآن میں اور بھی کئی جگہ ہے، مثلاً آیۂ درود، آیۂ یوفون بالنذر، آیۂ مودت وغیرہ وغیرہ۔

عبادت وتلاوتِ قرآن:

احیاء العلوم میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور طبقات ابن سعد میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسنؑ جب اللہ تعالیٰ کے حضور نماز کی تیاری فرماتے تو وہ وضو فرماتے ہوئے جسم اطہر کا ایک ایک عضو کانپنے لگتا اور رنگ زرد ہو جاتا۔ اس لیے جناب حسن مجتبیٰ عابدین میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ آپ جب کلام پاک کی تلاوت فرماتے، جہاں لفظ اے ایمان والو! آتا تو آپ ارشاد فرماتے یا اللہ میں حاضر ہوں۔ جب جنت اور جہنم کا تذکرہ پڑھتے تو تڑپنے لگتے۔ بعد موت کے حالات پڑھتے تو اتنا روتے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

جود وسخا:

ابنِ عساکر اور دیگر کتب میں لکھا ہے کہ سیدنا امام حسنؑ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے تھے، خواہ آپ فاقے سے کیوں نہ ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں خود بارگاہِ الٰہی کا فقیر ہوں، اس لیے مجھے شرم آتی ہے کہ میں خود گداگر ہو کر کیوں کسی حاجت مند کو اپنے یہاں سے محروم کروں۔ نیز میرا اللہ مجھ پر ہمیشہ فیضان فرماتا رہتا ہے اور میں بھی اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ ابنِ سعد نے علی بن زید جدعان سے روایت کی ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے دو بار اپنا کل مال اللہ کی راہ میں دے ڈالا اور تین بار نصف مال دیا۔

برہنہ پا حج:

حضرت امام حسن علیہ السلام نے پچیس (۲۵) حج پا پیادہ ادا فرمائے۔ آپؑ کے ہمراہ سواری کی اونٹنیاں ہوتیں مگر آپؑ ان پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ اکثر آپؑ کے پاؤں میں ورم جایا کرتا تھا۔ آپؑ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے پالنے والے سے شرم آتی ہے کہ اس کی ملاقات کو جاؤں اور اس کے گھر تک پا پیادہ نہ جاؤں۔

''امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی میں روحانی اور علمی افادات کے ساتھ ساتھ عملی اور جہادی پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ آپ نے حضرت امیر المومنینؑ کے ساتھ جنگ جمل، جنگِ صفین اور جنگ نہروان میں یادگار کارنامے انجام دیے۔ سفارتی امور کے لحاظ سے بھی اور میدانِ جنگ میں شجاعانہ قیادت اور جرأت مندانہ محاربت کے لحاظ سے بھی۔ جس طرح آپؑ کے والد ماجد امیر المومنینؑ پیغمبرؐ کے ساتھ بدر و احد وغیرہ کے معرکوں میں قوت بازو بنے تھے، اسی طرح آپ جمل و صفین میں اپنے والد حضرت امیر المومنینؑ کی طاقتِ دل بنے رہے۔

حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد آپؑ مستقل طور پر امامت کے ذمہ دار ہوئے، ساتھ ہی تمام مسلمانوں نے آپؑ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور آپؑ نے امرِ امامت کے ساتھ ساتھ کچھ دنوں کے لیے خلافتِ ظاہری بھی قبول فرمائی۔ لیکن حاکمِ وقت کی ریشہ دوانیاں اور اہلِ عراق کا بزدلانہ اور اکثریت کا دنیا پرستانہ رویہ ایسے اسباب ہوئے کہ امام حسنؑ نے چند شرائط کے ساتھ ''حکومتِ ظاہری'' سے کنارہ کشی فرمائی اور اپنے ساتھ بچے کھچے صلحائے امت کا خون بے موقع ضائع ہونے سے بچالیا۔ یہ ایسے حالات تھے کہ امامؑ نے پورے کنبے کے ساتھ کوفہ کو خیر باد کہنے اور اپنے جدِ امجدؐ کے جوارِ اقدس میں مقیم ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ایک طرف انہوں نے فتنہ کا تدارک کیا تو دوسری طرف اپنے فرائض منصبی یعنی کارہائے امامت (لوگوں کی ہدایت و تربیت) ادا کرنے میں مشغول و مصروف ہو گئے۔ آپؑ کا یہ انداز ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا کہ جناب امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؑ کا تھا۔

اللہ تعالیٰ فساد کو سخت ناپسند کرتا ہے، چنانچہ ان دونوں بھائیوں (حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ) کا یہ وطیرہ رہا کہ فساد کو ہر قیمت پر ٹالا جائے۔ اس مشن کو پورا کرنے کے لیے دونوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگیاں ربِ اکبر کی رضا پر قربان کر دیں۔

"ینابیع المودۃ" میں حضرت امام حسنؑ کے فضائل:

علامہ جلیل شیخ سلیمان حسینی، بلخی، قندوزی، حنفی، سنی مفتیِ اعظم قسطنطنیہ کی معرکۃ الآرا کتاب "معالم العترۃ" اردو ترجمہ "ینابیع المودۃ" سے جناب امام حسنؑ کے فضائل کا انتخاب، بہت اختصار کے ساتھ:

(۱) (بحذف سند) حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ہاتھ پکڑ کر فرمایا: "جو شخص مجھے دوست رکھتا ہے وہ ان دونوں کو ان دونوں کے باپ اور ماں کو دوست رکھے۔ یہ لوگ قیامت کے روز میرے درجہ میں داخل ہوں گے۔"

(۲) ترمذی، انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو کون سے اہلِ بیت زیادہ محبوب ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "حسنؑ اور حسینؑ۔" اور حضور ختمی مرتبتؐ جناب فاطمہؑ سے فرمایا کرتے تھے: "میرے پاس میرے فرزندوں کو بلاؤ۔" آپؐ دونوں شہزادوں کو سونگھتے تھے اور اپنے سینے سے لگاتے تھے۔

(۳) ترمذی نے براء سے روایت کی ہے کہ نبی کریمؐ نے جناب حسنؑ و حسینؑ کو دیکھ کر فرمایا "اے میرے اللہ! میں ان دونوں کو دوست رکھتا ہوں، تو بھی ان دونوں کو دوست رکھ۔" یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

(۴) ترمذی اور ابن ماجہ قزوینی نے زید بن ارقمؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے حق میں ارشاد فرمایا: "میری اس شخص سے صلح ہے، جس شخص سے تم لوگوں کی صلح ہے اور میری اس شخص سے جنگ ہے، جس شخص سے تمہاری جنگ ہے۔"

۵) ترمذی ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا:
""حسنؑ اور حسینؑ دنیا میں میرے پھول ہیں۔""

۶) ترمذی براءؓ بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو دیکھا کہ آپ نے حسنؑ بن علیؑ کو اپنے شانۂ مبارک پر سوار کرکے فرما رہے تھے" اے میرے اللہ! میں اس کو دوست رکھتا ہوں اور تو بھی اسے دوست رکھ۔"

(۷) ترمذی عکرمہ سے، آپ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ امام حسنؑ بن علیؑ کو اپنے شانۂ مبارک پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے کہا" اے لڑکے جس سواری پر تم سوار ہو بہت خوب ہے۔" جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا:"سوار بہت خوب ہے۔"

(۸) بخاری اور ترمذی نے حضرت ابوبکرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے، فرمایا:"میرا یہ فرزند سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔" (یعنی حسنؑ بن علیؑ)۔

(۹) بخاری، ترمذی اور ابوداؤد نے انس بن مالک سے روایت کی ہے:"حسنؑ ابن علیؑ کے سوا اور کوئی شخص رسول اللہؐ کے ساتھ زیادہ مشابہت نہیں رکھتا تھا۔

(۱۰) ترمذی ہانی بن ہانی، حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امام حسنؑ رسول اللہؐ کے سینے سے لے کر سر تک زیادہ مشابہ تھے اور امام حسینؑ جناب رسالت مآبؐ سے اس سے نیچے کے حصے میں مشابہت رکھتے تھے۔

(۱۱) بخاری عقبہ بن حارث سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ آپؓ حضرت امام حسنؑ کو اٹھائے ہوئے تھے اور کہتے تھے" میرے ماں باپ اس شخص پر قربان ہوں جو شبیہ رسولؐ ہو اور شبیہ علیؑ نہ ہو اور حضرت علیؑ ہنس رہے تھے۔"

(۱۲) ابنِ ماجہ ابوحازم سے، وہ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:
"جس نے حسنؑ اور حسینؑ کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے ان

دونوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔"

(۱۳) مشکوۃ میں بریدہ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ ایک بار خطبہ بیان فرما رہے تھے۔ اس دوران امام حسنؑ اور امام حسینؑ تشریف لائے۔ دونوں شہزادے سرخ قمیصیں زیب تن کیے ہوئے تھے، چلتے تھے تو لڑکھڑا کر گر پڑتے تھے۔ حضور اکرمؐ منبر سے نیچے تشریف لائے اور دونوں کو اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش کا باعث ہیں۔ میں نے ان دونوں کو چلتے ہوئے اور لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ آخر کار میں نے اپنی بات ختم کر دی اور دونوں کو اٹھا لیا۔"

(۱۴) جناب ابن زبیرؓ سے روایت ہے، آپ نے کہا میں تم لوگوں سے ایسے شخص کے متعلق آگاہ کروں جو رسول اکرمؐ سے زیادہ مشابہ اور آپ کو زیادہ محبوب تھا۔ وہ حسنؑ بن علیؑ کی ذات تھی۔ رسول اکرمؐ سجدے میں تھے کہ آپؑ تشریف لا کر ان کے شانے (یا پشتِ) مبارک پر سوار ہو گئے (راوی کو شک واقع ہوا ہے)۔ نبی کریمؐ نے آپؑ کو اس وقت تک نہ اتارا جب تک آپؑ خود نہ اتر گئے۔ (ایک بار) میں نے دیکھا کہ آپؑ تشریف لائے اور رسول اکرمؐ رکوع کی حالت میں تھے، رسول اکرمؐ نے آپؑ کی خاطر دونوں پاؤں کشادہ کیے، آپؑ دوسری جانب نکل گئے۔

مآخذ

۱۔ "میں تو پنجتنؑ کا غلام ہوں" جناب نور الدین جنیدی صاحب قبلہ۔

۲۔ "چراغِ راہ" (شرح دعائے افتتاح) علامہ سید عقیل الغروی مدظلہ العالی۔

۳۔ "معالم العترۃ" اردو ترجمہ "ینابیع المودۃ" علامہ جلیل شیخ سلیمان حسینی، بلخی، قندوزی، مفتی اعظم قسطنطنیہ۔ ترجمہ و حواشی جناب مولانا ملک محمد شریف صاحب قبلہ۔

۴۔ "الاجابۃ فی مناقب القرابۃ" شیخ الاسلام الدکتور محمد طاہر القادری۔

حسینؑ آغوشِ رسالتؐ میں

حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ اعزاز ہے کہ آپؑ کے نانا جناب رسالت مآب، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، آپؑ کے والد گرامی قدر مرکز امامت و ولایت، حضرت علی مرتضیٰؑ، والدہ جناب فاطمہ زہراؑ اور بھائی امام دوم جناب حسن مجتبیٰؑ ہیں۔ آپؑ نبی مکرمؐ کے نور العین، علی مرتضیٰؑ کے دل کا چین، جناب سیدہؑ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور حضرت امام حسنؑ کے دل کا سرور تھے۔ آپؑ کی ولادت باسعادت ۳ شعبان ۴ ہجری شب جمعہ مدینۂ منورہ میں ہوئی۔ جب امام حسینؑ پیدا ہوئے تو خبر ملتے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سجدۂ شکر ادا فرمایا۔ پھر فرمایا "میرے پارۂ جگر کو میرے پاس لاؤ۔" جناب اسماء نے سفید ریشمی کپڑے میں حضرت امام حسینؑ کو آغوشِ رسالتؐ میں دیا۔ آپؐ نے انہیں گود میں لے کر خوب پیار کیا۔ داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت فرمائی۔ پھر اپنی زبان مبارک ان کے دہن مبارک میں دے کر چسائی۔ ایسے میں حضرت جبرئیلؑ حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ بعد از درود و سلام فرماتا ہے کہ حضرت علیؑ کو آپؐ سے وہ نسبت ہے جو جناب ہارونؑ کو جناب موسیٰؑ سے تھی۔ اس لیے آپؐ اس مولود کا نام جناب ہارونؑ کے فرزند کے نام کے مطابق رکھیں۔ آپؐ نے پوچھا پسران ہارون میں وہ کون سا نام ہے؟ حضرت جبرائیلؑ نے عرض کی مولود کا نام حسینؑ رکھیں۔ حضرت امام حسنؑ کی ولادت پر اللہ کی مرضی سے ان کا نام مبارک حسنؑ رکھا گیا تھا کیونکہ

جناب ہارونؑ کے بڑے فرزند کا نام حسنؑ تھا۔ یہ نام حسنؑ اور حسینؑ دونوں بھائیوں سے پہلے کسی کے نہیں رکھے گئے تھے۔ یہ نام جنت کے ناموں میں سے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب ان ناموں سے آشنا نہ تھے، اس لیے کسی کا نام حسن یا حسین نہیں رکھتے تھے۔ حضرت امام حسینؑ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ سبط اور سید آپؑ کے دو القاب ہیں جو جناب رسالت مآبؐ کے عطا کردہ ہیں۔ ان کے علاوہ ابوالائمہ اور سیدالشہداء بھی آپ کے القاب ہیں۔

ولادت کے بعد آپؑ نے نہ اپنی ماں نہ کسی اور عورت کا دودھ پیا۔ جناب رسالت مآبؐ اپنا انگوٹھا حضرت امام حسینؑ کے دہن مبارک میں رکھ دیتے تھے جسے وہ اس قدر چوستے تھے کہ کئی دن تک کسی غذا کی احتیاج نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح حضرت امام حسینؑ کا گوشت اور خون، جناب رسالت مآبؐ کے گوشت اور خون سے بنا۔ کچھ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ شروع دن سے ہی دودھ کی بجائے آپؑ کی غذا نبی اکرمؐ کا لعابِ دہن قرار پائی۔ بوقت ضرورت حضورؐ حضرت امام حسینؑ کو اپنی زبان چسا دیا کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں امام مظلوم کی پرورش حضور اکرمؐ کے گوشت و پوست کے ذریعہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ حضورؐ سے بہت مشابہ تھے۔ آگے چل کر اپنے عمل سے آپؑ نے ثابت کر دیا کہ واقعہ کربلا کے وقت اگر حضورؐ ہوتے تو وہی کچھ کرتے جو حضرت امام حسینؑ نے کیا۔ ایک بار مدینہ میں پانی کم یاب ہو گیا۔ ایسے میں جناب سیدہؑ جناب حسنین علیہم السلام کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کی کہ بابا جان! یہ دونوں کم سنی کے باعث سخت ہلکان ہیں اور پیاس برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے دونوں کو باری باری اپنے پاس بلایا اور ان کے دہن مبارک میں اپنی زبان رکھ کر خوب چسائی جس سے دونوں شہزادے اچھی طرح سیراب ہو گئے۔

ولادت کے بعد سے ہی حضرت امام حسینؑ نانا کی آنکھ کا تارا بنے رہے۔ حضرت

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میری ان آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے پاؤں حضورؐ کے پاؤں پر رکھے ہوئے تھے۔ ایسے میں حضور فرمار ہے تھے: ''اے ننھے قدموں والے چڑھ آ، چڑھ آ'' چنانچہ شہزادہ حسینؑ حضور اکرمؐ کے جسمِ مبارک پر چڑھنے لگے، یہاں تک کہ اپنے قدم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے پر رکھ دیے۔ حضورؐ نے فرمایا! ''منہ کھولو'' پھر آپؐ نے اپنا لعاب دہن حضرت امام حسینؑ کے منہ میں دیا اور آپؑ کے منہ کو چوم لیا۔ فرمایا: ''اے اللہ! اسے محبوب رکھ کیونکہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں۔''

حضرت امام حسینؑ کی ولادت پر مبارکباد اور تعزیت:

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ آسمانوں پر کوئی فرشتہ ایسا نہ تھا جو جناب رسالت مآب کی خدمت اقدس میں حاضر نہ ہوا ہو۔ ہر فرشتہ نے آپؐ کے فرزند کی ولادت کی مبارک باد دی اور ساتھ ہی تعزیت بھی پیش۔ حضور کو ان کی شہادت کے اجر وثواب سے باخبر کیا۔ آپ کو زمین کربلا کی وہ مٹی دی جس پر حضرت امام حسینؑ شہید کیے جائیں گے اور جہاں آپؑ کی لاش بے گور وکفن چھوڑ دی جائے گی۔ جناب رسالت مآبؐ نے یہ مٹی دیکھ کر فریاد کی ''اے اللہ! جو حسینؑ کو چھوڑے تو اسے چھوڑ، جو اسے قتل کرے تو اس کو قتل کر، قاتلانِ حسینؑ کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔'' کچھ الفاظ میں کمی بیشی کے ساتھ یہ روایت متواتر ہے۔ چند حوالے یہ ہیں: بحارالانوار میں حضرت سلمان فارسیؓ سے، حاکم، بیہقی، مشکوٰۃ، ینابیع المودۃ، میں جناب ام الفضلؓ سے یہ روایت درج ہے۔ صواعق محرقہ، علامہ حسین واعظ کاشفی، مناقب شہر آشوب، روضۃ الصفا نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔ معارج النبوۃ کے مطابق آنحضرتؐ جب نماز فجر ادا فرماتے تو اپنا رُخ اصحاب کی طرف فرماتے۔ آپ کی پیشانی کے نور سے صحابہ اکرامؓ کے دل باغ باغ ہو جاتے۔ ایک روز نماز فجر ادا فرما کر

اشارے سے حضرت علیؑ کو مخصوص فرمایا اور اپنے ہم راہ مسجد سے باہر تشریف لائے، حضرت علیؑ سے فرمایا کہ وہ حجرہ کے دروازہ پر ٹھہریں اور دوسرے آنے والوں کو اندر نہ آنے دیں کیونکہ تمہارے فرزند حسینؑ کی ولادت ہوئی ہے اور ملائکہ میرے پاس مبارک باد کے لیے آ رہے ہیں۔

صحیح بخاری، مشکوٰۃ، ترمذی، مسند احمد میں مرقوم ہے کہ حضرت امام حسنؑ سر اقدس سے سینۂ مبارک تک اور حضرت امام حسینؑ سینۂ مبارک سے پاؤں تک سرکار دو عالمؐ کی مکمل شبیہ تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ سے مشابہ تر اگر کوئی تھا تو حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ تھے۔ ان دونوں میں بھی حضرت امام حسینؑ سب سے زیادہ مشابہ رسولؐ تھے۔

چہاردہ معصومین، انوار الٰہی:

جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں جب چھٹا مہینہ ہوا تو رات کی تاریکی میں نور حسینؑ سے اتنا اجالا ہوتا کہ چراغ کی ضرورت نہ ہوتی۔ جب میں مصلّیٔ عبادت پر ہوتی تو میں سنتی کہ حسینؑ میرے شکم میں اللہ کی تسبیح اور تقدیس فرما رہے ہیں۔ میری تکبیر کے ساتھ ہی شکم سے اللہ اکبر کی صدا آتی۔ بحار الانوار، روضۃ الشہدا اور شواہد النبوۃ میں لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا حسن و جمال ایسا تھا کہ جب آپؑ اندھیرے میں بیٹھتے تو آپ کی پیشانی اور رخساروں سے روشنی نکل کر قرب و جوار کو منور کر دیتی۔ کتاب عوالم میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا: "اے سلمانؓ بے شک اللہ نے اپنے نور سے مجھے خلق فرمایا۔ اللہ نے مجھے آواز دی میں نے پذیرائی کی۔ میرے نور سے علیؑ کو خلق فرمایا۔ علیؑ نے اللہ کے فرمان کی تعمیل کی۔ پھر میرے اور علیؑ کے نور سے فاطمہؑ کو خلق کیا۔ ہماری طرح فاطمہؑ نے فرمان خدا کی بجا آوری کی۔ پھر مجھ محمدؐ و علیؑ اور

فاطمہؑ کے انوار سے حسنؑ اور حسینؑ کو خلق فرمایا۔ ان دونوں نے بھی اللہ کے حکم کو لبیک کہا۔ اسی وقت اللہ نے اپنے اسمائے حسنہ سے ہمیں پانچ اسماء قرار دیا۔ پس اللہ محمود ہے، میں محمدؐ۔ اللہ اعلیٰ ہے، یہ علیؑ۔ اللہ فاطر ہے، یہ فاطمہؑ۔ اللہ احسان ہے، یہ حسنؑ اور اللہ محسن ہے، یہ حسینؑ۔ اس کے بعد حسینؑ کے نور سے اللہ نے نو ائمہ خلق فرمائے۔ انہیں بھی آواز دی، انہوں نے بھی پذیرائی کی۔ جب ہماری خلقت ہوئی، اس وقت نہ آسمان تھا نہ زمین، نہ ہوا نہ پانی، نہ ملک تھا نہ بشر۔ ہم ہی اللہ کے حلم کے انوار تھے اور ہم اللہ کی اطاعت کرتے تھے اور تسبیح و تحلیل بجالاتے تھے۔

ام المومنین جناب امّ سلمیٰؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ عید کے دن اپنے فرزند حضرت امام حسینؑ کے بدن انور پر لباس آراستہ کر رہے تھے جو عام دنیاوی اقسام جیسا نہ تھا۔ میں نے عرض کی "یارسول اللہؐ یہ کس قسم کا لباس ہے، ایسا نفیس لباس میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔" حضورؐ نے فرمایا: "اے امّ سلمیٰؓ! یہ خلعتِ بہشتی ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے بطریق ہدیہ میرے پارۂ جگر حسینؑ کے لیے بھیجا ہے۔ امّ سلمیٰؓ یہ جبرائیلؑ کے پروں سے بنایا گیا ہے۔ آج روز عید ہے اور یہ دن زینت کا ہے۔ میں اپنے فرزند کو نہایت دوست رکھتا ہوں۔ اس لیے لباس بہشتی اپنے ہاتھ سے آراستہ کر رہا ہوں۔"

حسینؑ مظہر صفات رحمت اللعالمینؐ:

ایک بار جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کو لے کر بارگاہِ رسالت میں تشریف لائیں اور عرض کی: "اے اللہ کے رسولؐ یہ دونوں آپ کے فرزند ہیں۔ ان کو اپنی صفات عالیہ کا وارث بنائیے۔" جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: "میں نے حسنؑ کو اپنا حلم اور ہیبت عطا کی اور حسینؑ کو اپنی شجاعت و سخاوت سے سرفراز کیا۔" جناب فاطمہؑ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: "حسنؑ میں میری ہیبت اور

سیادت ہے اور حسینؑ میں میری جرأت وسخاوت ہے۔"

ایک دن حضورؐ حضرت امام حسینؑ کو اپنے دائیں بازو پر اور اپنے بیٹے حضرت ابراہیمؑ کو بائیں بازو پر بٹھائے ہوئے تھے کہ حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے اور عرض کی "اے اللہ کے رسولؐ، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو آپ کے پاس یک جا نہیں رہنے دینا چاہتا، وہ ان میں سے ایک کو واپس بلا لے گا۔ آپ ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند فرمالیں۔" حضورؐ نے فرمایا اگر حسینؑ رخصت ہو جائیں تو ان کی جدائی علیؑ و فاطمہؑ اور مجھے بہت شاق گزرے گی اور اگر ابراہیمؑ وفات پا جائیں صرف مجھے رنج ہوگا۔ اس لیے مجھے اپنا ہی رنج پسند ہے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد حضرت ابراہیمؑ وفات پا گئے۔ اس کے بعد جب بھی حضرت امام حسینؑ حضورؐ کی خدمت میں آتے تو حضورؐ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے اور خوش آمدید کہتے ہوئے فرماتے کہ اس پر میں نے اپنے بیٹے ابراہیمؑ کو قربان کر دیا۔

جناب سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ ایک روز جب میں جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر تھا تو دیکھا کہ آپؐ کے سامنے انگوروں کے خوشے رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ حسنؑ و حسینؑ کو بلا لاؤ۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن کہیں نہ ملے۔ جب یہ بات میں نے حضورؐ کو بتائی تو آپؐ پریشان ہو گئے اور فرمایا: "جو کوئی میرے بچوں کا پتہ بتائے گا، اللہ اسے بہشت میں جگہ عطا فرمائے گا۔"

حضور اکرمؐ کے آخری لمحات:

ابن نما علیہ الرحمہ نے مثیر الاحزان میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے جسے علامہ باقر مجلسیؒ نے بحار الانوار میں تحریر فرمایا ہے:

جب مرض الموت شدید ہوا تو آپؐ نے حضرت امام حسینؑ کو سینہ سے لگا کر آپؑ کی پیشانی مبارک کا جو پسینہ سے بھیگی ہوئی تھی بوسہ لیا۔ حضرتؐ کی روح اقدس پرواز کرنے ہی

والی تھی کہ آپ بار بار فرماتے تھے: "ہائے میں نے یزید ملعون کا کیا بگاڑا ہے۔ اللہ لعنت کرے یزید پر" یہ کہتے وقت دیر تک حضورؐ پر غشی کا عالم طاری رہا۔ جب غش سے افاقہ تو پھر حضرت امام حسینؑ کے بوسے لیے، جب کہ آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

احادیثِ پیغمبرؐ:

حضرت امام حسین علیہ السلام نے لاتعداد احادیث پیغمبر نقل فرمائی ہوں گی لیکن یہ تاریخ کا جبر ہے اور امتِ مسلمہ کی بے اعتنائی کہ ان کی کتب میں محض چند احادیث جگہ پا سکیں۔ آپؑ کے نقل شدہ ارشادات پیغمبرؐ میں سے چند یہ ہیں:

(۱) "صبر (تحمل اور ثبات قدم) کشائش کی کلید ہے اور پرہیزگاری لازوال تونگری ہے۔"

(۲) "بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔"

(۳) اللہ تعالیٰ بلند اور بہترین امور کو پسند فرماتا ہے اور پست و رکیک باتوں کو ناپسند فرماتا ہے۔"

(۴) "جس نے بھی قرآن مجید (کی تفسیر) کے بارے میں آگہی کے بغیر اس پر کلام کیا وہ دوزخی ہے۔"

(۵) "جس نے بھی کسی اچھے طور طریق کی بنیاد ڈالی اسے اس کا اپنا اجر بھی ملے گا اور تاقیامت جتنے لوگ بھی اس پر عمل کریں گے ان کے اجروں میں کسی کمی کے بغیر اسے بھی اجر ملتا رہے گا۔"

ماخذ

۱۔ "سفینۃ الشہداء فی مقتل الحسینؑ" مولف: مرزا محمد صابر شکیب۔

۲۔ "چراغِ راہ" شرح دعائے افتتاح، آیت اللہ علامہ سید عقیل الغروی۔

"حسینؑ مجھ سے ہے، میں حسینؑ سے ہوں"

"اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن پر اللہ نے نعمتیں نازل کی ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور یہی بہترین رفقاء ہیں۔" (سورۂ النساء (۴)، آیت ۶۹)

اسلام اور ایمان کی بنیادی بات اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری ہے اور اس اطاعت گزاری کا انعام یہ ہے کہ ایسا شخص اللہ کے انعام یافتہ بندوں کے ساتھ ہوگا۔ ان انعام یافتہ بندوں کے چار طبقات ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ (قرآن) اور اس کے رسول کی بات (حدیث) مانے گا اور کسی کی بات نہیں مانے گا وہ قرآن سے بغاوت کا مرتکب ہوگا۔ جب قرآن یہ کلیہ بیان کر رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا انعام اللہ کے انعام یافتہ بندوں کی رفاقت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ایسا شخص قرآن کے حکم سے سرتابی کر رہا ہے کہ اللہ تو اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کا انعام ان لوگوں کی رفاقت کو قرار دے رہا ہے اور یہ ان لوگوں سے تمسک کا انکاری ہے۔

قرآن مجید میں جا بجا اللہ نے صرف اپنی ہی اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ فرمایا ہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور ہستیاں ہیں جن کی اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت ممکن نہیں۔ صرف سورۂ الحمد کی آخری آیت پر غور کر لیا جائے جس میں کچھ "انعام یافتہ" ہستیوں کے راستہ پر چلنے کی ہدایت طلب کی جاتی ہے۔ اسی طرح سورۂ النساء کی آیت ۵۹ میں حکم ہوا ہے کہ "اے ایمان

والو اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں۔ پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو۔ یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔" صرف ان ہی دو آیات سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ کی اطاعت رسول اور کچھ خاص بندوں کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ اللہ کے احکامات کو پہنچانے والے اور اس کے دین کی تا قیامت حفاظت کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ ان کی زندگی نمونہ ہے۔ ان کے نقش قدم پر چل کر دنیا اور آخرت میں کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

اب ہم پھر مضمون کی ابتدا میں دی گئی آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں چار ہیں۔ نبوت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت۔ یہ تمام نعمات اللہ نے اپنے انبیاء کو الگ الگ عطا کی ہیں۔ مثلاً جناب یوسفؑ کو حسن، حضرت عیسیٰؑ کو مسیحائی، حضرت موسیٰؑ کو ید بیضا وغیرہ۔ یہ تمام نعمات ذات گرامی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کر دی گئی ہیں اور تمام نعمات جو انبیاء علیہم السلام کو دی گئیں وہ حضور اکرمؐ کے در سے عطا کی گئی ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب انبیائے کرام کو نبوت حضور اکرمؐ سے ملی، صدیقین کو صدیقیت کی نعمت صدیقیت مصطفویؐ سے ملی اور صالحین نے نعمت صالحیت، صالحیت مصطفویؐ سے پائی تو شہداء کو شہادت کی نعمت کس طرح ملی؟ کیونکہ بظاہر حضورؐ کا دامن نعمتِ شہادت سے محروم نظر آتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی تمام نعمتوں کا جامع اور افضل البشر بنایا ہے تو اس کی عنایات کا تقاضہ ہے کہ آپ کی ذات عالیہ میں تمام نعمتیں اپنے آخری کمال پر جمع ہوں۔ اس لیے ضروری تھا کہ حضور اکرمؐ کو بھی نعمت شہادت سے سرفراز کیا جاتا اور وہ شہادت بھی ایسی عظیم ہوتی کہ وہ اپنے نقطۂ کمال پر ہوتی۔

حضور اکرمؐ کی زندگی کو اللہ نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے۔ یعنی حضور اکرمؐ کی زندگی

نیکیوں کا منبع ہے۔ حضورؐ کے طرزِ حیات کو اپنا آئیڈیل بنا کر ہر انسان دنیا و آخرت کو سنوار سکتا ہے۔ وضاحت کے لیے چند آیات ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ سورۂ النساء، آیت ۸۰۔ ''جو رسولؐ کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو منھ موڑے گا تو ہم نے آپ کو اس کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔''

۲۔ سورۂ آلِ عمران، آیت ۳۱۔ ''اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا کہ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

۳۔ سورۂ احزاب، آیت ۲۱۔ ''مسلمانو تم میں سے اس کے لیے رسولؐ کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔۔۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضورِ اکرمؐ کو نعمتِ شہادت ملی تو ہے لیکن ذرا مختلف انداز سے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ شہادت کہتے کسے ہیں۔ شہادت کے لغوی معنی ''گواہی'' ہیں۔ جو کوئی شہادت کی موت پاتا ہے وہ عملاً اللہ کی یکتائی کی گواہی پیش کرتا ہے۔ موت کا مزہ ہر نفس کو چکھنا ہے مگر شہادت، موت کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ حکیم الامت، شاعرِ مشرق، علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ فرماتے ہیں:

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

شہادت موت کی ایک قسم ہے:

ایک تو طبعی موت ہے جو عمرِ طویل یا کسی بیماری کے سبب واقع ہو۔ ایسی موت عام موت کہلائے گی۔ دوسری موت وہ ہے جو انسان خود پر طاری کرلے، زہر کھا کر یا کسی بھی طرح سے اپنے کو ہلاک کرلے۔ ایسی موت خودکشی کہلائے گی۔ ایسی موت حرام موت

ہے۔ اسلام نے اس کی سختی سے ممانعت کی ہے۔

تیسری موت وہ ہے جو انسان دوسرے کے ہاتھوں سے مظلومیت کے ساتھ اختیار کرے۔ ایسی موت شہادت کی موت ہوگی۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۰۰ میں ارشاد باری ہے "اور جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے گا اس کے بعد اسے موت بھی آجائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

شہادت کی دو اقسام ہیں:

۱۔ شہادت سرّی:

اسے شہادت حکمی بھی کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی پانی میں ڈوب کر، یا کسی کے زہر کھلانے سے، یا ایسی موت جو اختیاری نہ ہو، مثلاً کسی عورت کا حالت زچگی میں مرجانا، یا ایکسیڈنٹ یا دہشت گردی میں بے گناہ مارے جانا۔

۲۔ شہادت جہری:

اسے شہادت ظاہری اور بڑی شہادت بھی کہتے ہیں جیسے کوئی مسلمان میدان جنگ میں دشمن کے ہاتھوں مارا جائے۔

ہر عمل اور ہر عبادت کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ قرآن اور احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ شہید ہونے کی آرزو حضور اکرم کو شدت سے تھی۔ آپؐ نے فرمایا: "اور قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں چاہتا ہوں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں۔" (صحیح البخاری، جلد اول، کتاب الجہاد، باب تمنی الشہادۃ)۔

ضمناً ایک بات ذہن میں آگئی۔ حضرت علیؑ کو بھی شہادت کی بڑی تمنا تھی۔ آپؑ جس

وقت کوئی معرکہ سر کر کے تشریف لاتے تو تمام اصحاب و انصار کے چہرے خوشی سے دمکتے تھے، جب کہ حضرت علیؑ سنجیدہ رہتے تھے۔ شاید انہیں شہید نہ ہو سکنے کا احساس ہوتا تھا۔ مسجد کوفہ میں جب دوران نماز، عین حالت سجدہ میں ابنِ ملجم کے وار سے انہیں ادراک ہوا کہ آج میری شہید ہونے کی آرزو کا وقت آپہنچا تو ان کے دل کی مراد بر آئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا: "فزت برب الکعبہ" (رب کعبہ کی قسم آج علی کامیاب ہو گیا)۔

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ میں شہادت کا باب مکمل کرنے کے لیے دو افراد کو منتخب فرمایا، تاکہ ایک کی شہادت سِرّی ہو یعنی زہر دیے جانے سے شہید ہو اور دوسرے کی شہادت جہری ہو یعنی غربت اور مظلومیت کی حالت میں دشمنوں کے ہاتھوں سے اس کی موت واقع ہو۔

ان دو منتخب حضرات کے لیے ضروری تھا کہ وہ حضور اکرمؐ کے بالکل اپنے ہوتے۔ ایسے اپنے کہ ظاہری شکل و صورت میں بھی اور باطنی طور پر بھی وہ آپؐ کے مشابہ ہوتے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو شہزادوں کا انتخاب فرمایا۔ شہادت سِرّی کے لیے حضرت امام حسن علیہ السلام اور شہادت جہری کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام کو منتخب کیا۔ یہ دونوں کئی وجوہات کی بنا پر حضورؐ کے جزو تھے۔ یہ دونوں آپ کی محبوب بیٹی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے فرزند تھے، جن کے بارے میں حضور فرما چکے تھے کہ فاطمہؓ میرا ٹکڑا ہے۔ آپؐ نے انہیں کبھی نواسہ نہیں کہا بلکہ "بیٹا" کہہ کر مخاطب کیا۔ مباہلہ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۶۱) میں اللہ کا حکم تھا کہ "اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے نفوس" کو لے کر میدان مباہلہ میں آؤ۔ اس موقعہ پر آپؐ بیٹوں کی جگہ حضرات حسنین کریمینؑ کو، عورتوں کی جگہ جناب فاطمہؓ کو اور انفسنا کی منزل پر حضرت علی علیہ السلام کو لے گئے۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ! یہ میرے اہل (بیت) ہیں۔" (صحیح مسلم، کتاب الفضائل)

اس بات کی تائید حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت کردہ حدیث سے ہوتی ہے کہ

انھوں نے حضور اکرمؐ کو دیکھا کہ آپؐ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ دونوں شہزادوں کو لیے بیٹھے تھے اور فرما رہے تھے: "یہ دونوں میرے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ اے اللہ! میں ان کو محبوب رکھتا ہوں، تو بھی ان کو محبوب رکھ اور اس کو بھی محبوب رکھ جو ان کو محبوب رکھے۔ (ترمذی، ابواب المناقب)۔

حضرات حسنین علیہم السلام کی ظاہری اور باطنی مشابہت پر، بہت سی احادیث ہیں، جن میں سے چند ایک یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

ظاہری مشابہت کے بارے میں، امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے:

"حضرت امام حسنؑ سینے سے لے کر سر تک رسول اللہؐ کے بہت مشابہ اور حضرت امام حسینؑ سینے سے لے کر پاؤں تک حضور اکرمؐ کے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔" (سنن ترمذی، ابواب المناقب)۔

حضرت ابو حذیفہؓ سے مروی ہے:

"میں نے رسول اللہ کو دیکھا، حضرت حسن بن علیؑ آپؐ کے زیادہ مشابہ تھے۔" (سنن ترمذی، الجلد الثانی، ابواب المناقب)۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: "حسینؑ ان لوگوں میں سے تھے جو رسولؐ سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ (سنن ترمذی، الجلد الثانی، ابواب المناقب)۔

حضرت انسؓ بن مالک ہی سے مروی ہے: "نبی اکرمؐ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والا حسنؑ بن علیؑ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔"

اور حضرت انسؓ نے حضرت حسینؑ کے بارے میں بھی کہا کہ وہ بھی رسول اللہؐ سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ابواب المناقب)۔

باطنی مشابہت:

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: ''حضرت فاطمہ زہراؑ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں اور حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ (دونوں) جنت کو جوانوں کے سردار ہیں۔'' (ترمذی، ابواب المناقب)۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دونوں جہانوں کے سردار ہیں اور آپؐ نے حضرات حسنین علیہم السلام کو جنت کے جوانوں کا سردار قرار دیا ہے۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو بھی ہوگا وہ جوان ہوگا۔ حضور اکرمؐ کو جس طرح سیادت کل حاصل ہے اسی طرح حضرات حسنینؑ کو بھی جنت کی سیادت کل عطا کی گئی۔ یہ شرف دونوں شہزادوں کا حضور اکرمؐ سے باطنی مشابہت کا ثبوت ہے۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا: ''بے شک حسنؑ اور حسینؑ دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔'' (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب)۔ پھولوں میں جمال وکمال اصل کا ہوتا ہے۔ حضرات حسنینؑ کو جمال وکمال حضور اکرمؐ سے ملا ہے۔ آپؐ کا دونوں کو اپنا پھول قرار دینا ان کی آپؐ کے ساتھ روحانی مشابہت پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''جس نے حسنؑ اور حسینؑ کو محبوب رکھا اس نے (درحقیقت) مجھے محبوب رکھا اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا اس نے (درحقیقت) مجھ سے بغض رکھا۔''

حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے، آپؐ فرماتے تھے کہ حسنؑ وحسینؑ دونوں میرے بیٹے ہیں۔ جس نے ان دونوں کو محبوب رکھا اس نے مجھے محبوب رکھا۔ جس نے مجھے محبوب رکھا اس نے اللہ کو محبوب رکھا۔ جس نے اللہ کو محبوب رکھا اللہ نے اسے جنت میں داخل کیا۔ جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا،

جس نے مجھ سے بغض رکھا، اس نے اللہ سے بغض رکھا اور جس نے اللہ سے بغض رکھا، اللہ نے اسے جہنم رسید کیا۔ (المستدرک حاکم، جلد ثالث، ۱۶۶)۔

یہ احادیث حضرات حسنینؑ کی حضور اکرمؐ سے باطنی مشابہت کی دلیل ہیں۔

اس امر کی سب سے بڑی دلیل محبوب الٰہی کا یہ فرمان ہے، جو اس مضمون کا خلاصہ ہے:

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں، جو حسینؑ کو محبوب رکھتا ہے اللہ اس کو محبوب رکھتا ہے۔" (سنن ترمذی، جلد ثانی، ابواب المناقب)

حضور اکرمؐ کا یہ قول تو بآسانی سمجھ میں آتا ہے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے" یعنی بیٹا باپ سے ہے یا نواسہ نانا سے ہوتا ہے۔ لیکن "میں حسینؑ سے ہوں" یہ کیسے سمجھ میں آئے؟

تھوڑی سی زحمت کریں تو یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔ حضور اکرمؐ کا یہ فرمانا کہ میں حسینؑ سے ہوں، اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ میرے فضائل اور کمالات کا ظہور ان سے ہوگا۔ خصوصاً نعمت شہادت کا حصول ان شاہزادوں کی المناک شہادتوں سے ہوگا۔

سرور کائنات کی سری شہادت جس کا آغاز غزوۂ خیبر سے ہوا تھا، اس کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کیا گیا۔ حضورؐ کی جہری شہادت جس کا آغاز غزوۂ احد میں ہوا تھا، اس کی تکمیل کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے ہوئی۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ حضور اکرمؐ کے پردہ فرما جانے کے چالیس پچاس سال کے اندر ہی ملوکیت نے کیسے سر ابھارا اور اسلام جیسے دین حق کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ اس کی شکل و صورت کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اس موقعہ پر پہلے حضرت امام حسنؑ نے صلح کی تدبیر سے فتنہ کی سرکوبی کی پھر حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ باطل کی ٹڈی دل فوج سے مقابلہ کر کے جام شہادت نوش فرمایا۔ حسینؑ کا یہ اقدام سرور کائناتؐ کی تعلیم و تربیت کا عکس تھا۔ کربلا میں اگر حضورؐ ہوتے تو وہی کرتے جو حضرت امام حسینؑ نے کیا۔ اس

طرح جناب امام حسینؑ نے ناناؐ کے دین کو ملوکیت سے بچالیا اور ناناؐ کے فرمان "میں (محمد مصطفیٰؐ) حسینؑ سے ہوں" کی وضاحت کردی۔ امام مظلومؑ کی شہادت کے بعد جبری بیعت طلب کرنے سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

مآخذ

"فلسفۂ شہادت امام حسینؑ" از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔ منہاج القرآن پبلیکیشنز، لاہور۔

حسینؑ کی نظر میں

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام تاریخ کی وہ عظیم شخصیت ہیں جن پر سب سے زیادہ لکھا گیا، بولا گیا، رویا گیا اور جن پر سب سے زیادہ تحقیق ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؑ نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جو عام انسان کی بس کی بات نہیں تھا۔ جناب رسالت مآبؐ کے بعد کوئی نبی، رسول آنے والا نہیں تھا۔ اور دین پر ایسا وقت آپڑا کہ اس کو سوائے حسینؑ کے کوئی اور بچانے والا نہیں تھا۔ یہ کام صرف بنو ہاشم اور خاص کر جناب عبدالمطلب اور جناب ابوطالب کی اولاد ہی کا تھا کہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آگئے۔ چاہے بات پیغمبر اکرم کی ذات مقدس کی حفاظت کی ہو یا دین کو بچانے کی۔ یہ گھرانہ سربسر دین کی آبیاری میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ جوان تو جوان، بوڑھے بھی، عورتیں تو عورتیں بچے بھی دین اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر ہر وقت کمربستہ دکھائی دیے۔

''امام حسینؑ، دلربائے قلوب'' (مجموعہ خطبات وتقاریر) میں حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خامنہ ای فرماتے ہیں: ''اہلِ بصیرت کے درمیان ہمیشہ سے یہی ہوتا رہا ہے جیسا کہ روایات اور تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے، حضرت ختمی مرتبتؐ اور امیر المومنینؑ کے گھر اور ان بزرگوار ہستیوں کی زندگی میں بھی اس عظیم ذات (حضرت امام حسینؑ) کو مرکزیت حاصل تھی اور یہ ہمیشہ ان عظیم المرتبت ہستیوں کے عشق ومحبت کا محور رہا ہے اور آج بھی ایسا ہی ہے۔''

دنیا نے دیکھا کہ حضرت امام حسین کیا تھے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ آج ہم دیکھیں کہ

حسینؑ کی نظر میں یہ دنیا کیا تھی۔ وہ زندگی کو کس زاویہ سے دیکھتے تھے۔ حکومت کی حیثیت ان کی آنکھوں میں کیا تھی۔ اپنے انصار واحباب کو کن نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ امام مظلومؑ پر لکھی گئی کچھ کتابوں کی رو سے، حسینؑ کی نظر میں:

مرضیٔ رب اور اپنا عمل:

مکہ سے روانگی کے وقت فرزدق کی کوفہ کے لوگوں کے بارے میں رپورٹ پر امامؑ نے فرمایا:

"تم درست کہتے ہو۔ ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر روز ایک ارادہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کا حکم بھی ہمارے منصوبے کے مطابق ہو جائے تو ہم اس کے شکر گزار اور سپاس گزار ہوں گے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے افکار و عزائم کے درمیان حائل ہو گئی تو اس لیے کہ ہمارا مقصد حق ہے اور ہمارا باطن تقویٰ ہے، اللہ تعالیٰ سے ہم دور نہیں ہوں گے۔" (بحار ج ۱۰، ص ۱۸۵)۔

("حسین شناسی" تالیف آیت اللہ محمد یزدی۔ ترجمہ محمد خالد فاروقی)

اللہ پر بھروسہ:

اپنی مناجات میں امام مظلومؑ فرماتے ہیں: "پالنے والے! تو ہی ہر رنج و غم میں میرا بھروسہ ہے، ہر سختی میں تو ہی میری امیدوں کا مرکز ہے، جب بھی مجھ پر کوئی مصیبت پڑی، تو تو ہی میرا آسرا اور اس مصیبت سے چھٹکارے کا سامان بنا۔ نہ جانے کتنے مصائب و آلام تھے جن میں دل کمزور پڑا، چارہ جوئی کی راہ مسدود ہوئی، دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا، دشمنوں نے خوشیاں منائیں۔ میں نے ان مصائب و آلام میں، گھر کر تیری طرف رجوع کیا، اپنا غم تجھ ہی سے بیان کیا، تیرے ماسوا سے بے نیاز ہو کر تجھ ہی سے آرزومند ہوا اور تو نے وہ مصائب و آلام دور کر دیے، ان کے گھیرے سے مجھے باہر نکال دیا۔ تو ہی ہر نعمت کا مالک اور تمام نیکیوں والا اور قبلۂ حاجات ہے۔" ("کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں" تالیف: محسن غرویان۔ ترجمہ سید سعید حیدر زیدی شہید۔ ص ۴۵)

اللہ کی ناراضگی:

جب دشمن کے پے در پے حملوں کے نتیجے میں امامؑ کے متعدد اصحاب شہید ہو گئے۔ اس موقع پر آپؑ نے ریش مبارک ہاتھ میں لے کر فرمایا: اللہ تعالیٰ یہودیوں پر شدت کے ساتھ اس لیے غضب ناک ہوا کہ وہ اس کے لیے ایک بیٹے کے قائل ہوئے۔ عیسائیوں پر اس لیے بے حد ناراض ہوا کہ انہوں نے اللہ رب العزت کو تین میں کا تیسرا قرار دیا اور مجوسیوں پر اس لیے شدید طیش میں آیا کہ وہ خدا کی بجائے سورج اور چاند کی عبادت کرنے لگے اور اب اس قوم (لشکر یزید) پر اس لیے انتہائی غیظ میں آیا ہے کہ وہ ایکا کر کے اپنے نبیؐ کے نواسے کو قتل کرنے کے در پے ہیں۔"

("خطبات، فرمودات و مکتوبات حسینؑ ابن علیؑ" از محمد صادق نجمی، ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی۔ ص ۳۰۲)۔

بندگی:

امامؑ فرماتے ہیں:

"بے شک ایک گروہ بہشت اور آخرت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کی امید میں خدا کی عبادت کرتا ہے، ایسی عبادت تاجروں کی سی عبادت ہے۔ ایک دوسرا گروہ عذاب اور دوزخ کے خوف سے خدا کی عبادت میں مشغول ہے، یہ غلاموں کی سی عبادت ہے۔ جب کہ ایک اور گروہ ہے جو خدا کو شکر و سپاس کے لائق اور اس کا حق دار سمجھ کر اس کی عبادت کرتا ہے، ایسی عبادت احرار اور آزادوں کی عبادت ہے، اور یہی سب سے بہتر عبادت ہے۔"

(تحف العقول۔ ص ۱۷۵)

("کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں" تالیف: محسن غرویان۔ ترجمہ سید سعید حیدر زیدی شہید۔ ص ۳۷)۔

رسول اللہؐ:

مدینہ سے کربلا جاتے وقت حرم رسول اللہؐ تشریف لے گئے اور یہ کہتے ہوئے مرقد

انور کی زیارت کی:

"السلام علیک یا رسول اللہؐ۔۔۔۔۔۔اے رسول اللہ! آپ پر میرا سلام ہو، میں، حسینؑ آپ کا فرزند اور آپ کا نواسہ ہوں، میں آپ کا وہ فرزند ہوں جسے امت کی ہدایت اور رہبری کے لیے آپ نے اپنا جانشین بنایا ہے۔ اے رسول اللہؐ! آپ گواہ رہیے گا کہ انہوں نے مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے اور میری حفاظت نہیں کی ہے۔ یہ آپ کی بارگاہ میں میری شکایت ہے، یہاں تک کہ میں آ کر آپ سے مل جاؤں۔"

دوسری رات امامؑ ایک بار پھر قبرِ رسولؐ کی زیارت کے لیے تشریف لائے اور ان الفاظ میں اپنے جدامجد کی زیارت کی:

بار الہا! یہ تیرے نبی محمدؐ کی قبر ہے اور میں تیرے نبیؐ کا نواسہ ہوں اور جو کچھ میرے لیے پیش آیا ہے تو اس سے آگاہ ہے۔ بار الہا! میں نیکی اور بھلائی سے پیار کرتا ہوں اور برائی سے نفرت۔ اے ذوالجلال والاکرام! اس قبر اور صاحب قبر کے واسطے سے (تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ) میرے لیے وہ (راہ) پسند فرما جس میں تیری اور رسولؐ کی رضا اور خوشنودی ہو۔"

امامؑ نے مکہ تشریف آوری کے بعد بصرہ کے قبائل کے سرداروں کے نام ایک خط ارسال کیا۔ اس خط میں آپؑ نے تحریر فرمایا:

"اللہ نے تمام لوگوں میں سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چنا، نبوت کے ذریعے انہیں بزرگی سے نوازا اور اپنی رسالت کے لیے انہیں منتخب کیا۔ پھر جب آں حضرتؐ، اللہ کے بندوں کو نصیحت اور ان کی رہنمائی فرما چکے اور اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے دیا تو پروردگار نے انہیں اپنے پاس بلا لیا (اور ان کی روح قبض کر لی)۔ ہم ان ہی کے اہلِ بیت، اولیا، اوصیا اور ورثا ہیں، اور ہم ہی تمام لوگوں میں ان کے مقام کے سب سے زیادہ اہل اور حق دار

ہیں۔ لیکن ایک گروہ نے یہ حق ہم سے چھین لیا۔ ہم نے (حقدار ہونے کے باوجود اس ظلم پر) صبر کیا اور (مسلمانوں کے درمیان) اختلاف اور تفرقے کو ناپسند کرتے ہوئے امن و عافیت کو ترجیح دی۔ جب کہ ہم جانتے تھے کہ ہم اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق تھے جس پر دوسرے مسلط ہو گئے۔

("خطبات، فرمودات و مکتوبات حسین ابن علی" از محمد صادق نجمی، ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی۔ ص ۴۱، ۴۲، ۷۵)

امام اور امامت:

سید الشہداؑ نے فرمایا:

"..... اے لوگو! رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم حاکم کو دیکھے جو اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حلال بنا رہا ہو، اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان توڑ رہا ہو، رسول کی سنت کی مخالفت کرتا ہو اور اللہ کے بندوں کے ساتھ ظلم و ستم سے پیش آتا ہو اور (یہ شخص) ایسے حاکم کو دیکھنے کے باوجود اپنے عمل یا اپنے قول سے اس کی مخالفت نہ کرے تو اللہ کو حق ہے کہ اس (خاموش اور بے عمل) شخص کو اسی ظالم کے ہمراہ عذاب میں مبتلا کرے۔

اے لوگو! جان لو کہ ان لوگوں (بنی امیہ) نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے اور رحمٰن کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے، فتنہ و فساد کو رواج دیا ہے اور اللہ کی حدود (احکام الٰہی) کو معطل کر دیا ہے۔ (خاندان نبوت سے مختص) مال کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے، اللہ کی طرف سے کیے گئے حرام کو حلال میں اور اللہ کی طرف سے قرار دیے گئے حلال کو حرام میں تبدیل کر دیا ہے اور میں (ان مفسدوں کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی رہبری کا) زیادہ حق دار ہوں۔ ان حالات میں، مجھ تک پہنچنے والے تمہارے خطوط کا مضمون اور تمہارے قاصدوں کا پیغام یہ تھا کہ تم لوگوں نے اس بات پر میری بیعت کی ہے کہ نہ تم مجھے تنہا چھوڑو گے اور نہ مجھ سے بے وفائی کرو گے۔ اب اگر تم اپنی بیعت پر قائم رہے، تو کامیابی اور ہدایت حاصل کرو گے۔ کیوں کہ تم جانتے ہو کہ میں حسین ابن علی فرزند فاطمہ بنت رسول اللہؐ ہوں۔ میری جان تمہاری جان کے

ساتھ اور میرے اہل وعیال تمہارے اہل وعیال کے ہمراہ ہیں (ہمارے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی دوئی نہیں)، میں تمہارے لیے نمونۂ عمل ہوں۔ اب اگر تم نے مجھ سے کیے جانے والے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور میری بیعت سے انکار کیا تو یہ تم کوئی نئی بات نہیں کرو گے۔ تم میرے والد میرے بھائی اور میرے چچا کے بیٹے مسلم بن عقیلؑ کے ساتھ ایسا ہی کر چکے ہو۔ جس نے تم پر بھروسہ کیا، اس نے دھوکہ کھایا۔ یاد رکھو کہ تم نے اپنا ہی نقصان کیا ہے اور اپنے ہی حصے کو ضائع کیا ہے۔ جو کوئی وعدہ خلافی کرتا ہے وہ خود اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اللہ جلد ہی مجھے تم لوگوں سے بے نیاز کر دے گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" ("خطبات و فرمودات و مکتوبات حسینؑ ابن علیؑ" تالیف محمد صادق نجمی، ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی، ص ۱۷۸-۱۷۷)۔

اس سلسلے میں امامؑ نے (دیگر مواقع پر) مزید فرمایا:

"میری جان کی قسم، سچا پیشوا اور امام برحق وہی ہے جو کتاب خدا پر عمل کرتا ہو، جو عدل و انصاف پر کاربند ہو، جو حق کا پیروکار ہو، جس نے اپنا پورا وجود راہِ خدا میں وقف کر دیا ہو اور صرف اسی کا فرماں بردار ہو۔" (کتاب الارشاد، ص ۲۰۴، مقتل خوارزمی۔ ج ۱، ص ۱۹۵، ۱۹۶)۔

"ایک امام و پیشوا ایسا ہے جو لوگوں کو سعادت اور ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے اور ایک گروہ اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کی پیروی کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل ایک ایسا بھی امام اور پیشوا ہے جو لوگوں کو ضلالت اور گمراہی کی طرف بلاتا ہے، ایسے رہنما کے پیروکار بھی ہوتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں سے پہلا گروہ اہلِ جنت کا گروہ ہے، جب کہ دوسرا گروہ جہنم میں جائے گا اور یہ کلامِ الٰہی اسی بارے میں ہے کہ: ایک گروہ جنتی اور ایک گروہ جہنمی۔"

("کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں" تالیف: محسن غرویان۔ ترجمہ سید سعید حیدر زیدی شہید۔ ص ۱۵، ۴۲)۔

اصحاب و انصار:

اپنے اصحاب باوفا کے بارے میں آپؑ نے فرمایا:

"جیسے اصحاب و انصار مجھے ملے نہ میرے بھائی حسنؑ کو، نہ میرے بابا علیؑ کو اور نہ

میرے نانا محمد مصطفیٰ کو ملے۔"

بھائی، بابا، اور نانا نے نہیں پائے رفیق
جیسے مخلص باوفا ٹھہرے رفیقانِ حسینؑ

مقاتل میں لکھا ہے کہ روز عاشور جب بھی امامؑ کے کوئی صحابی میدان کی طرف جاتے ہوئے آپؑ کو سلام پیش کرتے تو آپؑ جواب سلام کے بعد فرماتے "ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے ہی آ رہے ہیں" اس کے بعد اس آیت (احزاب ۳۳، آیت ۲۳) کی تلاوت فرماتے:
"ان میں سے بعض نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور اپنے عہد و پیمان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔"

جب آپؑ جناب واضح نامی ایک ترک غلام کے سرہانے تشریف لائے تو انہیں گلے سے لگایا، اپنے دستِ مبارک ان کی گردن کے نیچے رکھے اور اپنا چہرہ ان کے چہرے پر رکھا۔ جناب واضح امامؑ کی یہ محبت اور شفقت دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے اور اس اعزاز پر فخر کرتے ہوئے فرمایا: "مجھ جیسا کون ہوگا (جسے یہ اعزاز ملا) کہ فرزند رسولؐ نے اپنا رخسار اس کے رخسار پر رکھا ہو۔"

("خطبات، فرمودات و مکتوبات حسینؑ ابن علیؑ" از محمد صادق نجمی، ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی۔ ص ۳۰۵۔۳۰۶)

حکومت:

شہید کربلا حضرت امام حسینؑ نے فرمایا:

"پروردگارا! یہ تحریک جو ہم نے چلائی ہے، جس امر کے لیے قیام کیا اور جس میں تجھ سے فیصلے کے طالب ہیں تو جانتا ہے کہ یہ سب اقتدار کی خواہش کے لیے نہیں ہے، اقتدار کی خواہش ایک انسان کے لیے ہدف نہیں بن سکتی اور نہ ہی ہم چاہتے ہیں کہ زمام قدرت کو اپنے ہاتھ میں لیں، نہ ہی ہمارا قیام دنیوی مال و منال کے حصول کے لیے ہے کہ اس کے ذریعے سے دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہوں، شکم پری کے تقاضے کریں اور مال و دولت جمع

کریں، ان میں سے کوئی ایک بھی ہمارا ہدف و مقصد نہیں ہے۔"

("امام حسینؑ دلربائے قلوب" آیت اللہ العظمیٰ امام خامنہ ای کے خطبات و تقاریر کا مجموعہ، ترجمہ سید صادق رضا نقوی، ص۔ ۱۰۰ تا ۱۰۱)

دنیا اور مال و دولت:

امامؑ نے فرمایا: "سمجھ رکھو کہ یہ فانی دنیا، جتنی بھی قیمتی ہو، (اس دوسرے جہاں کے بالمقابل پست اور بے قیمت ہے) اور جہانِ آخرت بلند مرتبہ اور بیش قیمت ہے۔"

"اگر حقیقتاً ایسا ہی ہے کہ مال و دولت جمع کرنے کے بعد بالآخر اسے یہیں چھوڑ جانا ہوتا ہے، تو پھر انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ دنیوی مال و دولت کے بارے میں اس قدر بخل سے کام لیتا ہے۔"

("کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں" تالیف: محسن غرویان۔ ترجمہ سید سعید حیدر زیدی شہید۔ ص ۱۷)۔

حرمت مکہ:

جناب عبداللہ ابن زبیر نے جب امامؑ کو مکہ میں قیام کرنے کی تجویز پیش کی تو آپؑ نے فرمایا:

"میرے والد نے مجھے بتایا تھا کہ مکہ میں ایک مینڈھے کی موجودگی کی وجہ سے اس شہر کا احترام پامال ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مینڈھا میں بنوں (یعنی مجھے قتل کیا جائے اور اس وجہ سے خانۂ خدا کا احترام پامال ہو)۔ اگر میں مکہ سے ایک بالشت باہر مارا جاؤں تو یہ مجھے مکہ میں مارے جانے کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے، اسی طرح اگر مکہ سے دو بالشت کے فاصلے پر قتل کیا جاؤں تو یہ مجھے مکہ سے ایک بالشت دور مارے جانے سے زیادہ پسند ہوگا۔

خدا کی قسم، اگر میں کسی جانور کے بل میں بھی چلا جاؤں تو یہ لوگ اپنا مقصد پانے کی خاطر مجھے وہاں سے بھی نکال کر قتل کر دیں گے۔ یہ لوگ میرا احترام اسی طرح پامال کریں گے جس طرح یہودیوں نے ہفتے کے دن کا احترام پامال کیا تھا۔"

مزید فرمایا:

"اے ابن زبیر! مجھے فرات کے کنارے دفن ہونا، خانۂ کعبہ کی دہلیز پر دفن ہونے سے زیادہ پسند ہے۔"

جب جناب عبداللہ ابن زبیر امامؑ کے پاس سے چلے گئے تو آپؑ نے فرمایا: "یہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں حرم کا کبوتر بن جاؤں۔ اگر قتل کے موقع پر میں حرم سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہوں تو یہ میرے لیے (حرم سے) ایک بالشت دور ہونے کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ ہے اور (اسی طرح) طف میں قتل کیا جانا مجھے حرم میں مارے جانے سے زیادہ محبوب ہے۔"

("خطبات، فرمودات و مکتوبات حسینؑ ابن علیؑ" از محمد صادق نجمی، ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی۔ ص ۹۹۔۱۰۰)

حرمت مدینہ:

ثعلبیہ کے مقام پر کوفہ کا ایک شخص امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دورانِ گفتگو امامؑ نے اس سے پوچھا کہ وہ کس شہر کا رہنے والا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کوفے کا۔ امامؑ نے فرمایا: "خدا کی قسم! اگر مدینہ میں ہماری ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمہیں اپنے گھر میں جبرئیل کے داخل ہونے کی جگہ اور اپنے نانا پر وحی کے نزول کا مقام دکھاتا۔ اے کوفی بھائی! لوگوں نے علم کی پیاس ہمارے ہی گھرانے سے بجھائی ہے۔ پس کیسے ممکن ہے کہ ان کے پاس تو علم ہو اور ہم جاہل اور بے خبر رہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔"

("خطبات، فرمودات و مکتوبات حسینؑ ابن علیؑ" از محمد صادق نجمی، ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی۔ ص ۱۴۷۔۱۴۸)۔

بیعت:

امام نے ولید کو سوال بیعت پر جو معرکۃ الآراء جواب دیا:

"اے امیر! ہم خاندان نبوت اور معدنِ رسالت ہیں۔ ہمارے گھروں پر فرشتوں کی رفت و آمد رہا کرتی ہے اور ہمارے خاندان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اور ہمارے گھرانے سے شروع کیا اور آخر تک ہمیشہ ہمارا گھرانہ اسلام کے ہمراہ

رہے گا۔ لیکن یزید، جس کی بیعت کی تم مجھ سے توقع کر رہے ہو، اس کا کردار یہ ہے کہ وہ شراب خور ہے، بے گناہ افراد کا قاتل ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو پامال کیا اور بر سر عام فسق و فجور کا مرتکب ہوتا ہے۔ مجھ جیسا شخص کسی صورت اس جیسے شخص کی بیعت نہیں کرے گا۔ اب ہم اور تم دونوں آنے والے وقت کا انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے کون خلافت اور بیعت کا زیادہ مستحق ہے۔"

اُن کے جیسا اِس جیسے کو کیسے دیتا اپنا ہاتھ
بیعت کیسے کر سکتا ہے ظلمت سے زہراؑ کا چاند

("خطبات، فرمودات و مکتوبات حسین ابن علی" تالیف محمد صادق نجمی ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی، ص ۳۲)۔

جنت:

روزِ عاشور نمازِ ظہر ادا کرنے اور اپنے سامنے خاک و خوں میں غلطاں سعید ابن عبداللہ اور عمرو ابن قرظہ سے گفتگو اور ان کے سوالوں کے جواب دینے کے بعد امامؑ نے شہادت اور جاں نثاری کے لیے بے تابی سے لمحے گننے والے اپنے بقیہ اصحاب کی طرف رخ کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "اے معزز لوگو! (دیکھو) یہ جنت ہے، جس کے دروازے کھول دیے گئے ہیں، جس کی نہریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور جس کے پھل تر و تازہ اور تیار ہیں۔ یہ جناب رسالت مآبؐ اور اللہ کی راہ میں مارے جانے والے شہداء ہیں جو تمہاری آمد کے منتظر ہیں اور ایک دوسرے کو یہ خوش خبری سنا رہے ہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کی مدد کرو اور حرمِ رسول کا دفاع کرو۔"

("خطبات و فرمودات و مکتوبات حسین ابن علی" تالیف محمد صادق نجمی ترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی، ص ۳۲۶)۔

موت:

(ایک موقع پر جب جناب حرؒ نے کہا کہ میں آپ کو خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے جنگ کا ارادہ کیا تو آپ یقیناً مارے جائیں گے) امامِ مظلومؑ نے فرمایا: "کیا مجھے موت

سے ڈرانا چاہتے ہو، کیا مجھے قتل کرنے کے علاوہ تم کچھ اور کر سکتے ہو؟ میں تمہارے جواب میں وہی چند شعر پڑھوں گا جو "اوس" سے تعلق رکھنے والے مومن بھائی نے اپنے چچازاد بھائی سے کہے تھے، جب اس نے نبی اکرم کی مدد کا ارادہ کیا تھا اور اس کے چچازاد نے اس کے اس عمل کی مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں موت کا انتخاب کروں گا کیوں کہ اگر کوئی جوان دین اسلام اور مقدس مقاصد پر ایمان رکھتا ہو تو پھر موت اس کے لیے کوئی ذلت کی بات نہیں کیوں کہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی جان قربان کر کے ظالموں اور ستم گروں کی مخالفت کرے اور اللہ کے دشمنوں سے دوری اختیار کرے۔ اور میں خود اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں اور ہرگز نہیں چاہتا کہ زندہ رہوں کیوں کہ مجھے ایک سخت جنگ میں ایک بڑے دشمن کا سامنا کرنا ہے۔ اب اگر زندہ رہا تو نادم نہیں ہوں گا اور اگر مر گیا تو مجھے کوئی غم نہ ہوگا اور تمہارے لیے یہی بے عزتی کافی ہے کہ ایسی ذلت آمیز زندگی گزارو۔"

("خطبات، فرمودات، مکتوبات حسین ابن علی" تالیف محمد صادق نجمی، مترجمہ سید علی مرتضیٰ زیدی، ص ۱۷۲، ۱۷۳)۔

موت کے بارے میں آپ نے مزید فرمایا:

"اگر دنیا میں ہمارا یقینی انجام موت ہے اور لازماً ان جسموں کو نابود ہو جانا ہے، تو پھر کیا ایمان اور عقیدے کی راہ میں جان دے دینا، ہر قسم کی دوسری موت سے زیادہ گراں قدر اور بلند تر نہیں ہے؟"

(مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۲۲۳، مناقب، ج ۴، ص ۹۵)

"بے شک اگر یہ بدن آخر کار فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے اور سچ (تو یہ ہے) اگر موت کا عفریت آخر کار ہمیں اپنے جبڑوں میں جکڑ لے گا۔ اگر طے ہے کہ بالآخر موت ہمیں چن لے گی، تو بس کیا اچھا ہے کہ ہم خود ایک شریفانہ اور اللہ کی راہ میں موت کا انتخاب کریں۔"

("کلام امام حسین کی چند کرنیں" تالیف: محسن غرویان۔ ترجمہ سید سعید حیدر زیدی شہید۔ ص ۱۷ اور ۲۳)۔

اجتماعی اصول واسلامی برابری:

جناب عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری جو انصار مدینہ کی اولاد میں سے تھے، بہ ظاہر ان لوگوں میں سے تھے کہ جب حضرت امام حسینؑ نماز ادا فرما رہے تھے تو انہوں نے اپنے آپ کو سپر قرار دے رکھا تھا۔ ان کے بدن پر اس قدر تیر پیوست ہوئے کہ زخمی ہو کر گر گئے۔ وقت آخر تھا، امام مظلومؑ خود ان کے سرہانے پہنچے۔ یہ اس شک میں مبتلا تھے کہ شاید انہوں نے اپنا فرض پورا کیا ہے یا نہیں، تو کہتے ہیں: "آیا میں نے وفا کی یا نہیں؟"

امامؑ بالائے سر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: "اے اللہ اس کی صورت کو سفید فرما۔ اس کی بو کو خوشبو میں بدل دے، اسے نیک لوگوں کے ساتھ محشور فرما، محمدؐ و آلِ محمدؐ اور اس کے درمیان آشنائی برقرار فرما۔ ("استاد مطہریؒ کی حسین شناسی" ترجمہ محمد علی ترمذی۔ ص ۱۰۵)

بیداری ضمیر:

جیسا کہ مضمون کی ابتداء میں عرض کیا تھا کہ جناب امام حسینؑ کی ذات والا صفات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ان تحریروں میں سے ہم نے صرف چند عنوانات پر امامؑ کے نقطۂ نظر کو پیش کیا۔ ایک بات جس پر اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ امامؑ بہت بڑے نفسیات داں بھی تھے۔ بقول علامہ عقیل الغروی مدظلہ العالی قرآن کا موضوع "انسان" ہے۔ چنانچہ قرآنی ہدایت کے مطابق، جناب رسالت مآبؐ اور تمام معصومینؑ کا ہدف انسانی دلوں کو وابستۂ اسلام کرنا تھا۔ دلوں کو منقلب کر دینے والے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ پیش خدمت ہے جسے ہم نے علامہ سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہٗ کی کتاب "شہید انسانیت" (ص ۲۶۳۔۲۶۴) سے چنا ہے:

"دوپہر کا وقت اور گرمی کا موسم، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ ناکہ بندی پر معین فوج کے حلقہ سے بہت دور دور جا رہے تھے۔ اس لیے حرؒ کو آپؑ تک پہنچنے کے لیے غیر معمولی تگ و دو کرنا پڑی اور ریگستان میں بغیر پانی ساتھ لیے ہوئے بہت تیز چلنا پڑا۔

اس لیے یہاں پہنچتے پہنچتے فوج کے سوار اور گھوڑے سب ہی کی پیاس کے مارے حالت تباہ تھی۔ امامؑ اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے، تلواریں حمائل کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ آثار پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور صورت سوال۔ حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپؑ کے لیے دشمن کی موجودہ حالت ناقابل برداشت تھی۔ آپؑ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ ان کو پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کر دو۔ حکم کی دیر تھی، اطاعت امامؑ پر کمربستہ جوان کھڑے ہو گئے اور سب کو سیراب کیا۔ حالت یہ تھی کہ پیالے، لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ راکب و مرکب سب سیراب ہو گئے۔ علی بن طعان محاربی جناب حُرؑ کا ایک ساتھی تھا وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہنچا۔ جب امام حسینؑ نے میری اور میری سواری کی پیاس کو دیکھا تو فرمایا "راویہ (یعنی شتر آبکش کو) بٹھالو۔" میری زبان میں "راویہ" مشک کو کہتے تھے۔ اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا۔ حضرتؑ نے فرمایا "جمل" (یعنی اونٹ) کو بٹھالو۔" میں نے اونٹ کو بٹھایا، حضرتؑ نے فرمایا اب پانی پیو مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہنچتا۔ امامؑ نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو، پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا، تب حضرتؑ خود اٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو بھی سیراب کیا۔

امام حسینؑ کی اس بلند ظرفی کا جو اثر مخالف سردار یعنی حُرؑ کے دل پر قائم ہوا اس کے ظاہر ہونے کا ابھی وقت نہ آیا تھا لیکن کم از کم وہ ششدر رہ گیا ہو گا کہ اس احسان کے بعد اب اس بزرگ فطرت انسان سے کس طرح گفتگو کروں۔ امامؑ نے بھی اپنے فطری استقلال و اطمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے؟"

(اس کے بعد نماز میں شمولیت کی دعوت اور دوسرے امور پر جناب حُرؑ سے امام کی

گفتگو ہے، جسے ہم مضمون میں طوالت کے پیش نظر نہیں لکھ رہے)۔ مدعا یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے کس کس طرح انسان کو بیدار کیا ہے۔ شب عاشور خیمہ گاہ حسینیؑ سے بچوں کی آواز العطش اور حسینؑ کے ماضی کے حسن سلوک نے جناب حرؓ کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ صبح عاشورا اپنی جان ہتھیلی پر لے کر امامؑ کے انصار میں شامل ہو کر بنی نوع انسان کو پیغام دے گئے کہ توبہ کے دروازے ہر انسان پر اس کی آخری سانس تک کھلے ہیں اور وہ زندگی کی آخری ساعتوں میں بھی ان محسنین اسلام سے وابستہ ہو کر اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے۔

دنیا:

سید الشہداء، مظلوم کربلا، حضرت امام حسین علیہ السلام نے دنیا کے بارے میں تین اشعار میں فرمایا:

پہلے شعر کا ترجمہ اور تشریح:

"سمجھ رکھو کہ یہ فانی دنیا جتنی بھی قیمتی ہو (اس دوسرے جہاں کے بالمقابل پست اور بے قیمت ہے) اور جہانِ آخرت بلند مرتبہ اور بیش قیمت ہے۔"

اچھی اور قیمتی چیزوں کی پہچان کا ایک ذریعہ ان کا بری اور بے قیمت چیزوں کے ساتھ موازنہ اور تقابل ہے۔ ہمیں بینائی کی قدر و قیمت اس وقت بہتر معلوم ہوتی ہے جب ہمارے سامنے کوئی نابینا آجاتا ہے۔ جب کسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں تو صحت و سلامتی کی قدر پتہ چلتی ہے۔ اسی طرح امن و عافیت کی قیمت اس وقت واضح ہوتی ہے جب مصیبت اور بے امنی کا مزہ چکھتے ہیں۔

اگر ہم اس مادی دنیا اور اس دنیا کے مظاہر کی اہمیت کو صحیح طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس کا دوسری دنیا (آخرت) کے ساتھ موازنہ کریں تب ہی ہم پر اس کی اہمیت یا بے وقعتی واضح اور نمایاں ہوگی۔

قرآن کریم بھی مختلف مواقع پر دنیا اور آخرت کا باہمی تقابل کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"لیکن تم لوگ زندگانی دنیا کو مقدم رکھتے ہو۔ جب کہ آخرت بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔" ترجمہ: آیات ۱۶۔۱۷، سورۂ اعلیٰ (۸۷)۔

یہ آیت اچھے انداز سے اس دنیا پر آخرت کی برتری کا سبب آشکارا کرتی ہے کیونکہ:

اولاً: عالمِ آخرت کی نعمتوں کو کیفیت کے لحاظ سے بہتر بتاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہانِ آخرت درحقیقت عالمِ معنا اور جہانِ مادّی عالمِ صورت ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ مادّی دنیا وہ ظاہر ہے جس کا باطن آخرت تشکیل دیتی ہے اور یقینی طور پر صورت کے مقابل عالمِ معنا اور ظاہر کے مقابل باطن کا رتبہ اور اختیار کہیں زیادہ اور بلند ہوتا ہے۔

ثانیاً: آخرت کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی اور پائیدار ہیں۔ لہٰذا اصولاً اس مادّی دنیا اور اس کے محدود مظاہر کا آخرت کی لامحدود دنیا سے موازنہ کیا ہی نہیں جاسکتا اور عقل بھی کہتی ہے کہ محدود اور لامحدود کے مابین کوئی نسبت نہیں۔

تاہم قرآن کریم کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ محسوس تر صورت میں بیان کرنے اور ہمارے لیے قابلِ فہم بنانے کے لیے خاطر موازنے اور تقابل کا راستہ اختیار کیا ہے اور دنیاوی نعمتوں کے مقابل اخروی نعمتوں کو دائمی پائیدار اور بہتر اور عالی تر کیفیت کا حامل قرار دیا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس فرمان میں دنیا اور اس کے مظاہر کی بے وقعتی اور بے اعتباری ثابت کرنے کے لیے دنیا اور آخرت کے موازنے کی قرآنی روش سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ فرما کر کہ "سمجھ رکھو کہ یہ فانی دنیا جتنی بھی قیمتی ہو" اس مفہوم کو واضح کیا گیا ہے کہ امام کی نظر میں یہ اہمیت صرف فرضی اور تصوراتی ہے وگرنہ واضح ہے کہ درحقیقت دنیا ناپائیدار اور بے وقعت ہے۔

دوسرے شعر کا ترجمہ اور تشریح:

"اگر حقیقتاً ایسا ہی ہے کہ مال و دولت جمع کرنے کے بعد بالآخر اسے یہیں چھوڑ جانا ہوتا ہے تو

پھر انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ دنیوی مال و دولت کے بارے میں اس قدر بخل سے کام لیتا ہے۔"

بے اشک اگر انسان مستقبل اور معاملات کے انجام سے آگاہ ہو تو اس کے فیصلے اور اقدامات کی کیفیت دوسری ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ بہت سے ایسے کام انجام نہیں دیتا جو بظاہر اچھے نظر آتے ہیں اور اس کے برخلاف بعض اوقات ایسے کام انجام دیتا ہے جو غیر مفید اور بے نتیجہ شمار کیے جاتے ہیں۔

علم و آگہی، عمل کا مقدمہ ہے۔ اگر ایک طالب علم کو اس بات کا یقین ہو کہ اسے سالانہ امتحان میں فیل کر دیا جائے گا، تو اس کا دل پڑھائی کی جانب سے اچاٹ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف اچھے مستقبل کی امید انسان کو ایک اور ہی طرح کا شوق و اشتیاق اور جوش و خروش بخشتی ہے اور اسے عمل اور جدوجہد پر اکساتی ہے۔

اگر انسان حیات اور کائنات کے اختتام اور انجام کے بارے میں تھوڑا سا بھی غور و فکر کرے، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے جدائی کے لمحے کو ذہن میں لائے، اپنے گھر، اپنے باغ، اپنی زمین، اپنی گاڑی وغیرہ سے وداع کے وقت کا تصور کرے، تو یقیناً اس کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گی۔ ان امور سے اس کے انس، الفت اور شدید محبت کا رشتہ کمزور ہو جائے گا۔ اسی بنا پر ائمہ دین کی احادیث میں آیا ہے کہ: کَفیٰ بالموت و اعظاً۔ ایک متوازن مزاج اور نصیحت قبول کرنے والے انسان کے لیے وعظ و نصیحت اور کردار سازی کے لیے موت کی یاد ہی کافی ہے۔

اصولاً اگر انسان موت کے وقت کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھے اور دنیاوی زندگی کا انجام اس کے پیش نظر رہے تو اس کا شعور اس بات کی گواہی دے گا کہ دنیاوی اشیا پر اس کی مالکیت صرف ایک مصنوعی، مجازی اور عارضی مالکیت ہے اور بالآخر وہ بھی اس دنیا کے نظام کے تحت موت کے عفریت کے ہاتھوں ختم ہو جائے گا۔

دولت جمع کرنا ہرگز اس کی مالکیت کا سبب نہیں ہوتا۔ البتہ ممکن ہے ایک طرح کا

تعلق، اضافہ اور اعتباری نسبت وجود میں لے آئے۔ لیکن بہر حال انسان کے لیے حقیقی مالکیت وجود میں نہیں آتی کیونکہ بالآخر یہ ملکیت خود بخود مالک سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس اہم نکتے کو امام عالی مقامؑ نے بخوبی واضح کیا ہے۔ سچ! اگر انسان دنیاوی مال و دولت کی ناپائیداری اور حقارت کو جان لے تو کسی صورت اس کا اسیر نہ ہو، اس سے دل نہ لگائے اور کسی بھی صورت میں حرص، حسد اور بخل جیسی مذموم صفات میں گرفتار نہ ہو۔

تیسرے شعر کا ترجمہ اور تشریح:

"اور اگر دنیا میں ہمارا یقینی انجام موت ہے اور لازماً ان جسموں کو نابود ہو جانا ہے تو پھر کیا ایمان اور عقیدے کی راہ میں جان دے دینا، ہر قسم کی دوسری موت سے زیادہ گراں قدر اور بلند تر نہیں ہے؟"

شہادت کے مسئلے کے جائزے اور اس کی تحلیل کے نتیجے میں ممکن ہے اس کے دو مختلف رخ سامنے آئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس مسئلے کا دو مختلف طریقوں سے سامنا کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اس کا سامنا جذبات و احساسات کے ساتھ کریں اور دوسرا یہ کہ اسے عقلی انداز سے دیکھیں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ ممکن ہے جب ہم کسی واقعے کا سامنا احساسات و جذبات سے مغلوب ہو کر کر رہے ہوں تو یہ ایک خاص قسم کے ردِ عمل کا تقاضا کرے جب کہ اگر ہم اسی واقعے کا سامنا اور اس کا تجزیہ عقلی انداز سے کریں تو وہ اس سے مختلف ردِ عمل کا تقاضا کرے۔

آپ سرِ راہ ایک بچے کو دیکھتے ہیں، جسے ایک عمر رسیدہ شخص پیٹ رہا ہے۔ آپ بے اختیار اس بچے کی حمایت میں آگے بڑھتے ہیں اور اس مارنے والے شخص کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ اس مرحلے میں اس پٹنے والے بچے کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

جو چیز آپ کو اس ردِ عمل اور اس بچے سے ہمدردی کا باعث ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے صرف آنکھوں سے اس حادثے کا مشاہدہ کیا ہے اور جذبات و احساسات کے ذریعہ اس

مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔ اس موقع پر کسی قسم کا منطقی تجزیہ و تحلیل آپ نے نہیں کیا۔

اب اس ابتدائی ردِ عمل کے بعد آپ جستجو کرتے ہیں کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ وہ شخص اس بچے کو کیوں مار رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بچے نے بے وجہ اس راہ گیر شخص کو ایک پتھر دے مارا تھا اور اس سے بدزبانی بھی کی اور بلاوجہ اسے گالیاں دے رہا تھا۔ یہی بدتمیزی اس کی پٹائی ہونے کا سبب بنی۔

اب آپ عقلی تجزیہ اور منطقی فیصلہ کی بنیاد پر اس راہ گیر شخص کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور آپ بھی بچے کو ڈانٹتے ہیں اور ممکن ہے آپ بھی اسے دو ہاتھ رکھ دیں۔

یہ متضاد فیصلے اور ان کے نتیجے میں دو مختلف قسم کے ردِ عمل اس معاملے کو دو مختلف انداز سے دیکھنے کی وجہ سے ہیں۔ مسئلے کو جذبات اور احساسات سے مغلوب ہو کر دیکھنے کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ راہ گیر شخص کو قصوروار ٹھہراتے اور بچے کو حق بجانب اور مظلوم سمجھتے۔ اس کے برعکس مسئلے کا عقلی اور منطقی تجزیہ و تحلیل راہ گیر شخص کو حق بجانب اور بچے کو سرزنش اور پٹائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ واضح ہے کہ مسئلے کا سامنا کرنے کے ان دو طریقوں میں سے عقلی انداز قابلِ قدر اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔

اگر ہم شہادت کے جذبات و احساسات کی نگاہ سے دیکھیں اور اسے سطحی اور سرسری انداز سے لیں تو اس کی ایک خاص شکل سامنے آئے گی۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کی صورت میں شہادت جان کے زیاں، بربادی، نابودی اور آخرِ کار خود اختیاری موت کے سوا کچھ اور نہیں دکھائی دے گی اور اس اندازِ فکر کا تقاضہ یہ ہوگا کہ شہادت پر انتہائی افسوس، غم و اندوہ اور بے صبری کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس نکتۂ نظر کے ساتھ شہادت نہ صرف یہ کہ کسی تقدس کی حامل نہیں بلکہ کراہت و قباحت بھی رکھتی ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ ایک قسم کی خودکشی لگے گی۔ شہادت میں موت انسان کی طرف نہیں آتی ہے بلکہ اس کے برعکس انسان موت کے استقبال کو بڑھتا

ہے اور موت کا انتخاب کرتا ہے۔ جذبات و احساسات سے مغلوب ہو کر اور صرف ظواہر کو دیکھ کر اس طرح موت کا استقبال ایک طرح کا جنون سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر شہادت کے مسئلے کا عقلی تجزیہ و تحلیل کریں تو ہم ایک مختلف نتیجے تک پہنچیں گے۔

بے شک تمام انسانوں کو لازماً موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور کوئی اس سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا، ہم سے پہلے آنے والے گزر چکے ہیں، اس وقت ان میں سے کوئی ہمارے درمیان موجود نہیں۔ دوسری طرف موت کے مختلف اسباب و اقسام ہیں، جیسے حادثاتی موت، (روحانی یا جسمانی) امراض کے نتیجے میں موت، پانی میں ڈوب کے مرجانا، خودکشی کر لینا، پہاڑ یا بلندی سے گر کر مرجانا وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ موت کی ایک خاص قسم بھی پائی جاتی ہے جسے انسان خود اپنی آزادی اور اختیار کے ساتھ منتخب کرتا ہے، یہ عقیدے، آزادی اور انسانیت کی راہ میں اختیاری اور انتخابی موت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ معبودِ حقیقی اور خالقِ کائنات کی راہ میں موت کو قبول کرتا ہے۔

منصف مزاج اور اہلِ معرفت افراد موت کی مختلف اقسام میں سے کون سی موت کا انتخاب کریں گے؟ انسان کے ضمیر اور عقلِ سلیم کی نظر میں کون سی موت افضل ہے؟ پہلی قسم کا مرنا یا عقیدے اور دین کی راہ میں شہادت کی موت کو گلے لگانا؟

اگر ہم تمام مذکورہ مقدمات سے قطع نظر کر کے ایک منطقی قیاس تشکیل دیں، تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب موت لامحالہ ہم سب کے تعاقب میں ہے اور ہمارا مرنا قطعی اور حتمی ہے تو مسلمہ طور پر شہادت، موت کی مقدس ترین اور قیمتی ترین قسم ہے۔

اس تجزیے و تحلیل کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شہادت ایسی موت نہیں جس کا سامنا کرتے ہوئے انسان ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرے، دکھ اور افسوس محسوس کرے، اسے اپنی جان تلف اور برباد ہونا خیال کرے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کے پاس ادراک کی دو قسمیں ہیں، ایک عقل اور دوسری احساس۔ لہٰذا وہ لازماً ادراک کی ان دو قوتوں کے تقاضوں کے مطابق شہادت پر ایک خاص ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسے صرف جذبات و احساسات کی نگاہ سے دیکھنے کا تقاضا، رونا، گڑگڑانا، اضطراب و ناگواری کا اظہار اور اس سے فرار ہے۔ اس مقام پر عقل جذبات و احساسات کی مدد کو بڑھ کر اسے کنٹرول کرتی ہے اور شہادت کے بارے میں اپنی منطقی اور حقیقت پسندانہ تحلیل کے ذریعے انسان کو اطمینان و آسودگی دے کر اس کے دل کو تسلی دیتی ہے اور وہ بخوشی اس کے استقبال کو بڑھتا ہے۔

اس گفتگو کے بعد وہ مناسب وقت آپہنچا ہے جب ہم امام حسینؑ کے تیسرے شعر پر غور کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ اس شعر میں خلاصے کے طور پر اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

> ”بے شک! اگر یہ بدن آخرِ کار فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے، اور یہ اگر موت کا عفریت آخرکار ہمیں اپنے جبڑوں میں جکڑ لے گا۔ اگر طے ہے کہ بالآخر موت ہمیں چن لے گی، تو پس کیا اچھا ہے کہ ہم خود ایک شریفانہ اور اللہ کی راہ میں موت کا انتخاب کریں۔“

دنیا کے بارے میں امام حسین علیہ السلام کا نقطۂ نظر جو انہوں نے روز عاشور فوج یزید کے سامنے پیش کیا:

”اے لوگو! یہ جان لو کہ یہ دنیا فنا اور زوال کی جگہ ہے جو اپنے لوگوں کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتی ہے۔ اے لوگو! تم نے اسلام کے قوانین پہچان لیے اور قرآن کی تلاوت کی اور تم نے یہ جان لیا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے باوجود تم ظلم و عداوت سے رسول کے بیٹے کے قتل پر آمادہ ہو۔ اے لوگو! کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ فرات:

پانی شکمِ مار کی طرح چمک رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور کلب و خنزیر اس سے سیراب ہو رہے ہیں اور اولادِ رسولؐ پیاس سے مر رہی ہے۔ سپاہیوں نے اس کے جواب میں کہا کہ بات نہ کرو۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پانی نہیں ملے گا۔ اس وقت آپ نے اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے فرمایا: ان لوگوں پر شیطان غالب آگیا ہے اور ان سے اللہ کو بھلا دیا ہے۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ یاد رکھو کہ یہ شیطان کے گروہ والے خسارہ اٹھانے والے لوگ ہیں۔ پھر آپ نے چند اشعار ارشاد فرمائے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

اے بدترین لوگو، تم اپنے ظلم و جور میں حد سے بڑھے ہوئے ہو اور تم نے ہمارے بارے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت کی ہے۔

کیا بہترین خلقِ الٰہی نے ہمارے بارے میں تم سے وصیت نہیں کی تھی اور کیا اللہ کے برگزیدہ احمدِ مجتبیٰؐ میرے جد نہیں تھے؟

کیا فاطمہ زہراؑ میری ماں نہیں تھیں؟ اور کیا میرے والد علیؑ نہیں تھے؟ جو رسول خیرالانامؐ کے بھائی تھے۔

اس گناہ پر تم ملعون اور رسوا ہو گئے ہو اور عنقریب جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیے جاؤ گے۔

اس کے بعد آپؑ نے اس خطبۂ مبارکہ کا آغاز فرمایا:

تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے دنیا کو خلق فرمایا اور اسے فنا اور زوال کا گھر قرار دیا اور اسے دنیا والوں کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جانے کی قوت بخشی۔ یقیناً وہی دھوکے میں ہے جسے دنیا دھوکہ دے اور وہی شقی ہے جسے دنیا اپنے فتنوں میں جکڑ لے۔ پس تم لوگ اس دنیا کے دھوکے میں نہ آؤ، اس لیے کہ یہ وہ ہے کہ جو اس پر بھروسہ کرے اس کی امیدوں کو توڑ دیتی ہے اور جو اس کا لالچ کرے اسے ناکام کر دیتی ہے۔ میں

دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ایسے کام پر اکٹھے ہوئے ہو جس نے اللہ کو تم پر غضب ناک کر دیا ہے۔ اس نے تم سے اپنا رخ پھیر لیا ہے۔ اس نے تم پر اپنی ناراضگی کا عذاب ڈال دیا ہے اور تمہیں اپنی رحمتوں سے دور کر دیا ہے۔ پس کتنا اچھا رب ہے ہمارا رب اور کتنے برے بندے ہو تم لوگ۔ تم نے اطاعتِ الٰہی کا اقرار کیا ہے اور تم محمد رسول اللہؐ پر ایمان لائے ہو اس کے باوجود رسول کی عترت و ذریت پر حملہ آور ہو اور انہیں قتل کرنا چاہتے ہو۔ یقیناً شیطان تم پر غالب آ گیا ہے اور اس نے رب عظیم کے ذکر

کو تم سے بھلا دیا ہے۔ تمہارے لیے اور تمہارے ارادوں کے لیے ہلاکت و تباہی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں۔ یہ ظالم لوگ (اللہ کی رحمت سے) دور رہیں۔"

مآخذ

۱۔ جناب محسن غرویان کی کتاب "کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں" مترجمہ سید سعید حیدر زیدی شہید۔

۲۔ عالی جناب علامہ طالب جوہری قبلہ کی کتاب "حدیث کربلا"

حسینؑ کی دعائے عرفہ

''تجلیات'' (شرح دعائے سمات) از علامہ عقیل الغروی کے پیش لفظ (حرفِ تقدیم) میں مرحوم و مغفور علامہ ہدایتی فرماتے ہیں:

''خالق و مخلوق کے درمیان پایا جانے والا مستحکم ترین رشتہ دعا ہے۔ حرفِ دعا میں بندے کی جلا اور تاثیر دعا میں رب کی تجلی مشاہدے میں آتی ہے۔''

سورۂ مومن (۴۰)، آیت ۶۰ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا۔'' اس آیت کی تفسیر میں ڈاکٹر محمد حسن رضوی ''خلاصۃ التفاسیر'' میں فرماتے ہیں: فرزندِ رسولؐ حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرمانا ''مجھے پکارو'' (دعا مانگو) سے مراد اللہ سے دعا مانگنا ہے اور دعا مانگنا افضل عبادت ہے۔ اللہ کے نزدیک اس بات سے افضل کوئی چیز نہیں ہے کہ اس سے مانگا جائے۔ یعنی جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس سے طلب کیا جائے۔ اللہ کے نزدیک اس سے بدتر کوئی بات نہیں ہے کہ انسان اس کی عبادت (اطاعت) کرنے سے تکبر کرے۔ (تفسیر صافی، بحوالہ کافی)

حدیث پیغمبرؐ ہے کہ ''دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے اور آسمان و زمین کو روشن کرنے والی (شمع) ہے۔'' یہ دعا ہے جس سے وہ نہ صرف اپنی حفاظت کرتا ہے بلکہ اپنا دفاع بھی کرتا ہے۔ دعا اور توبہ کی توفیق اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے بہترین نعمت ہے۔ یہ وہ عطا ہے جس کے ذریعہ اللہ نے اپنا اختیار بندے کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ بہت سی دعاؤں میں دو

دعائیں تو ایسی ہیں کہ جن میں خود اللہ دعا کی تاکید اور پھر انہیں قبولیت کی ضمانت دے رہا ہے۔

پہلی دعا، سورۂ نمل (۲۷)، آیت ۶۲۔ (ترجمہ) ''بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کو سنتا ہے، جب وہ اس کو آواز دیتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے، اور تم لوگوں کو زمین کا وارث بناتا ہے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ نہیں! بلکہ یہ لوگ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں۔''

اس آیت کی تشریح تفسیر نمونہ میں اس طرح ہے:

''اگرچہ اللہ تعالیٰ (شرائط کی موجودگی میں) ہر ایک کی دعا کو قبول فرماتا ہے کیوں کہ قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ انسان اپنی آنکھیں مکمل طور پر عالمِ اسباب سے ہٹا کر اپنے دل و جان کو پوری طرح اللہ کے اختیار میں دے دے، سب کچھ اس کی طرف سے جانے، ہر مشکل کا حل اسی کی طرف سے سمجھے اور یہ سب اضطرار کی حالت میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ بعض روایات میں اس آیت کی تفسیر حضرت مہدی (صلوٰت اللہ وسلام علیہ) کے ظہور سے کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک روایت میں ہے: 'اللہ کی قسم! میں مہدیؑ کو دیکھ رہا ہوں کہ حجرِ اسود سے ٹیک لگائے اللہ تعالیٰ کو اپنے حق کی قسم دے کر دعا مانگ رہے ہیں۔ پھر آپؑ نے فرمایا: اللہ کی قسم! قرآن مجید کی آیت امّن یُجیبُ المُضطرّ میں مضطر سے مراد بھی وہی ہیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کی اور حدیث میں ہے کہ یہ آیت مہدیؑ آلِ محمدؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ کی قسم وہی مضطر ہے۔ جب وہ مقامِ ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز بجالائے گا اور اللہ کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہو کر اس سے سوال کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے گا اور اس کی مشکلات کو دور کر کے اسے زمین کا خلیفہ بنائے گا۔''

فرزندِ رسولؐ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے آبائے طاہرینؑ کے حوالوں سے روایت فرمائی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ "یہ آیت (حقیقی اور اولین معنی میں) امام مہدیؑ قائم آلِ محمدؐ کے بارے میں اتری ہے۔ اللہ کی قسم وہی مضطر (بے چین اور بے قرار) ہوں گے، جب وہ مقامِ ابراہیم پر آکر دو رکعت نماز پڑھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعا فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرمائے گا (اور اس کے بعد ان کا ظہور ہوگا) اور سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے حضرت جبرئیلؑ ہوں گے، پھر ۳۱۳ مردان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ (کاش ان میں ہم بھی شامل ہوں)۔ (تفسیر صافی، تفسیر قمی، تفسیرِ نور الثقلین)

دوسری دعا، سورۂ انبیاء (۲۱)، آیت ۸۷ اور ۸۸۔ (ترجمہ) "اور یونسؑ کو یاد کرو کہ جب وہ غصہ میں آکر چلے اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر روزی تنگ نہ کریں اور پھر تاریکیوں میں جاکر آواز دی کہ پروردگار تیرے علاوہ کوئی اللہ نہیں ہے، تو پاک و بے نیاز ہے اور میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے تھا۔ تو ہم نے ان کی دعا کو قبول کرلیا اور انہیں غم سے نجات دلادی کہ ہم اسی طرح صاحبانِ ایمان کو نجات دلاتے رہتے ہیں۔"

جناب یونسؑ کی اس دعا کا پس منظر یہ ہے کہ جناب یونسؑ اپنی امت سے بہت نالاں تھے۔ انہوں نے تنگ آکر اللہ سے اپنی امت پر عذاب نازل کرنے کی درخواست کی۔ اللہ نے دعا قبول بھی کرلی لیکن کسی سبب عذاب کو موخر کردیا۔ اس پر جناب یونس خفا ہوکر دریا کی ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔ کشتی ڈگمگانے لگی تو آپ نے دریا میں چھلانگ لگادی۔ حکم ربی سے ایک بڑی مچھلی نے انہیں سالم نگل لیا۔ جب آپ نے آنکھ کھولی تو احساس ہوا کہ میں نے کیا کیا۔ چنانچہ مذکورہ دعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "ہم اسی طرح صاحبانِ ایمان کو نجات دلاتے رہتے ہیں۔"

تمام تفاسیر میں ان آیات کی تفسیر بہت مفصل ہے۔ تفسیر نمونہ میں لکھا ہے کہ "کذالک

ننجی المومنین (ہم اسی طرح صاحبان ایمان کو نجات دیتے ہیں) کا پُرمعنی جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گرفت اور نجات کے سلسلہ میں جو کچھ حضرت یونسؑ پر گزری کوئی ایک خصوصی فیصلہ نہیں تھا، بلکہ سلسلۂ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب کے لیے ایک عمومی پہلو رکھتا ہے۔" اس آیت کی تشریح میں تفسیر دُرِ منثور میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ: "امام ابن جریر رحم اللہ نے حضرت سعد رحم اللہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا وہ اسم جس کے ساتھ جب بھی دعا کی جائے قبول ہوتی ہے اور جب سوال کیا جائے عطا ہوتا ہے، وہ جناب یونسؑ بن متی کی دعا ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہؐ یہ حضرت یونسؑ کے ساتھ خاص تھی یا تمام مسلمانوں کے لیے ہے؟ فرمایا یہ یونس علیہ السلام کے لیے خاص تھی اور مسلمانوں کے لیے بھی ہے، جب وہ اس کے ساتھ دعا مانگیں۔ کیا تم نے یہ ارشاد نہیں سنا کذالک ننجی المومنین (ہم اسی طرح صاحبان ایمان کو نجات دیتے ہیں)۔ یہ اللہ کی طرف سے شرط ہے اس کے لیے جو اس سے دعا مانگے۔" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اس طرح سے دعا کرے گا اللہ نے اس کو قبول کرنے کی ضمانت دے دی ہے۔

فرزند رسولؐ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "مجھے اس شخص پر تعجب ہے کہ جسے رنج و غم درپیش ہو اور وہ اللہ سے ان الفاظ میں فریاد نہ کرے۔" پھر فرمایا: "جو شخص اپنی مصیبت میں اس آیت: لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین" کے ساتھ دعا مانگے اس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔"

یہ دونوں آیات، آیات کریمہ کہلاتی ہیں۔ ان آیات میں موجود دعاؤں کے ذریعہ بندہ اللہ سے اس کے وعدۂ عنایات کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی رحمت کا طالب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے دعا کو قبول کر لیتا ہے اور اپنے بندۂ مومن کو مشکل سے نجات دلا دیتا ہے۔

انبیاءِ ماسبق میں سے ہر ایک نے دعا و مناجات کی ہے۔ قرآن مجید کی لاتعداد آیات انبیائے کرام کی دعاؤں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت آدمؑ صفوۃ اللہ کی دعا:

سورۂ بقرہ (۲)، آیت ۳۷: "اس کے بعد آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھ لیے تو اس نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں مولانا سید امداد حسین الکاظمی المشہدی یوں رقم طراز ہیں:

"تفسیر صافی، ص ۲۹ اور اصول کافی میں امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ وہ کلمات یہ تھے: 'اے اللہ! محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور ان کی آل میں جو معصوم ہیں ان کے مرتبے کے لحاظ سے میرا رجوع قبول فرما۔ شیعی تفسیر کے علاوہ اہل سنت والجماعت کے ہاں بھی یہی روایت موجود ہے۔ (دیکھو دُرِ منثور، سیوطی، جلد ا، ص ۱۶، سطر ۱)۔ اصول کافی میں منقول دوسری روایت کے بموجب ان کے ساتھ یہ الفاظ بھی تھے۔ "بحق محمدؐ و علیؑ و فاطمۃ والحسنؑ والحسینؑ"

جناب نوحؑ نبی اللہ کی دعا:

سورۂ القمر (۵۴)، آیت ۱۰، (ترجمہ) "تو اس نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، میری مدد فرما۔"

جناب ابراہیمؑ خلیل اللہ کی دعائیں:

سورۂ ابراہیمؑ (۱۴)، آیت ۴۰ اور ۴۱: "اے میرے پالنے والے! مجھے اور میری اولاد کو نماز کا پابند بنا دے اور میری دعا قبول فرما۔ اے ہمارے پالنے والے! جس دن (اعمال کا) حساب ہونے لگے مجھ کو اور میرے ماں باپ اور سارے مومنین کو تو بخش دے۔"

سورۂ شعراء (۲۶)، آیت ۸۳ سے ۸۹: "پروردگار، مجھے علم و فہم عطا فرما اور مجھے نیکوں

کے ساتھ شامل فرما اور آئندہ آنے والی نسلوں میں میرا ذکرِ خیر قائم رکھ اور مجھے بھی نعمت کے باغ (بہشت) کے وارثوں میں بنا دے اور میرے باپ کو بخش دے اور جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کرنا جس دن نہ تو مال ہی کچھ کام آئے گا اور نہ لڑکے، مگر جو شخص اللہ کے سامنے گناہوں سے پاک دل لیے ہوئے حاضر ہوگا (وہ فائدے میں رہے گا)۔"

سورۂ ممتحنہ (۶۰)، آیت ۴: (ترجمہ) "اے ہمارے پالنے والے ہم نے تجھی پر بھروسہ کر لیا ہے اور ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف (ہمیں) لوٹ کر جانا ہے۔"

جناب موسیٰؑ کلیم اللہ کی دعائیں:

سورۂ اعراف (۷)، آیت ۱۲۶: (ترجمہ) "اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر (کا مینہ) برسا دے اور ہمیں اپنی فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لے۔"

سورۂ طٰہٰ (۲۰)، آیت ۲۵ تا ۲۸): (ترجمہ) "پروردگار! تو میرے سینہ کو کشادہ فرما اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان سے (لکنت کی) گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ لیں۔"

سورۂ قصص (۲۸)، آیت ۲۱: (ترجمہ) "پروردگار! مجھے ظالموں کے ہاتھ سے نجات دے۔"

سورۂ قصص (۲۸)، آیت ۲۴: (ترجمہ) "پروردگار!! (اس وقت) جو نعمت تو میرے پاس بھیج دے میں اس کا سخت حاجت مند ہوں۔"

جناب سلیمانؑ کی دعا:

سورۂ نمل (۱۶)، آیت ۱۹: (ترجمہ) "پروردگار!! مجھے توفیق عطا فرما کہ جیسی جیسی نعمتیں تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل فرمائی ہیں میں (ان کا) شکریہ ادا کروں اور میں ایسے نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے اور تو اپنی خاص مہربانی سے مجھے اپنے نیکوکار بندوں میں داخل فرما۔"

جناب ایوبؑ کی دعا:

سورۂ انبیاء (۲۱)، آیت ۸۳: (ترجمہ) "بیماری تو میرے (پیچھے) لگ گئی ہے اور تو تو سب رحم کرنے والوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔"

جناب زکریاؑ کی دعا:

سورۂ آل عمران (۳)، آیت ۳۸: (ترجمہ) "اے میرے پالنے والے! تو مجھ کو اپنی بارگاہ سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، تو ہی دعا کا سننے والا ہے۔"

سورۂ مریم (۱۹)، آیت ۵ اور ۶: (ترجمہ) "پس تو مجھ کو اپنی بارگاہ سے ایک جانشین (فرزند) عطا فرما جو میری اور یعقوبؑ کی نسل کی میراث کا مالک ہو اور اے میرے رب اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔"

جناب یوسف علیہ السلام کی دعا:

سورۂ یوسف (۱۲)، آیت ۱۰۱: (ترجمہ) "اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی میرا مالک و سرپرست ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو مجھے (دنیا سے) مسلمان اٹھا لے اور مجھے نیکوکاروں میں شامل فرما۔"

جناب رسالت مآب کی دعا:

سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) (۱۷)، آیت ۸۰: (ترجمہ) "اے مرے پروردگار! مجھے جہاں پہنچا اچھی طرح پہنچا اور مجھے جہاں سے نکال تو اچھی طرح سے نکال اور مجھے خاص اپنی بارگاہ سے ایک طاقت ور مددگار دے دے۔"

اس آیت کی تفسیر ڈاکٹر محمد حسن رضوی نے "خلاصۃ التفاسیر" جلد ۱۵ ص ۲۳۹۰ میں یوں فرمائی ہے:

"اب رسول کا ایک طاقت ور مددگار کے لیے دعا فرمانا اگر کسی شخص پر صادق آتا

ہے یا وہ طاقت تاریخ میں کسی شخصیت کے لباس میں ظاہر ہوئی، جو ہر ہر جگہ رسولؐ کے لیے مددگار ثابت ہوئی، یہاں تک کہ فرشتوں تک نے ان کی وفاداری اور بہادری کا کلمہ پڑھا تو وہ ایک ہی جوان تھا جس کا نام علی ابن ابی طالبؑ تھا، جس کے لیے جناب جبریلؑ نے پکارا تھا "**لا فتی الا علیؑ لا سیف الا ذو الفقار**" یعنی نہ علیؑ جیسا کوئی جوان ہے نہ ذوالفقار جیسی کوئی تلوار۔"

"صحیفہ علویہ" جناب امیر علیہ السلام کی اور "صحیفۂ کاملہ" جناب علی ابن الحسین زین العابدینؑ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ معصومین نے ہمیں دعاؤں کی صورت میں بندگی کے ایسے ایسے نکتے سمجھائے ہیں کہ اگر ہم انہیں حرز جاں بنالیں تو زندگی میں کسی مشکل کا سامنا نہ ہو اور ہمیں دنیا ہی میں جنت نصیب ہو جائے۔

ان دعاؤں کے بعد ایک دعا یاد آتی جو دلربائے قلوب، سید الشہداء حضرت امام حسینؑ سے منسوب ہے اور وہ ہے:

دعائے روزِ عرفہ:

۹/ ذی الحجہ کی تاریخ تھی، مکہ معظمہ کے قریب عرفات کا میدان تھا اور حجاج بیت اللہ بارگاہِ احدیت میں مصروف حمد و ثنا و مناجات و دعا تھے ایک مرتبہ راوی کی نگاہ دامن کوہ کے اس حصہ پر پڑی جہاں سرکار سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اپنے اصحاب و انصار اور اہل خاندان کے ساتھ مصروف دعا و مناجات تھے۔ عالم یہ تھا کہ دست دعا بلند، رُخ آسمان کی طرف اور زبان مبارک پر کلمات حمد و مناجات۔ چشمِ مبارک سے آنسو جاری تھے اور لہجہ میں ایسا گداز و اندوح تھا جیسے کسی فقیر بے نوا کسی سلطان السلاطین کی بارگاہ میں عرض مدعا کر رہا ہو۔ امت اسلامیہ کے لیے یہ دعا بہترین سرمایۂ نجات و مناجات ہے اور اس سے حمد و ثنا اور عرض مدّعا کے وہ اصول و انداز سامنے آتے ہیں جن کا عام انسان دنیا میں تصور بھی نہیں کر

سکتا۔ رب کریم صاحبان ایمان کو توفیق دے کہ وہ روز عرفہ میدان عرفات میں حاضر ہو کر یا کم سے کم اپنے مقام پہ مصلائے عبادت پہ بیٹھ کر اس دعائے مبارک کی تلاوت کریں اور اس کے مضامین پر توجہ دے کر اپنے اعمال و کردار کی اصلاح کریں۔

پوری دعا سپرد قلم کرنے سے مضمون طویل ہو جائے گا۔ اس لیے امام مظلومؑ کی اس دعا کے چیدہ چیدہ فقرے پیش خدمت ہیں:

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کے فیصلے کو کوئی رد کرنے والا نہیں اور نہ اس کی بخشش کو روکنے والا اور نہ ہی کوئی کاریگر اس جیسی مصنوعات بنا سکتا ہے۔

اے میرے پروردگار! میں تیری کن کن نعمتوں کی گنتی کروں اور ان کو یاد کروں، یا میں تیری کن کن نعمتوں کے شکر کا حق ادا کر سکتا ہوں۔ اے میرے پروردگار یہ تو اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو شمار کرنے والے شمار نہیں کر سکتے یا یاد کرنے والے ان کو یاد نہیں رکھ سکتے، پھر اے میرے پروردگار تو نے جو بلائیں اور سختیاں مجھ سے دور کی ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو بھلائی مجھ پر ظاہر و آشکار ہوئی۔

میں گواہی دیتا ہوں اے اللہ! اپنے ایمان کی حقیقت اور اپنے اٹل ارادوں کی مضبوطی اور خالص اور واضح توحید، اپنے باطن میں پوشیدہ ضمیر، اپنی آنکھوں کی روشنی کی گذرگاہوں کی وابستگی، اپنی پیشانی کی سطح کی لکیروں، اپنی سانس لینے کی نالیوں کے شگافوں، ناک کے آخری نرم حصے کے خزانوں، آواز کھینچنے والے کانوں کے پردوں، اپنے چپکنے اور ٹھیک بند ہونے والے ہونٹوں، اپنی زبان کی حرکات سے نکلنے والے لفظوں، اپنے منہ کے اوپر اور نیچے کے حصوں کے ملنے، دانتوں کے اگنے کی جگہوں، اپنے کھانے پینے کے ذائقہ دار ہونے، اپنے سر میں دماغ کی قرار گاہ، گردن کے رگ پٹھوں کا ایک دوسرے سے ربط کی وسعتوں، سینے کے اندرونی حصے کی مشمولات، میری گردن کے رگ پٹھوں کو سنبھالنے والے

حصوں، میرے قلب کے پردے کو روکنے والے دھاگوں اور میرے جگر کو یکجا کرنے والے اجزا جنہیں پسلیوں کی ہڈیوں نے روک رکھا ہے اور جوڑوں کے بلند حصوں اور اعضاء کے بندھنوں اور انگلیوں کے سروں، اور اپنے گوشت اور اپنے خون، اپنے بالوں، اپنی جلد اور اپنے پٹھوں اور نلیوں اور ہڈیوں اور اپنے مغز اور اپنی رگوں، غرض میرے تمام اعضاء اور جو کچھ زمانۂ شیر خوارگی میں میری جسمانی وضع ہوئی اور جو میرا بار اٹھایا زمین نے، میری نیند میری بیداری اور اپنے رکوع وسجود کی حرکات، ان سب چیزوں پر اگر تیرا شکر ادا کرنا چاہوں اور کوشاں رہوں، تمام زمانوں اور صدیوں میں اور اگر عمر وفا کرے تو بھی میں تیری ان نعمتوں میں سے ایک بھی نعمت کا شکر ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا مگر یہ کہ تیرا فضل واحسان شامل حال رہے جو ہمیشہ تیرا شکر بجالانے کا نیا موجب اور تیری جدید ثناء کا باعث بنے گا۔

جناب یونس علیہ السلام کی دعا(لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین) کو بنیاد بناتے ہوئے سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی دعائے عرفہ میں یہ جملے شامل فرمائے:

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں مغفرت طلب کرنے والوں میں ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں توحید کے ماننے والوں میں سے ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں ڈرنے والوں میں سے ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں تجھ سے خوف رکھنے والوں میں سے ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں امید رکھنے والوں میں سے ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں تیری طرف رغبت رکھنے والوں میں ہوں۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں تحلیل کرنے والوں میں ہوں۔
تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں مانگنے والوں میں ہوں۔
تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں تسبیح کرنے والوں میں ہوں۔
تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔تو پاک ومنزہ ہے۔ بے شک میں تکبیر کہنے والوں میں ہوں۔

اسی دعا میں آگے چل کر آپؑ فرماتے ہیں:

۔۔۔اور ہمیں سعادت عطا فرما اپنی اطاعت کی، تو پاک ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اے اللہ! بے شک تو ہی بے چین لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے اور بُرائی کو دور کرتا ہے۔ اور تو ہی مصیبت زدہ کی فریاد کو پہنچتا ہے، بیمار کو صحت دیتا ہے، مفلس کو مال دار کر دیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے کو جوڑتا ہے۔ چھوٹوں پر رحم کرتا ہے، بڑوں کی مدد کرتا ہے۔ اور نہیں ہے تیرے سوا کوئی سہارا اور نہیں ہے کوئی تجھ پر بالادست۔ تو برتر بزرگی والا ہے۔ اے زنجیر سے جکڑے ہوئے کو آزادی دلانے والے، اے ننھے بچے کو رزق دینے والے، اے خوف زدہ پناہ چاہنے والوں کو بچانے والے۔ اے وہ، جس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ کوئی اس کا بوجھ اٹھانے والا ہے، رحمت نازل فرما محمدؐ اور آل محمدؐ پر، اور مجھے عطا کر آج کی شب اس سے بہتر جو تو نے کسی ایک کو عطا کیا ہے اپنے بندوں میں سے وہ نعمتیں جو ظاہری طور پر مسلسل ہوں اور جن کی تو تجدید کرتا رہتا ہے اور اس بلا سے جو تو دور کرتا ہے اور اس رنج وغم سے جسے تو برطرف کرتا ہے اور اس دعا کو جسے تو سنتا ہے اور وہ نیکی جسے تو قبول کرتا ہے اور جن برائیوں کو تو چھپاتا ہے، بے شک تو لطیف ہے اور ہر

شے سے آگاہ ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے پردہ فرمانے کے بعد اہل بیت اطہار کو کتنا ستایا گیا۔ چونکہ معصوم تھے ان کے لیے یہ سختیاں کچھ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ سانحۂ کربلا کے بعد یہ سید سجادؑ ہی کا جگر تھا کہ وہ نہ صرف زندہ رہے بلکہ رشد و ہدایات کا سلسلہ بھی جاری و ساری رکھا۔ اب ان کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی لیکن انہوں نے دعا کو ہتھیار بنا لیا۔ جب مکہ جاتے تو میزاب رحمت کے نیچے کھڑے ہو کر مناجات فرماتے۔ ان کے محبوں نے ان دعاؤں کو محفوظ کر لیا اور آج ہمارے ہاتھوں میں 'صحیفۂ کاملہ' (یا صحیفۂ سجادیہ) کی شکل میں موجود ہے۔ 'صحیفۂ کاملہ' کو 'زبور آل محمدؐ' کہا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اصل زبور مناجات پر مشتمل ہے اور صحیفۂ کاملہ بھی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں زندگی کے ہر ہر موڑ پر کی جانے والی دعائیں مل جائیں گی۔ سیدالشہداؑ کی دعائے عرفہ کے بعد ہم اس دعا کے چیدہ چیدہ نکات پیش کرتے ہیں جو جناب سید سجادؑ عرفات کے میدان میں نویں ذی الحجہ یعنی روز عرفہ کو فرمایا کرتے تھے:

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔ اے اللہ ہر حمد تیرے ہی لیے زیب ہے۔ اے ایجاد کرنے والے آسمانوں کے اور زمینوں کے، بزرگی و کرم کے مالک! تمام پالنے والوں کے پالنے والے! اور ہر مجازی خدا کے خدا اور ہر مخلوق کے پیدا کرنے والے! اور ہر شے کے وارث! جس کی مثل کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اور نہ اس سے کسی چیز کا علم غائب ہوتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور وہ ہر شے کا نگہبان ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہی یکتا، یگانہ طاق اور اکیلا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بخشش والا ہے، صاحب کرم ہے، بزرگ ہے اور عظمت والا ہے۔ بڑا ہے اور کبریائی والا ہے۔ اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی اللہ نہیں، بلند مرتبہ ہے، بلندی والا ہے۔ سخت عذاب والا ہے۔ اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی اللہ نہیں۔ اپنے عام اور

خاص سب بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔ علم اور حکمت والا ہے۔ اور تو ہی وہ اللہ ہے۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سننے اور دیکھنے والا ہے، ہمیشگی والا اور خبر رکھنے والا ہے اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ سخاوت والا اور سب سے بڑھ کر سخاوت والا ہے۔ ہمیشہ رہنے والا ہمیشگی رکھنے والا ہے۔ اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ ایسا اول ہے جو پہلے ہے، ہر یکتا (ہستی) سے۔ اور ایسا آخر ہے جو ہر شمار کے بعد ہے اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ قریب ہے باوجود اپنی بلندی کے اور بلند ہے باوجود اپنے قرب کے اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ذاتی نیکی اور بزرگی اور کبریائی اور تعریف والا ہے۔ اور تو ہی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ایسا اللہ جس نے اشیاء کو بغیر کسی اصل یا مادہ کے پیدا کیا۔ اور تصویر بنائی جس کی بھی تصویر بنائی بغیر کسی نمونے کے اور نیست سے ہست میں لایا مخلوقات کو بغیر کسی ابتدائی خاکے کے۔ تو ہی وہ ہے جس نے ہر چیز کا اندازا مقرر کر دیا اور ہر شے کو آسان کر دیا جیسا کہ آسان کر دینے کا حق ہے اور خوب تدبیر کے تحت چلایا ان چیزوں کو جو تیرے سامنے ہیں۔ تو ہی وہ خالق ہے کہ تیرے مخلوقات کو پیدا کرنے میں کسی شریک نے تیری مدد نہیں کی اور تیرے امر میں کسی بوجھ بٹانے والے نے تیرا بوجھ نہیں بٹایا اور نہ کوئی تیرا دیکھنے والا اور نہ مثل و نظیر تھا۔۔۔۔۔۔)"

جناب امام زین العابدینؑ کی دعائے عرفہ اور حضرت امام حسینؑ کی دعاؤں میں کس قدر مماثلت ہے اس کا اندازہ صاحبانِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔

مآخذ

ترجمہ ہائے قرآن مولانا حافظ سید فرمان علی، علامہ ذیشان حیدر جوادی، مفسر قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی، تفسیر نمونہ، تفسیر دُرِّ منثور، "صحیفۂ کاملہ یعنی زبور آلِ محمدؐ" ترجمہ سید قائم رضا نسیم امروہوی، "تجلیات" (شرح دعائے سمات) از علامہ عقیل الغروی، "زادِ راہ" مولفہ محمد رضا مرچنٹ۔"

حضرت امام حسینؑ کا آخری خطبہ

حضرت امام حسین علیہ السلام نے نویں محرم کے دن دشمن کی طرف سے مہلت ملنے (یا زیادہ صحیح یوں ہے کہ امامِ مظلومؑ کی طرف سے فوج یزید کو مہلت دینے) کے بعد غروب آفتاب سے قبل (یا نمازِ مغرب کے بعد) خاندان بنی ہاشم کے افراد اور اپنے اصحاب کے سامنے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

''میں اللہ تعالیٰ کی بہترین تعریف وثنا کرتا ہوں اور آسائشوں اور سختیوں میں اسی کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیری حمد بجالاتا ہوں کہ تو نے ہمارے گھرانے کو نبوت کے ذریعہ شرف واحترام عنایت فرمایا اور ہمیں قرآن کی تعلیم دی، ہمیں دین کی سمجھ بوجھ عطا کی اور ہمیں (حق کو سننے والے) کان، (حق کو دیکھنے والی) آنکھیں اور روشن اور نورانی قلب عطا فرمایا، اور ہمیں مشرکوں میں قرار نہیں دیا۔

امابعد، میں نے اپنے اصحاب سے بہتر اصحاب کہیں نہیں دیکھے اور نہ کسی کے اہلِ خانہ اپنے اہلِ بیت سے بڑھ کر باوفا اور حق شناس پائے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو میری طرف سے جزائے خیر عنایت فرمائے۔

میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے عراق بلایا جائے گا اور میں ''عمورا'' اور ''کربلا'' نامی ایک مقام پر ٹھہروں گا اور وہیں شہید کر دیا جاؤں گا۔ اب اس شہادت کا وقت آپہنچا ہے۔ میرے خیال میں کل ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کا

دن ہوگا۔ میں آپ سب کو چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ میں نے آپ سب پر سے اپنی بیعت اٹھالی ہے اور اب آپ لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رات کی تاریکی نے آپ سب کو چھپایا ہوا ہے، اس سے فائدہ اٹھایئے۔ آپ میں سے ہر شخص میرے اہلِ بیت میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ یہاں سے چلا جائے۔ اللہ آپ سب کو جزائے خیر عنایت فرمائے۔ آپ سب اپنے اپنے علاقوں اور شہروں کی طرف چلے جایئے۔ یہ لوگ میرے درپے ہیں اور اگر مجھے مارلیں تو پھر دوسروں سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوگا۔

آخری امتحان:

امام حسین علیہ السلام، جنہوں نے مدینہ سے لے کر کربلا تک کے سفر کے دوران مختلف موقعوں پر اپنی شہادت کا اعلان کیا، اپنے اصحاب سے بیعت اٹھالی اور انہیں جانے کی اجازت دی، شب عاشور آخری مرتبہ ایک بار پھر انتہائی صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان فرماتے ہیں اور "قَدْ قَرُبَ الْمَوْعِدُ" کہہ کر اپنے اصحاب کو بتاتے ہیں کہ اب شہادت کا وقت انتہائی نزدیک آپہنچا ہے، میں نے تم پر سے اپنی بیعت اٹھالی ہے، رات کی اس تاریکی سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے اپنے علاقوں کو چلے جاؤ۔

یہ پیشکش درحقیقت امام حسین علیہ السلام کی طرف سے اپنے اصحاب کی آخری آزمائش تھی۔ اس کے جواب میں امامؑ کے ہر صحابی نے اپنے مخصوص الفاظ کے ذریعہ امامؑ سے اپنی وفاداری اور خون کے آخری قطرے تک اپنی پامردی اور استقامت کا اعلان کیا اور یوں اس آزمائش میں بھی سرخ رو اور کامیاب ہوئے۔

اس موقع پر امامؑ کے باوفا اہلِ بیت اور جاں نثار اصحاب میں سے چند کے بیانات یہاں درج کیے جارہے ہیں:

۱۔ امام علیہ السلام کی تقریر ختم ہونے کے بعد، سب سے پہلے ان کے جاں نثار بھائی حضرت ابوالفضل العباسؑ نے کلام فرمایا اور کہا: "اللہ کبھی ایسا دن نہ دکھائے کہ ہم آپ کو

چھوڑ کر اپنے گھروں کی طرف واپس چلے جائیں۔"

۲۔ ان کے بعد بنی ہاشم کے تمام ہی افراد نے حضرت ابوالفضل العباس کی گفتگو دہرائی۔ امامؑ نے حضرت عقیل کے صاحب زادوں کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم لوگوں کی طرف سے مسلمؑ کی قربانی کافی ہے، تم لوگ چلے جاؤ، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔"

انہوں نے امامؑ کے جواب میں فرمایا: "اگر ہم چلے گئے اور ہم سے پوچھا گیا کہ اپنے مولا اور آقا کو چھوڑ کر کیوں چلے آئے؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟ نہیں اللہ کی قسم ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے، بلکہ اپنی مال، دولت، جان اور اپنی اولادیں آپؑ کی راہ میں قربان کر دیں گے اور آخری دم تک آپؑ کی رکاب میں رہتے ہوئے جنگ کریں گے۔"

۳۔ اس موقع پر جناب مسلم بن عوسجہ نے بھی خطاب کیا اور کہا: "ہم کیسے آپؑ کی مدد سے ہاتھ اٹھالیں؟ اس صورت میں اللہ کے حضور کیا عذر پیش کریں گے؟ اللہ کی قسم میں آپؑ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اپنے نیزے سے آپؑ کے دشمنوں کے سینے چھید ڈالوں گا اور جب تک تلوار ہاتھ میں ہے، ان سے جنگ کروں گا۔ اگر کوئی اسلحہ نہ رہا تو پتھروں سے ان پر حملہ کروں گا، یہاں تک کہ اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دوں گا۔"

۴۔ امامؑ کے ایک اور صحابی جناب سعد ابن عبداللہؓ نے کہا: "اللہ کی قسم ہم ہرگز آپؑ کی مدد ترک نہیں کریں گے، تاکہ اللہ کے حضور ثابت کرسکیں کہ ہم نے آپؑ کے سلسلے میں نبی اکرمؐ کے حق کا لحاظ رکھا ہے۔ اللہ کی قسم اگر مجھے معلوم ہو کہ ستر مرتبہ مارا جاؤں گا اور ہر مرتبہ میرے جسم کو جلا کر راکھ کرنے کے بعد زندہ کیا جائے گا تب بھی آپؑ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا اور ہر مرتبہ زندہ ہونے کے بعد آپؑ کی مدد کروں گا، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ موت صرف ایک ہی مرتبہ آئے گی اور اس کے بعد اللہ کی لازوال نعمتیں ہیں۔

۵۔ جناب زہیر ابن قین نے کہا: "اے فرزند رسولؐ اللہ کی قسم میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کی حمایت میں ہزار بار مارا جاؤں، پھر زندہ ہوں اور پھر مارا جاؤں اور ہر بار میری یہ

آرزو ہو کہ میرے مارے جانے سے آپ یا ان بنی ہاشم کے کسی جوان کی جان بچ جائے۔"

۶۔ اسی اثنا میں امام کے ایک صحابی جناب محمد بن بشیر حضرمی کو خبر ملی کہ ان کا بیٹا قید کر لیا گیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: "تم میری طرف سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے بیٹے کو چھڑانے کی کوشش کرو۔" جناب محمد بن بشیر نے کہا: "اللہ کی قسم! میں کسی بھی صورت میں آپؑ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔" مزید کہا: "اگر میں آپؑ کو چھوڑ دوں تو جنگل کے درندے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی غذا بنا لیں۔"

امامؑ نے انہیں چند قیمتی لباس دیے تا کہ وہ یہ لباس ان لوگوں کے حوالے کر دیں جو ان کے بیٹے کو چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

(یہ چھ جواب تاریخ طبری، ج ۷، ص ۳۲۲۔ تاریخ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۸۵۔ ارشاد شیخ مفید، ص ۲۳۱۔ اعلام الوریٰ، ص ۲۳۵۔ لہوف، ص ۸۱۔ مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۲۴۷ میں موجود ہیں)۔

جب امام مظلومؑ نے بنی ہاشم کے افراد اور اپنے اصحاب کے اس ردعمل کا مشاہدہ کیا اور ان کی زبانی وہ کلمات سنے جو ان کی معرفت، احساس ذمے داری اور امامت سے وفاداری کی دلیل تھے تو انہیں ان الفاظ میں دعا دی: "میں کل مارا جاؤں گا اور آپ سب بھی مارے جائیں گے، کوئی ایک بھی نہ بچے گا، یہاں تک کہ قاسمؑ اور شیر خوار عبداللہ (جناب علی اصغرؑ) بھی باقی نہ رہیں گے۔"

یہ سن کر امامؑ کے اصحاب نے ایک آواز ہو کر کہا: "ہم بھی اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں آپؑ کی مدد کی توفیق دے کر فضیلت بخشی اور آپؑ کے ہمراہ شہادت دے کر عزت و شرافت عنایت عطا فرمائی۔ اے فرزند رسولؐ! کیا ہم اس بات پر خوش نہ ہوں کہ جنت میں آپؑ کے ساتھ رہیں گے۔"

"خرائج راوندی" میں تحریر ہے کہ امام نے ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا اور یک بیک ان سب نے جنت میں اپنے مقام اور ان نعمتوں کو دیکھا جو وہاں انہیں دی جائیں گی۔ (نقل از مقتل مقرم، ص ۲۵۸)۔

ایک اور روایت جو امام مظلومؑ سے منسوب ہے کہ شب عاشور ایک جگہ آپ تشریف فرما تھے۔ ان کے چاروں طرف ان کے تمام انصارانِ باوفا بیٹھے تھے۔ امامؑ گریہ وزاری کے ساتھ فرما رہے تھے: ''اے میرے یار و انصار! یہ جان لو کہ میں جانتا ہوں کہ تم کس لیے اس سفر میں میرے ہمراہی بنے ہو۔ تم جانتے تھے کہ میں ایسی قوم کی طرف جا رہا ہوں جنہوں نے دل وزبان سے میری بیعت کی اور مجھے اپنا امیر بنایا اور دعوت دی لیکن کچھ وقت کے بعد تمہارے دل میں یہ بات بھی آ گئی کہ اس قوم کی محبت میرے ساتھ دشمنی میں بدل گئی۔ شیطان نے ان کے سینوں کو چیر کر مکر وفریب کو بھر دیا اور ان کے عہد ٹوٹ گئے۔

اے مرے انصار جان لو! اس غدار اور مکار قوم کا مقصد سوائے میرے قتل کے اور کچھ نہیں ہے۔ جو شخص میری حمایت کرے گا وہ بھی قتل ضرور ہوگا۔ میرے قتل کے بعد ان کا ارادہ ہمارے خیام کو لوٹنے اور ہمارے اہلِ بیت کو قید کرنے کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی چیز تم سے مخفی نہ ہو بلکہ ہر بات کا تمہیں پہلے سے علم ہو اور اگر سب کچھ جانتے ہو تو پھر ممکن ہے حیا اور شرم تمہارے چلے جانے سے مانع ہو۔ ہم اہلِ بیت کے پاس مکر اور دھوکہ نہیں ہے لہٰذا تمہیں باقاعدہ طور پر آگاہ کرتا ہوں کہ دشمن تمہاری جان لینے کے لیے مورچہ لگا کر بیٹھا ہے۔ جو شخص جانا چاہتا ہے تو رات کے آخری حصے کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن کے چنگل سے نکل جائے اور خطرے سے باہر ہو جائے، ابھی وقت ہے اور رات سے فائدہ اٹھائیں۔ یہاں سے اپنی راہ لیں اور چلے جائیں۔

اور جو شخص دل وجان سے ہماری مدد کرنا چاہتا ہے اور ہم سے مصیبتوں کو دور کرنا چاہتا ہے تو وہ کل بہشت میں ہمارے ساتھ ہوگا اور غضب خدا سے محفوظ ہوگا کیونکہ مجھے اپنے نانا نے خبر دی ہے کہ میں غربت، تنہائی اور پیاس کی حالت میں کربلا کی گرم زمین پر بے گناہ مارا جاؤں گا۔ جو ہماری مدد کرنے والا ہے وہ ہمارے بیٹے قائم آلِ محمدؑ کی مدد کرنے والا ہے اور جو شخص محض زبان سے ہماری مدد کرتا ہے وہ بھی ہمارے ساتھ محشور ہوگا۔''

اس سلسلے میں کچھ باتیں "مقتلِ مطہر" (جس میں آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کی مجالس کے حصۂ مصائب کو جمع کیا گیا ہے) سے:

شبِ عاشور، سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب باوفا کو ایک خیمے میں جمع کر کے ایک نہایت فصیح اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ درحقیقت یہ خطبہ اسی روز عصر تاسوعا (۹ محرم) کو پیش آنے والے واقعات کا ردِ عمل تھا۔ دشمن نے نو محرم کی عصر کو ایک دن کی جو مہلت دی تھی وہ کل عاشور کا سورج طلوع پر ختم ہونے والی تھی اس لیے امامِ مظلومؑ نے صورتِ حال سے آگاہ کرنے اور آخری بار آزمانے کے لیے اپنے اصحاب کو جمع کیا تھا۔ امام زین العابدینؑ روایت کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو جس خیمے میں جمع کیا وہ میرے خیمے کے ساتھ تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ جب تمام اصحاب جمع ہو گئے تو میرے بابا نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمائی۔ "میں اللہ کی بہترین ثنا کرتا ہوں اور راحت اور مصیبت کی ہر گھڑی میں اس کا سپاس گزار ہوں۔" (یہ جملے "میں اس کا سپاس گزار رہا ان دنوں میں بھی جو راحت کے دن تھے اور ان دنوں میں بھی جو مصیبت کے دن ہیں" امامؑ نے مشہور شاعر فرزدق کے جواب میں اس وقت بھی ارشاد فرمائے تھے جب آپؑ کربلا کی طرف گامزن تھے)۔ امامؑ فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں خوشی اور آرام کے دن بھی دیکھے ہیں۔ جیسے وہ دن جب بچپن میں جناب رسالت مآبؐ کے زانوئے مبارک پر اور کبھی دوشِ مبارک پر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھ پر وہ وقت بھی گزرا ہے جب میں دنیائے اسلام کے عزیز ترین بچوں میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ میں اللہ تعالیٰ کا ان دنوں کے لیے شکر گزار ہوں اور آج جب میں مصائب میں گھرا ہوا ہوں تب بھی اسی معبود کا سپاس گزار ہوں۔ مجھے جس صورتِ حال کا سامنا ہے اسے میں اپنے لیے برا نہیں سمجھتا بلکہ خیر سمجھتا ہوں۔ بارالٰہا! ہم تیرے شکر گزار ہیں کہ تو نے ہمارے خاندان کو منصب نبوت کے لیے چنا اور تو نے ہمیں قرآن کے علم سے مالا مال فرمایا۔ یہ ہم ہی ہیں جو قرآن کا کماحقہٗ ادراک رکھتے ہیں۔ بارالٰہا! ہم تیرے سپاس گزار ہیں کہ تو نے

ہمیں دین کی بصیرت عطا فرمائی اور ہمیں دین کا فہم عطا فرمایا یعنی اس کی گہرائیوں تک رسائی بخشی تا کہ ہم اس کی روح اور اس کے باطن کو سمجھ سکیں جو اصل حقیقت ہے۔''

اس کے بعد امامؑ نے اپنے اصحاب اور اہلبیت کے بارے میں تاریخی گواہی دیتے ہوئے فرمایا: ''بلاشبہ میرے اصحاب سے بہتر اور وفادار اصحاب کا مجھے علم نہیں۔'' اس جملے میں امام مظلومؑ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اے میرے اصحاب! تم میرے نانا رسول اللہؐ کے اصحاب سے جوان کی رکاب میں شہید ہوئے افضل ہو۔ تم میرے بابا علی مرتضیٰ کے اصحاب سے بھی افضل ہو چاہے وہ جمل و صفین میں شہید ہوئے ہوں یا نہروان میں کیونکہ جن خاص حالات کا تمہیں سامنا ہے وہ ان کو پیش آنے والے حالات سے یکسر مختلف ہیں۔''

پھر امامؑ نے اپنے اہلِ بیت کے بارے میں گواہی دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اپنے اہلِ بیت سے بہتر، نیک اور صلۂ رحمی کرنے والے اہلِ بیت بھی نہیں دیکھے۔

میرے اہلِ بیت کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور کے اہلِ بیت کو حاصل نہیں۔ گویا امامؑ نے اپنے جاں نثار اصحاب اور اہلِ بیت کے مقام و مرتبے کا اعتراف بھی فرمایا اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

باپ ، بھائی اور نانا نے نہیں پائے رفیقؑ
جیسے مخلص باوفا تھے سب رفیقانِ حسینؑ

مآخذ:

۱۔ ''خطبات، فرمودات و مکتوباتِ حسین ابنِ علی مدینہ تا کربلا'' محمد صادق نجمی۔

۲۔ ''مقتلِ مطہری'' آیت اللہ مرتضیٰ مطہری (مجالس کا مجموعہ)۔

۳۔ ''مدینہ سے مدینہ تک'' آیت اللہ سید محمد جواد ذھنی تہرانی، مترجم حجۃ الاسلام علامہ ناصر مہدی جاڑا۔

فلسفۂ دعا اور امام سجادؑ

اپنے معبود سے کچھ مانگنے کے عمل کو "دعا" کہتے ہیں۔ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ کسی کا بندہ ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے نمٹنے کی اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ اللہ کو اپنا مالک و مختار سمجھتے ہوئے اس کو اپنا ہمراز بنا لے تو یقیناً اس کو اپنے اقدامات میں شریک پائے گا اور بڑے سے بڑے مسئلے کو حل کرے گا۔

"دعا کیوں اور کس لیے؟" کے عنوان سے علامہ نسیم امروہوی، "صحیفہ کاملہ" کے ترجمے کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:

علمائے نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی جبلت اور وجدان میں "تسلیم و سپردگی" کی ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو خاص خاص مواقع پر نہیں بلکہ ہمیشہ اس کے جذبات اور احساسات پر کارفرما رہتی ہے۔ "تسلیم و سپردگی" کی یہی کیفیت ہے جو انسان کو مافوق العادت اور مافوق الفطرت طاقتوں کے سامنے جھکاتی اور کوئی نہ کوئی "معبود" تلاش کر لیتی ہے۔ خواہ وہ شجر حجر ہوں یا برق و باد۔ زمین و آسماں ہوں یا شمس و قمر، جب سے بھی باشعور انسان کا پتہ چلتا ہے، انسانی فطرت کا یہ رجحان اس کی تمام سرگرمیوں پر غالب و کارفرما نظر آتا ہے۔ انسان نے ابھی سوچنا سیکھا ہی تھا کہ ایک یا بہت سی نادیدہ طاقتوں پر وہ ایمان لے آیا۔ گویا اس کی فطرت سلیمہ نے خود اسے ایک معبود کے سامنے جھکا دیا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو "عبادت" کے لیے خلق کیا ہے۔ اس ارشاد قدرت سے

اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان فطرتاً اور جبلۃً عبادت و عبدیت پر مامور ہے۔ اب تک قدیم سے قدیم ترین انسان کے جو آثار وادیٔ نیل، صحرائے افریقہ، صحرائے گوبی اور وادیٔ دجلہ و فرات میں دریافت ہوئے ہیں، ان کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی پر کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ وہ نادیدہ طاقتوں اور پر اسرار قدرتوں کے عقیدہ سے محروم ہوا۔ انسان کا یہی "جبلی رجحان" دعا کا محرک ہے۔ معبود کوئی بھی ہو (حقیقی یا تخیلی) انسان اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور اس کی رضا کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اسی کو دعا کہتے ہیں۔

مناجات اور دعا سے نفسیاتی طور پر انسان میں عبدیت اور بے چارگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس تزکیہ نفس، تطہیرِ اخلاق اور تشکیل کردار کا سبب بنتا ہے اور انسان رفتہ رفتہ "نقصِ کمال اور کمال سے اکملیت" کی طرف بڑھتا ہے۔ دعا و عبادت کے ذریعہ بندہ اور اللہ کے درمیان ایک ربط و تعلق پیدا ہوتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ یہ ربط و تعلق ہی انسان کی تمام روحانی کامرانیوں کا سبب ہے۔ اسلام دنیا میں وہ پہلا مذہب ہے جس میں دعا اور عبادت کو اس درجہ اہمیت دی ہے کہ مسنون نمازوں کے علاوہ مسلمانوں پر پنج وقتہ صلوٰۃ واجب کی ہے جس میں ہر ایک کے خاتمے پر نماز گزار معمولاً دعا کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ خود اندازہ کیجیے کہ جو انسان پانچ وقت اس ایقان کے ساتھ عبادت و دعا میں مصروف ہوگا کہ وہ اپنے معبود کے حضور حاضر ہے۔ اس کے اخلاق و کردار کا کیا معیار ہو جائے گا۔ دوسرے مذاہب میں بھی دعا کو خالق و مخلوق کے درمیان ربط و تعلق کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ دعا کے معنی ہیں "پکار" مصائب کے ہجوم اور مایوسیوں کے نرغے میں کوئی دل اپنے خالق اور معبود کی "پکار" سے خالی نہیں ہوتا۔

قرآن مجید میں اس "پکار" کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ بندوں کو حکم دیا ہے ادعونی استجب لکم (میرے بندو) تم مجھے پکارو میں تمہاری بات قبول کروں گا۔

اس سے زیادہ دعا کی قبولیت کی اور کیا ضمانت ہوگی کہ خود اللہ فرما رہا ہے کہ مجھے پکارو

میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ اللہ کو پکارے تو یقیناً اس کی دعا مستجاب ہوگی۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے: "(اے محمدؐ) جب کہ لوگ تم سے میرے متعلق سوال کریں (کہ وہ کہاں ہے) تو (تم کہہ دو کہ) میں (اللہ تعالیٰ) قریب ہوں۔ پکارنے والے کی آواز کا جواب دیتا ہوں۔ پس لوگوں کو چاہیے کہ میری بات مانیں۔"

ایک اور مقام پہ فرمایا ہے: "سوائے اللہ کے کون ہے جو بندۂ مضطر کی دعا قبول کرے جب کہ (بندہ) اسے پکارے اور خستہ حالی کو دور کر دے۔"

ایک جگہ حکم دیا گیا ہے: ۔"تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ (رو رو کر) اور چپکے چپکے (دل سے لو لگا کر) پکارو۔"

ایک اور آیت میں انتباہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ۔"(اے رسولؐ) کہہ دو کہ اگر تم میرے پالنے والے سے دعا نہ کرتے رہو تو اسے کیا پروا ہے۔"

ایک مقام پر دعا نہ کرنے والے سے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے: ۔"یقیناً وہ لوگ جو مجھے پکارنے میں تکبر سے کام لیتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔"

قرآن پاک کی تاسّی میں رسول اکرمؐ اور ائمۂ امت بھی ہمیشہ دعا کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں۔ جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دعا سے رقّت قلب پیدا ہو کر انسان کا مادّہ قبول بہت جلد انفعال پذیر ہوتا ہے اور اس کے باطن میں، حق سے محفوظ ہونے اور اقدام باطل سے خوف کرنے کی تمام تر قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

جناب سرور کائناتؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ۔"دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے اور آسمان اور زمین کو روشن کرنے والی (شمع) ہے۔"

حضرت علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: ۔"اللہ تعالیٰ زمین والوں کے کل اعمال میں،

دعا کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔''

حضرت امام زین العابدینؑ کے بڑے صاحبزادے امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالٰی کے نزدیک کوئی چیز اس سے افضل نہیں کہ اس (اللہ) سے سوال کیا جائے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اسے طلب کیا جائے اور کوئی شخص اس بندے سے زیادہ اللہ کا مقہور و مبغوض نہیں جو اسے پکارنے میں تکبر کرے اور جو (نعمت) اس (اللہ) کے پاس ہے اسے طلب نہ کرے۔''

امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''(اے مسلمانو) دعا کو اپنے اوپر واجب ولازم سمجھو کیوں کہ اس جیسی کوئی چیز نہ پاؤ گے جس سے تم اللہ کی بارگاہ میں تقرب حاصل کر سکو۔''

آپؑ نے ایک اور مقام پر علا بن کامل سے گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''(اے علا بن کامل) تم پر لازم ہے کہ دعا کرتے رہو، کیوں کہ یہی وہ چیز ہے جو ہر مرض کا علاج ہے۔''

دعا اور جناب علی ابن الحسینؑ:

سانحہ کربلا کے بعد حضرت امام زین العابدینؑ عرصہ ۳۵ سال حیات رہے۔ آپؑ اور آپ کے فرزند حضرت امام محمد باقرؑ واقعہ کربلا کے عینی شاہد تھے۔ ان دونوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ واقعہ کربلا کو اپنے اپنے انداز سے لوگوں تک پہنچایا۔ امامِ سجادؑ نے خطبات کے ساتھ ساتھ دعاؤں کو طریقۂ تعلیم بنایا۔

امام نے مختلف مواقع پر مختلف دعائیں تعلیم کیں۔ آپؑ اکثر مکہ مکرمہ، حج اور عمرہ کے لیے جایا کرتے تھے۔ خانۂ کعبہ کے پردے سے لپٹ کر، کبھی میزاب رحمت کے نیچے اور کبھی ملتزم پر گھنٹوں کھڑے ہو کر دعا اور مناجات کرتے۔ مختلف مواقع پر مختلف انداز سے دعائیں کرتے اور حاضرین کو تعلیم کرتے اور لکھوا دیتے۔ ان ہی دعاؤں کا مجموعہ صحیفۂ کاملہ یا صحیفۂ سجادیہ ہے۔ اس مجموعہ کو زبور آل محمدؐ بھی کہا جاتا ہے۔

صحیفۂ کاملہ میں جو دعائیں درج ہیں وہ مندرجہ ذیل مواقع سے مربوط ہیں:
اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا۔
رسول اکرمؐ پر درود وسلام۔
حاملان عرش اور ملائکہ مقربین پر درود۔
آل رسول علیہم السلام پر درود۔
انبیاء علیہم السلام کے پیروؤں اور ان کی تصدیق کرنے والوں کے لیے طلب رحمت۔
اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے۔
صبح وشام۔
کسی مہم کے پیش آنے یا کسی مصیبت کے نازل ہونے اور بے چین ہو جانے پر۔
مکروہات دنیا، بد اخلاق اور اعمال بد سے پناہ مانگنے کے لیے۔
اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے مغفرت طلب کرنے کے شوق میں۔
اللہ سے پناہ مانگنے کے لیے۔
کاموں کا خاتمہ بالخیر ہونے کے لیے۔
اعتراف گناہ اور طلب توبہ کے لیے۔
اللہ تعالیٰ سے حاجت طلب کرنے کے موقع پر۔
جب کوئی ظلم کرتا یا ظالموں سے کوئی ناپسندیدہ فعل سرزد ہوتا۔
بیمار ہو جانے یا کوئی تکلیف یا مصیبت نازل ہونے پر۔
جب گناہوں کی بخشش چاہتے یا عیوب کی معافی کے لیے عاجزی کا اظہار کرتے۔
جب شیطان کا ذکر ہوتا تو اس سے اور اس کے حامیوں سے پناہ مانگتے۔
جب اللہ تعالیٰ آپؑ سے خوف کو دور کرتا اور جلد مطلب بر لاتا تو اس موقع پر۔
قحط پڑنے پر اللہ سے طلب باراں کے لیے۔

نیکی، اخلاق اور خوبی افعال کے حصول کے لیے۔

کسی بات پر غمگین ہونے یا گناہوں کی فکر ہونے پر۔

سختی اور مشقت کے وقت اور کاموں میں دشواری پڑنے پر۔

اللہ تعالیٰ سے سلامتی طلب کرنے یا سلامتی کا شکر ادا کرنے پر۔

اپنے ماں باپ کے لیے۔

اپنی اولاد کے لیے۔

پڑوسیوں اور دوستوں کو یاد کرتے وقت۔

سرحد والوں کے لیے۔

اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے قرار ہو کر۔

رزق کی تنگی کے موقع پر۔

قرض کی ادائیگی میں مدد طلب کرنے پر۔

توبہ کی یاد میں یا اس کے طلب کرنے کے لیے۔

نماز شب کے بعد۔

اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کے لیے۔

کسی کو گناہ کی رسوائی میں مبتلا دیکھنے پر۔

دنیا دار لوگوں کے قضائے الٰہی پر راضی رکھنے کے لیے۔

بادل اور بجلی کی گرج چمک کی آواز سننے پر۔

ادائے شکر میں کمی کا اعتراف کرنے کے لیے۔

بندے کی ذمہ داریوں کی معذرت، حقوق کی کوتاہی کرنے اور اپنی گردن کو دوزخ سے چھڑانے کے لیے۔

اللہ تعالیٰ سے معافی اور اس کی رحمت طلب کے لیے۔

کسی موت کی اطلاع پر یا موت کا ذکر آنے پر۔
گناہوں کی پردہ پوشی اور امان طلب کرنے کے سلسلے میں۔
قرآن مجید ختم کرنے کے بعد۔
چاند دیکھنے کے موقع پر۔
رمضان المبارک کے آنے پر۔
ماہ رمضان المبارک کو رخصت کرتے وقت۔
عیدین اور جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد۔
نو ذی الحجہ یعنی عرفہ کے دن۔
دشمنوں کے مکر سے بچنے اور ان کے رعب ودبدبہ سے محفوظ رہنے کے لیے۔
اللہ تعالیٰ سے خوف کے موقع پر۔
اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی اور مسکینیت کے اظہار کے لیے۔
اللہ تعالیٰ سے الحاح وزاری کرنے کے موقع پر۔
بارگاہ احدیت میں اپنی عاجزی ظاہر کرنے کے لیے۔
تفکرات کو دور کرنے کے لیے۔
اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں۔
حمد وتمجید باری تعالیٰ کے لیے۔
بارگاہ صمدیت میں اپنی عاجزی ظاہر کرنے کے لیے۔
حضرت آدمؑ پر صب رحمت کے لیے۔
غم واندوہ کی حالت میں اللہ سے معافی کے لیے۔
خوف اور حذر کو رفع کرنے کے لیے۔
آل محمدؐ کے ذکر میں۔

مندرجہ بالا مواقع کی دعائیں صحیفہ کاملہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ ہفتہ کے ہر دن کی علیحدہ علیحدہ دعائیں ہیں۔ مزید یہ کہ مناجاتیں جو قلمی نسخوں سے لی گئی ہیں ان میں توبہ کرنے والوں، شکوہ کرنے والوں، خوف الٰہی رکھنے والوں، امیدواروں، رغبت کرنے والوں، شکر کرنے والوں، اطاعت کرنے والوں، قربتِ الٰہی کا ارادہ کرنے والوں، وسیلہ تلاش کرنے والوں، احتیاج مندوں، ذکر کرنے والوں، پناہ میں آنے والوں اور زاہدوں کی مناجاتیں ہے۔

امامؑ معصوم عن الخطاء ہوتا ہے۔ اوپر دی گئی دعاؤں میں کچھ ایسی دعائیں ہیں جو کوئی خطاکار یا گنہگار ہی مانگ سکتا ہے۔ امامؑ نے یہ دعائیں عوام الناس کو ان کے گناہوں سے بچنے کی رغبت کے لیے، اپنے آپ پر لاگو کر کے تعلیم فرمائی ہیں۔

دعا کے بارے میں معصومؑ کا ارشاد ہے کہ دعا مانگنے کے تین نتائج ہیں۔ اول تو یہ کہ دعا بارگاہ ایزدی میں قبول کر لی جائے گی اور سائل کو وہ شے دے دی جائے گی جو اس نے مانگی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام امور کا مالک و مختار ہے۔ اسے علم ہے کہ مانگی جانے والی شے سائل کے لیے بہتر ہے یا نہیں۔ اگر مطلوبہ شے مانگنے والے کے لیے نفع بخش نہیں ہے تو وہ اسے مصلحتاً نہیں دی جائے گی اور اس کے عوض کوئی اور شے دنیا میں ہی دے دی جائے گی۔ اگر دنیا میں نہ دی گئی تو آخرت میں اس کا عوض اسے بڑھا چڑھا کر عطا کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب بندہ آخرت میں اپنی نامقبول دعاؤں کے عوض اللہ کی بے پناہ عنایتوں کو دیکھے گا تو حسرت کرے گا کہ کاش اس کی کوئی دعا دنیا میں قبول نہ ہوئی ہوتی۔ اللہ کی یہ عنایتیں اس کے اس صبر کے عوض ہوں گی جو اس نے اپنی دعا کے نامقبول ہونے پر کیا تھا۔

ماخذ

صحیفۂ کاملہ یعنی زبور آلِ محمدؐ، ترتیب، ترجمہ، حواشی، علامہ سید قائم رضا نسیم امروہوی اعلی اللہ مقامہ۔

حُسنِ سلوکِ صادقؑ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اگر کوئی ان سے لغو اور بے ہودہ بات کرتا ہے تو اس کے جواب میں مشتعل ہونے کے بجائے بزرگانہ انداز سے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

"اور جب وہ بے ہودہ باتوں سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔" (سورۂ الفرقان ۲۵، آیت ۷۲)

اور جو حضرات ان سے بلند مرتبہ ہیں ان کی توصیف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "اور وہ لوگ غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں (کی کوتاہیوں) سے درگزر کرتے ہیں، اور اللہ تو احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" سورۂ آلِ عمران ۳، آیت ۱۳۴۔

جنابِ رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے۔ جب کہ اس کے مطابق اقدام کرنے پر قادر ہو، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔" (تفسیر نمونہ، ج ۳، ص ۸۴)۔

یہاں بعض اربابِ تفسیر کی یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ:

اللہ تعالیٰ چونکہ غنی (بے نیاز) ہونے کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اس لئے وہ اپنے بندوں کی کوتاہیوں اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اپنے جود و کرم سے نوازتا رہتا ہے ۔۔۔ اگر وہ بندوں کی کوتاہیوں پر ان کو اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیا کرے تو عام

انسانوں میں کون ہے جو کسی فضل کا مستحق قرار پا سکے۔

یہ ذات کردگار کا حلم ہے جس کی بدولت وہ نیکوکار اور گناہ گار سب کو اپنے خزانہ قدرت سے نوازتا رہتا ہے۔ (اور) چونکہ وہ حلیم ہے بندوں کی خطاؤں سے درگذر کرتا رہتا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ان ہی صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی نمایاں ہو۔ (ملاحظہ فرمایئے تفسیر تدبر قرآن جلد اص ۶۱۵)۔

لیکن جن ہستیوں کو پروردگار نے ہمارا ہادی و پیشوا بنایا ہے وہ کمالات انسانی کی اس بلندی پر فائز ہیں کہ صرف کوتاہی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتے صرف لغزشوں پر لغزشیں کرنے والوں سے عفو و درگذر ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ احسان کرتے ہیں جیسا کہ اسی آیت میں اس کی نشاندہی بھی موجود ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" (آل عمران، آیت ۱۳۴)۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام عظمت انسانی کے اس اوج پر ہیں کہ بدکلامی کرنے والوں کو بھی اپنے فضل و کرم سے نوازتے اور ان پر احسان کرتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے ایک ایسے شخص کے ساتھ جس نے آپؑ کے خلاف انتہائی بدزبانی کی تھی، کے ساتھ حسن سلوک فرمایا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل روایت سے کیا جا سکتا ہے۔

ولید بن صبیح کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت امام جعفر صادقؑ کے پاس بیٹھے تھے۔۔ رات کا وقت تھا (ہم لوگ باتوں میں مشغول تھے) کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔

امامؑ نے خادمہ سے فرمایا کہ "دیکھو کون ہے؟" اس نے باہر جا کر دیکھا اور خبر دی کہ "عبداللہ بن علی آئے ہیں۔"

امامؑ نے فرمایا کہ: "انھیں اندر بلا لو۔ پھر ہم لوگوں سے فرمایا کہ "تم لوگ گھر کے اندر

کے حصہ میں چلے جاؤ۔"

ہم لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے اور آنے والے کی آہٹ سنی۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔

جب وہ آنے والا گھر کے اندر داخل ہوا تو امامؑ کی طرف رخ کر کے اس نے انتہائی گستاخانہ بات کی، بے ادبی میں اس نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔

پھر وہ شخص جب چلا گیا تو ہم لوگ بھی اپنی جگہ سے اٹھے اور امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

امامؑ ہم لوگوں سے اسی طرح گفتگو کرنے لگے جیسے پہلے کر رہے تھے، بلکہ اس وقت جہاں گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تھا، آپؑ نے وہیں سے بات شروع کی۔

ہم نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ:

"مولا! آنے والے شخص نے آپ سے ایسی بے ادبانہ گفتگو کی ہے کہ ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی شخص آپ سے اس انداز سے بات کر سکتا ہے، چہ جائیکہ اس نے امامؑ وقت سے ایسی بات کی؟ یہ تو انتہائی جسارت اور حیرت انگیز بات ہے۔ ہم میں سے تو کچھ لوگوں کا ارادہ ہوا کہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس شخص کی خبر لیں۔"

امامؑ نے فرمایا: "چھوڑو (اس معاملے میں) کوئی مداخلت نہ کرو۔"

ہم سے یہ فرمانے کے بعد آپؑ معمول کے مطابق گفتگو میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ رات کا کافی حصہ گزر گیا تو پھر کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ امامؑ نے خادمہ کو حکم دیا کہ وہ دیکھے کون ہے؟

وہ گئی، اور آنے کے بعد خبر دی کہ وہی عبداللہ بن علی دوبارہ آئے ہیں۔

یہ سن کر امامؑ نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ دوبارہ اسی جگہ چلے جاؤ جہاں میں نے

تمہیں پہلے بھیجا تھا۔

اس کے بعد آپؑ نے عبداللہ بن علی کو اندر بلالیا۔

اس دفعہ جو وہ امامؑ کے پاس پہنچے تو نالہ وشیون اور فریاد کرتے ہوئے آئے، روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: "۔۔۔معاف کر دیجئے۔۔۔درگزر فرمایئے۔۔۔"

امامؑ نے فرمایا (! میں نے معاف کیا) اللہ آپ کو معاف کرے یہ (نالہ وشیون کیسا ہے اور) کس بات نے آپؑ کو اس پر مجبور کیا۔؟

عبداللہ بن علی نے کہا کہ جب میں یہاں سے واپس گھر پہنچا اور بستر پر سو گیا، تو دو سیاہ فام (قوی ہیکل) اشخاص میرے پاس آئے، انھوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور ایک نے دوسرے سے کہا کہ اسے جہنم میں ڈال دو۔

چنانچہ وہ لوگ مجھے لے کر اپنے ساتھ چلے۔۔۔راستے میں میں نے جناب حضرت ختمی مرتبت کو دیکھا تو ان سے گزارش کی کہ: اے اللہ کے رسولؐ مجھ پر رحم فرمایئے میں نے جو گستاخی کی ہے اسے معاف کر دیجئے (میں وعدہ کرتا ہوں کہ) آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ اسے آزاد کر دو اور ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا، لیکن ان لوگوں نے جو مجھے جکڑا ہوا تھا اس کی تکلیف، اپنے جسم میں اب بھی محسوس کر رہا ہوں، ایسا لگتا ہے کہ جان نکلنے والی ہے۔ یہ سن کر امامؑ نے اس سے فرمایا کہ: "وصیت کر دیں" (کیونکہ واقعاً آپ کی موت کا وقت نزدیک آچکا ہے)۔

کہنے لگے: "کیا وصیت کروں؟ مال تو میرے پاس ہے نہیں۔ البتہ اہل وعیال زیادہ ہیں اور میرے ذمہ لوگوں کے قرض بھی ہیں۔

امامؑ نے فرمایا" آپ کا قرض اپنے ذمہ (لیتا ہوں) اور آپ کے اہل وعیال کو میں اپنے اہل وعیال میں شامل کرتا ہوں ان کے اخراجات بھی میرے ذمہ ہوں گے۔"

راوی کہتا ہے کہ ابھی ہم لوگ شہر سے نکلے بھی نہ تھے کہ عبداللہ بن علی کا انتقال ہو گیا۔جس کے بعد امام جعفر صادقؑ نے ان کے قرضے ادا کر دیئے،اور ان کے اہل وعیال کے خرچ اپنے ذمہ لے لئے۔(ملاحظہ فرمایئے مناقب ابن شہرآشوب۔الخرائج والجرائح ص۲۳۲۔بحار۶۵،۶۶،۶۷)۔

نامناسب نہ ہوگا،اگر یہاں اس واقعہ کا بھی ذکر کر دیا جائے جس میں ایک شخص نے محض غلط فہمی کی بناء پر آپؑ کے ساتھ سخت گیری کی اور ناحق دعویدار رہا۔مگر آپؑ نے اس کے انتشار ذہنی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے،اسے اپنے جود وکرم اور فضل وعطا سے نوازا۔

کتاب الفنون کی روایت ہے کہ:

حاجیوں میں سے ایک شخص مدینہ منورہ میں (مسجد نبوی کے قریب سو گیا) جب اٹھا اور اسے اپنے پیسے کی تھیلی نظر نہ آئی تو اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ اس کی وہ تھیلی کسی نے چرالی ہے۔

وہاں سے نکلا تو اس نے امام جعفر صادقؑ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور چونکہ وہ امامؑ کو پہچانتا نہ تھا،اپنی پریشان خیالی میں آپؑ کے پاس آکر چمٹ گیا کہ:''میری رقم کی تھیلی آپؑ کے پاس ہے۔''

امامؑ نے پوچھا''اس میں کیا تھا؟''

کہنے لگا:''ایک ہزار دینار۔''

امامؑ اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور ہزار دینار اس کے سپرد کر دیئے۔

جب وہ شخص اپنے گھر گیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ تھیلی تو اس کے گھر ہی پر رکھی ہوئی ہے۔

چنانچہ وہ امامؑ کے پاس معذرت کے لئے آیا اور آپؑ کا دیا ہوا مال واپس کرنے لگا۔امامؑ نے اسے واپس لینے سے انکار کیا اور فرمایا:

''ہم جو کچھ دے دیتے ہیں،پھر واپس نہیں لیتے۔۔۔''(مفہوم ملخص)۔

اس شخص نے واپس جاتے ہوئے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگوار تھے۔؟ اسے بتایا گیا کہ یہ امام جعفر صادقؑ ہیں۔ یہ سن کر کہنے لگا "بے شک اس قسم کے کام یہی حضرات کرسکتے ہیں۔" (بحار الانوار ۴۷، ص ۴۳۔۴۴)

محدث خبیر، حضرت شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ نے ایک زندیق کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کسی شخص نے اس کی الحادی باتوں پر سرزنش کی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا کہ کاش تم امام جعفر صادقؑ کی طرح میری باتیں سنتے اور ان ہی جیسی نرمی سے پیش آتے۔

مفضل بن عمر مسجدِ نبویؐ میں بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں تک یہ آواز پہنچی کہ ابن ابی العوجاء (نامی مشہور دہریہ) کسی مومن سے کفر آمیز باتیں کر رہا ہے، جسے سن کر مفضل برداشت نہ کر سکے اور ابن ابی العوجاء کو چیخ کر مخاطب کیا: "اے اللہ کے دشمن! (مسجد میں بیٹھ کر) تو اللہ کے دین میں الحاد کر رہا ہے اور ذاتِ الٰہی کا انکار کرتا ہے...... ابن ابی العوجاء نے کہا کہ اگر بحث کرنے کے اہل ہو تو آؤ باہم گفتگو کریں۔ اگر تم نے دلیل سے اپنی بات ثابت کر دی تو میں تمہاری متابعت کروں گا اور اگر تمہیں مناظرہ کرنے کے آداب معلوم نہیں ہیں تو مجھے تم سے کوئی بات بھی نہیں کرنی ہے۔ اگر تم حضرت امام جعفر صادقؑ کے پیروکاروں میں سے ہو تو سن لو کہ انہوں نے تو آج تک اس لہجے میں مجھ سے گفتگو نہیں کی، نہ تمہاری طرح مجھ پر ناراض ہوئے نہ انہوں نے مجھے کبھی کوئی نامناسب بات کہی، نہ میری باتوں کے جواب میں کبھی سختی و درشتی سے پیش آئے، جب کہ اس قسم کی باتیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت باتیں انہوں نے مجھ سے بارہا سنی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ انتہائی متحمل مزاج، حلیم و بردبار، عظیم و باوقار، صاحب فکر و دانش اور مستحکم شخصیت کے حامل ہیں جو اگرچہ کبھی اپنے موقف سے نہیں ہٹتے لیکن نہایت نرمی و ملائمیت سے پیش آتے ہیں، نہ کبھی غیظ و غضب کرتے ہیں، نہ ترش مزاجی سے پیش آتے ہیں۔ میں جو کچھ بھی کہوں سنتے رہتے ہیں۔

میں اپنی معلومات کے مطابق دلیلیں پیش کرتا رہتا ہوں۔ جو دلیل و برہان میرے پاس ہوا سے اس انداز سے پیش کرتا ہوں جیسے میں غالب آنے والا ہوں اور انہیں لاجواب کرنے والا ہوں۔ پھر جب میں اپنی بات کر لیتا ہوں، میرے ذہن میں جو دلائل ہوتے ہیں ان کو بھی پیش کر دیتا ہوں تو وہ نہایت نرمی اور خوش کلامی کے ساتھ میرے تمام دلائل کے تار و پود بکھیر دیتے ہیں اور ایسے محکم دلائل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں کہ میرے لیے کسی قسم کی کٹ حجتی کی گنجائش نہیں رہتی اور میں ان کے سامنے بالکل بے بس ہو جاتا ہوں۔ اگر تم ان کے عقیدت مندوں میں سے ہو تو تم پر فرض ہے کہ جس انداز سے وہ گفتگو فرماتے ہیں وہی انداز اختیار کرو نہ کہ اشتعال میں آ کر نا مناسب الفاظ ادا کرنے لگو۔ (توحیدِ مفضل ص ۴۰، منتہی الآمال ص ۲، ۲۲۳، ۲۲۲)۔

ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: "میرا فلاں چچازاد بھائی آپ کا نام لے کر انتہائی نامناسب کلمات کہتا ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ سن کر امامؑ نے اپنے خدمت گار سے وضو کے لیے پانی منگوایا اور وضو کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے سوچا کہ آپؑ اس شخص پر نفرین کرنے جا رہے ہیں (اور نماز پڑھ کر اس کے لیے بددعا کریں گے)۔ مگر میں نے دیکھا کہ امامؑ نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد دست دعا بلند کر کے فرمایا: "پالنے والے، میں نے اسے معاف کیا تیرا فضل و کرم سب سے بڑھ کر ہے تو بھی اسے معاف کر دے اور اس کی بد اعمالی پر اس کی گرفت نہ کرنا۔"

امامؑ گڑگڑا کر اس کے لیے دعائے خیر کر رہے تھے اور میں بحرِ تعجب میں غوطہ زن تھا۔

(مشکوٰۃ الانوار ص ۲۸۰)۔

علامہ ابن شہر آشوب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک غلام کو کسی کام سے بازار بھیجا۔ جب اس کی واپسی میں بہت دیر ہو گئی تو آپ اس کی تلاش میں نکل پڑے دیکھا کہ ایک جگہ لیٹا ہوا سو رہا ہے۔ آپ اسے جگانے کی بجائے اس کے

سرہانے بیٹھ گئے اور پنکھا جھلنے لگے۔ جب وہ بیدار ہوا تو آپ نے فرمایا "یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ رات سونے کے لیے اور دن کام کاج کے لیے ہے، آئندہ ایسا نہ کرنا۔"

آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ مال داروں سے زیادہ غریبوں کی عزت کرتے تھے۔ مزدوروں کی بڑی قدر فرماتے تھے۔ خود بھی تجارت فرماتے تھے۔ اکثر اپنے باغوں میں بنفسِ نفیس محنت بھی کرتے تھے۔ ایک بار بیلچہ لے کر باغ میں کام کر رہے تھے، پسینے سے تمام جسم تر ہو گیا۔ کسی نے کہا بیلچہ مجھے عنایت فرمایئے، میں یہ خدمت انجام دے دوں۔ امامؑ نے فرمایا طلب معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکلیف سہنا عیب کی بات نہیں۔

غلاموں اور کنیزوں پر وہی مہربانی رہتی تھی جو اس گھرانے کی امتیازی صفت تھی۔ اس کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ جناب سفیان ثوری نے بیان کیا ہے۔ ایک بار حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا، دیکھا کہ چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے منع کر رکھا ہے کہ مکان کی چھت پر کوئی نہ چڑھے۔ اس وقت جو میں گھر آیا تو دیکھا کہ ایک کنیز جو بچے کی پرورش پر متعین تھی اسے گود میں لے کر زینہ سے اوپر جا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو خوف زدہ ہو گئی اور بدحواسی میں بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بچہ گرنے سے جاں بحق ہو گیا ہے۔ مجھے بچے کے مرنے کا اتنا صدمہ نہیں جتنا رنج اس بات کا ہے کہ کنیز پر اتنا خوف و ہراس کیوں طاری ہوا۔ امامؑ نے اس کنیز کو پکار کر فرمایا "ڈرو نہیں، میں نے تم کو اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔" اس کے بعد حضرت بچے کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔

مآخذ

(۱) "حیات امام الصادق علیہ السلام" حجۃ الاسلام والمسلمین، علامہ سید رضی جعفر نقوی مدظلہ العالی۔

(۲) "امام علم و عرفان، سیدنا جعفر صادقؑ" جناب آغا امیر حسین۔ ناشر "کلاسیک" مال، لاہور۔

امام رضاؑ اور نظریۂ امامت

ہے دعا سب کی، دکھادے رب، صراط مستقیم
پر نہیں رستہ نظر آتا امامِ وقت کا

''امامت'' اسلام کے پانچ بنیادی اصولوں (توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد) میں سے ایک اہم اور ممتاز اصول ہے، جس کی وضاحت نہ صرف یہ کہ قرآن میں موجود ہے بلکہ متفق علیہ احادیث بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ ''امام'' بارہ جگہ آیا ہے جس کی تفصیل اپنے مضمون ''قرآن اور امامِ زمانہ'' میں ہم عرض کر چکے ہیں۔ (''چراغاں'' حصہ اول ''قندیل'') امام کی صریحی اطاعت کا حکم سورۂ نساء کی آیت ۵۹ میں دیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے: ''اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور جو تم میں صاحبان امر (حکم) ہوں ان کی۔ اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اگر تم اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔'' مختلف تفاسیر میں لفظ ''اولی الامر'' کو متنازعہ بنا دیا ہے اور بہت سوں نے اس سے مراد ''حاکمِ وقت'' لیا ہے۔ جب کہ مسلک امامیہ میں اس سے مراد ائمہ اثناء عشر ہے، جس کے پہلے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب اور بارہویں امام زمانہ محمد ابن حسن عسکری عجل اللہ فرجہ ہیں۔

احادیث کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جو امامت پر نص ہے۔ سب سے واضح حدیث

حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے مروی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ مجھے نجات کے راستے کی ہدایت فرمائیں۔ حضورؐ نے فرمایا: اے ابن سمرہ جب تم دیکھو کہ لوگوں کے درمیان کئی آراء ہیں اور ان میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں تو تمہیں چاہیے کہ علیؑ کا دامن تھام لو، وہ میری امت کا امام ہے اور میرے بعد ان پر خلیفہ ہے...... اس سے میری امت کے امامین اور جوانانِ جنت کے سردار حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ اور حسینؑ کی اولاد سے نو ائمہ ہوں گے جن میں کا نواں میری امت کا قائم ہوگا جو زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ مکمل حدیث مضمون "قرآن اور امام زمانہ" "چراغاں" حصہ اوّل "قندیل" میں پیش کر دی گئی ہے۔

ایک اور حدیث جو تقریباً ہر مسلمان کے علم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرے بعد میرے بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔ ان بارہ خلفاء کے نام (اگرچہ کہیں کہیں وہ ائمہ اثناء عشر سے مختلف ہیں) بھی بعض کتابوں میں موجود ہیں۔

اسی طرح صحابیِ رسولؐ جناب جابر ابن عبداللہ انصاریؓ کو حضور اکرمؐ نے ان بارہ اماموں کے نام بھی تعلیم کر دیے تھے اور یہ بھی بشارت دی تھی کہ تم میرے پانچویں امام (حضرت امام محمد باقرؑ) کے دور تک حیات پاؤ گے اور جب تم اس سے ملاقات کرنا تو میرا سلام اسے پہنچا دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

علامہ سید رضی جعفر نقوی مدظلہ العالی نے اپنی کتاب "سوانح حیات امام علی رضا علیہ السلام" کے باب "امامت کا قرآنی نظریہ اور امامؑ کے صفات" میں رقم فرمایا ہے:

حضرت امام رضاؑ نے امامت کے بارے میں فرمایا: "قوم نے جہالت کی راہ اختیار کی اور دین میں دھوکہ بازی اور فریب خوردگی کا شکار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس وقت تک نہیں اٹھایا جب تک کہ دین (کی ہر بات کو) ان پر کامل طور سے نازل نہیں فر

یا۔ آپ پر جو قرآن نازل کیا، اس میں ہر شے کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں حلال و حرام کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ حدود و احکام کو بھی اور ہر اس بات کو بھی جس کی لوگوں کو ضرورت پیش آسکتی تھی۔ جیسا کہ سورۂ انعام میں ارشاد باری ہے: ''ہم نے اس کتاب میں کوئی بات نہیں چھوڑی۔'' (تو پھر امامت جیسے اہم موضوع کو کیسے چھوڑا جا سکتا تھا، جس سے قیامت تک ہدایتِ بشر وابستہ ہے اور جس کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل میں قدرت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا ہے کہ یوم ندعوا کل اناس بامامھم (ہم اس دن تمام انسانوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے)۔ (سورۂ بنی اسرائیل (۱۷)، آیت ۷۱)۔ امامت کا اعلان اس قدر ناگزیر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ سے سورۂ مائدہ میں فرمایا: ''میرے حبیبؐ! اگر آپ نے یہ بات نہ پہنچائی تو گویا کارِ رسالت انجام ہی نہیں دیا۔'' اس کے بعد حضور اکرمؐ نے ایک لاکھ سے زیادہ حاجیوں اور صحابیوں کے مجمع میں حضرت علیؑ کی ولایت کا اعلان کر دیا۔

اور حجۃ الوداع کے موقع پر جو حضور اکرمؐ کی دنیاوی زندگی کا آخری حصہ ہے، آپ نے حضرت علیؑ کی جانشینی کا اعلان فرما دیا تو اللہ نے سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل کی: ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کیا، تم پر اپنی نعمت تمام کی اور تمہارے لیے دینِ اسلام سے راضی ہوا۔'' (سورۂ مائدہ (۵)، آیت ۳)۔

مسئلۂ امامت سے تکمیلِ دین وابستہ تھی، اور حضور اکرمؐ اس وقت تک تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ آپؐ نے امت کے لیے اسے پوری طرح واضح نہیں کر دیا۔ آپ نے دین کی اہم باتوں کو بیان کیا، ان کے لیے (ہدایت کے) راستے کو واضح کیا، حضرت علیؑ کو ان کے امام کی حیثیت سے (اپنے ہاتھوں پر) بلند فرمایا۔ حضورؐ نے دنیا سے جاتے ہوئے انہیں حق کی سیدھی راہ پر چھوڑا۔ امت کو جن باتوں کی ضرورت تھی، آپؐ نے سب بیان فرما دیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے اپنے دین کو کامل نہیں کیا تو وہ قرآن کی تردید

کرتا ہے۔ اور جو شخص قرآن کی تردید کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ اب یہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ تلاش کریں کہ اللہ نے اپنے حبیبؐ سے کس موقع پر فرمایا تھا کہ اگر آپؐ نے یہ فرمان نہ پہنچایا تو گویا کارِ رسالت انجام ہی نہیں دیا۔ (سورۂ مائدہ (۵)، آیت ۶۷)۔ جب حضورؐ نے وہ فرمان پہنچا دیا تو قدرت کی طرف سے تکمیل دین کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: "کیا یہ لوگ امامت کی قدر و منزلت اور امامت کے لیے اس کا جو مرتبہ ہے اسے پہچانتے بھی ہیں کہ اس کے سلسلہ میں ان کے انتخاب کا کوئی جواز ہو؟"

امامت ایک جلیل القدر عہدہ ہے۔ اس کی شان عظیم ہے۔ مرتبہ بلند ہے۔ اس کے جوانب محفوظ ہیں۔ اس کی گہرائی اتنی عمیق ہے کہ عام انسانوں کے لیے اپنی عقلوں کے ذریعہ اس تک رسائی ممکن نہیں ہے اور نہ اپنی رائے سے اس تک پہنچ سکتے اور نہ اپنے اختیار سے کسی کو امام بنا سکتے ہیں۔ امامت وہ منصب ہے جو اللہ نے مخصوص طور سے حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمایا۔ جب کہ وہ اس سے پہلے نبوّت کے عہدے پر فائز تھے پھر اللہ نے جب امامت کی فضیلت سے ان کو نوازا تو ارشاد ہوا: "میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں" جناب ابراہیمؑ نے خوش ہو کر پوچھا: "اور میری اولاد میں سے؟" جوابِ قدرت آیا: "میرا عہدہ ظالموں کو نہیں مل سکتا۔" (سورۂ البقرہ (۲)، آیت ۱۲۴)۔

اس آیت نے قیامت تک کے لیے فیصلہ کر دیا کہ ظلم کرنے والے کی امامت باطل ہے۔ امامت ان کے لیے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہو۔

اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو یہ اعزاز بھی عطا فرمایا کہ ان کی اولاد میں سے منتخب اور معصوم ہستیوں کو امامت کے عہدے پر فائز کیا۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: "اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ و یعقوبؑ عطا کیے۔ سب کو صالح قرار دیا اور انہیں امام بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ اور ان کی طرف وحی بھیجی، نیک کاموں کے انجام دینے، نماز قائم کرنے

اورزکوۃ ادا کرنے کی اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔" (سورۂ انبیاء آیت ۷۲ و ۷۳)۔

امامت ہمیشہ نسلِ ابراہیمؑ میں رہی۔ ایک کے بعد دوسرا معصوم اس کا ورثہ دار بنتا رہا۔ صدیوں یہی سلسلہ رہا۔ یہاں تک کہ حضرت ختمی مرتبتؐ اس کے حق دار قرار پائے۔ جیسا کہ ارشاد ربِ العزت ہے: "یقیناً ابراہیمؑ سے قریب تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کا اتباع کیا اور یہ پیغمبر اور صاحبانِ ایمان ہیں اور اللہ مومنین کا سرپرست ہے۔" (سورۂ آلِ عمران (۳)، آیت ۶۸)۔

اس طرح جب حضور اکرمؐ تشریف لائے تو امامت کا وہ منصب جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی معصوم اولاد کے لیے عطیۂ پروردگار تھا، آنحضرتؐ کا مخصوص حق قرار پایا۔ اور آپؐ نے حکمِ الٰہی کے مطابق اور اس دستور کی پیروی کرتے ہوئے اپنے بعد کے لیے حضرت علیؑ کو امام قرار دیا۔ پھر ان کی اولاد میں سے اللہ کے منتخب کردہ معصومین جن کو اللہ نے خصوصی علم و ایمان عطا فرمایا ہے اس کے حق دار قرار پائے، جن کے علم و ایمان کے بارے میں ارشادِ قدرت ہے کہ وہ روزِ قیامت لوگوں کو مخاطب کریں گے۔ چنانچہ فرمایا: "وہ صاحبانِ علم و ایمان لوگوں سے کہیں گے کہ تم لوگ کتابِ الٰہی کے مطابق روزِ حشر تک ٹھہرے رہے ہو۔" (سورۂ روم (۳۰)، آیت ۵۶)۔

اب یہ منصبِ امامت حضرت علیؑ کی اولاد میں ہی قیامت تک رہے گا کیونکہ حضور کرمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، جس کی طرف اس عہدے کے منتقل ہونے کا امکان ہوتا۔

حضرت امام رضاؑ کے فرمانِ مقدس سے یہ بات واضح ہے کہ امامت کا جلیل القدر عہدہ خالقِ کائنات نے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمایا جو اس زمانے کے سب سے افضل انسان بھی تھے اور انبیائے کرامؑ میں ہمارے نبیؐ کے بعد ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ جلیل القدر عہدہ صرف افضل ترین انسانوں کو عطا فرماتا ہے۔

اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا: "امامت درحقیقت انبیاء کی منزلت اور اوصیاء کی

میراث ہے۔ امامت تو اللہ کی خلافت اور رسولؐ کی جانشینی ہے۔ اس کے بعد امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی مسند ہے۔

امام دین کی مہار اہلِ اسلام کا نظام، دنیا کی صلاح (وفلاح) اور مومنین کی عزت ہے۔ امامت اسلام کی بلند (مرتبہ) بنیاد اور اس کی اعلیٰ شاخ ہے۔ امام ہی کے ذریعہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد (غرض جملہ ارکان دین) کی تکمیل ہے۔ (اور انفال وغیرہ) کی فراوانی، صدقات، احکام وحدود کا نفاذ، سرحدوں اور اطراف وجوانب کی حفاظت (کے تمام امور) امامؑ کے ذریعہ انجام پذیر ہوتے ہیں۔

ان کلمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس ہستی کو اللہ نے امامت کے بلند مرتبہ پر فائز کیا ہے اس کا وجود دین اور دنیا کے لیے کس قدر ناگزیر ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے انتہائی فصاحت وبلاغت کے ساتھ امامؑ کے مراتب اس طرح بیان فرمائے:

☆ امام اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام ہی رکھتا ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرتا ہے۔ اللہ کے دین کی طرف سے دفاع کرتا ہے اور اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت ودانائی، شیریں نصیحت اور بلیغ دلیل وبرہان کے ذریعہ دعوت دیتا ہے۔

☆ امام چمکتے ہوئے چاند، روشن چراغ، تابندہ نور اور اس ستارے کی مانند ہے جو گھٹا ٹوپ رات کی تاریکیوں، صحراؤں، بیابانوں اور سمندروں کی طغیانیوں میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔

☆ امام ایک حرارت بخش ابھری ہوئی بلند زمین پر ہے، جو بھی اس سے ایمان کی گرمی حاصل کرنا چاہے۔

☆ ہلاکت خیز مواقع پر بھی وہی رہنما ہے، جو اسے چھوڑے گا ہلاک ہوگا۔

☆ امام ابرِ باراں، موسلا دھار بارش، روشن آفتاب، پھیلی ہوئی زمین، ابلتے ہوئے چشمے، پانی کے مخزن اور چمن کے مانند ہے۔

☆ امام جیسے ایک امانت دار دوست، نرم دل باپ، شفیق بھائی اور سختیوں میں بندوں کی پناہ گاہ کی مانند ہے۔

☆ امام روئے زمین پر اللہ کا امین، اس کے بندوں پر حجت، دنیا والوں کے لیے اللہ کا جانشین، اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور حرم الٰہی کا دفاع کرنے والا ہوتا ہے۔

☆ امام گناہوں سے پاک، عیوب سے بری، علم کے ساتھ مخصوص، حلم سے آراستہ، دین کا نظام اور اہلِ اسلام کی عزت ہوتا ہے۔ منافقین اس سے ناراض رہتے ہیں۔ وہ کافروں کو برباد کرنے والا ہوتا ہے۔

☆ امام زمانے میں یکتا ہوتا ہے۔ کوئی مرتبہ میں اس کے قریب نہیں ہوتا، نہ کوئی عالم اس کی ہمسری کرسکتا ہے، نہ اس کا کوئی بدل پایا جاتا ہے اور نہ کوئی مثل ونظیر۔ ہر صفت سے مخصوص جس کے لیے اس نے نہ کوئی مطالبہ کیا نہ اکتساب۔ بلکہ فیاض مطلق نے اسے خاص طور سے مرحمت فرمائی۔ پھر کون ہے جو امام کی صحیح معرفت رکھتا ہو چہ جائیکہ اس کا انتخاب کرسکے۔

☆ افسوس! افسوس! عقلیں قاصر، ہوش وخرد ناکام، دانش مندی حیران اور نگاہیں شکست خوردہ ہیں۔ صاحبان عظمت (اس کے مقابلے میں) کوتاہ قامت۔ حکمت مآب حیرت زدہ۔ اربابِ حلم عاجز، ماہرین خطابت کی زبانیں گنگ، دانش ور بے بس، شاعر خاموش۔ ادیب درماندہ اور امام کی کسی شان یا اس کے فضائل میں سے کسی فضیلت کو بیان کرنے کی کسی صاحب فصاحت و بلاغت کے اندر طاقت ہی نہیں

ہے۔ سب اپنے قصور و عاجزی کے معترف ہیں۔

کیسے اس کی توصیف ہو سکتی ہے، یا اس کی ذاتی خصوصیات کو بیان کیا جا سکتا ہے، یا اس کے امر کا ادراک کیا جا سکتا ہے یا ایسا شخص حاصل کیا جا سکتا ہے جو اس کی جگہ پوری کرے اور اسی جیسی افادیت کا مالک ہو؟ ایسا کہاں ہو سکتا ہے اور کیسے ممکن ہے جب کہ وہ ستارے کی طرح ہے جس تک لوگوں کی رسائی نہیں، نہ بیان کرنے والے اس کی توصیف کر سکتے ہیں۔ پھر کسی کے لیے اسے منتخب کرنا کہاں ممکن ہے؟ عقلیں وہاں تک کب پہنچ سکتی ہیں؟ اور اس کے مثل کہاں پایا جا سکتا ہے؟ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ آلِ رسولؐ کے علاوہ کہیں اور ایسی شخصیت پائی جا سکتی ہے؟ اللہ کی قسم! ان لوگوں کے نفسوں نے ان کو دھوکہ دیا۔ اور باطل نے ان کے ساتھ فتنہ انگیزی کی ہے جو یہ لوگ ایک دشوار گذار چوٹی کی طرف چڑھنے کی کوشش کرنے لگے جس کے نتیجے میں ان کے قدم لڑکھڑا کر کھائی میں گر گئے۔

ایک اور جگہ فرمایا: ''کسی مومن یا مومنہ کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہے اور جو اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ واضح طور سے گمراہ ہے۔'' (سورۂ احزاب (۳۳)، آیت ۳۶)۔

آگے چل کر امامؑ نے مزید فرمایا: ''لوگوں کو امام منتخب کرنے کا حق کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اسے اللہ منتخب کرتا ہے۔''

امام وہ عالم ہے جہاں جہالت کا گزر نہیں۔ وہ پاسبان ہے جو تھکتا نہیں۔ پاکیزگی و طہارت، زہد و عبادت، علم و بندگی کا معدن ہے۔ رسولؐ کی دعوت سے اختصاص رکھنے والا (پھر) بتولِ معصومہ کی نسل سے ہوتا ہے۔ اس کے سلسلۂ نسب میں کوئی شائبہ نہیں، نہ حسب میں کوئی اور اس کا ہم پلہ ہے۔ نسب تو قریش کا ہے۔ اس کا سب سے اشرف سلسلہ عبد مناف کی شاخ ہے جو علم میں بلند اور حلم میں کامل ہیں۔ رہنمائی کے اصول سے آراستہ

اور تدبیر و سیاست سے آشنا ہیں۔ ان کی اطاعت فرض ہے، وہ حکم الٰہی سے قیام کرنے والے بندوں کو (اخلاص کے ساتھ) نصیحت کرنے والے اور اللہ کے دین کے محافظ ہیں۔

اللہ کی طرف سے جن لوگوں کو ہدایت بشر کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، ان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ خاص توفیق عطا کرتا ہے۔ انہیں اپنے علم و حکمت کے خزانے سے وہ کچھ عطا کرتا ہے جو دوسروں کو نہیں دیتا۔ اس لیے ان کا علم ان کے زمانے کے تمام لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔'' ارشاد باری ہے: ''کیا جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے، زیادہ اتباع کا حق دار ہے یا وہ جو کسی کی رہنمائی کے بغیر ہدایت نہیں پاسکتا؟ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ کیسا فیصلہ کرتے ہو؟''

یہ بھی ارشاد قدرت ہے کہ: ''جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دے دیا گیا''

(سورہ بقرہ، آیت ۲۶۹)۔

طالوت کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ''اس میں شک نہیں کہ اللہ نے ان کو تم پر منتخب قرار دیا اور انہیں علم اور جسم میں برتری عطا کی ہے اور اللہ جسے چاہے اپنی سلطنت عطا کرے۔ اللہ گنجائش والا، خوب واقف کار ہے۔'' (سورۂ البقرہ (۲)، آیت ۲۴۷)۔

اور اپنے حبیب کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔'' (سورۂ نساء (۴) آیت ۱۱۳)۔ اور نسل پیغمبرؐ سے جو اہلِ بیت طاہرینؑ آنے والے تھے ان کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ''اللہ نے جن لوگوں کو اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے، کیا ان سے یہ لوگ حسد کرتے ہیں؟ تو ہم نے اولاد ابراہیم کو کتاب و حکمت اور عظیم سلطنت عطا کی تھی۔'' (سورۂ نساء (۴) آیت ۵۴)۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے الٰہی نمائندوں کے بارے میں ایک جامع اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو لوگوں کے معاملات کی اصلاح کے

لیے منتخب کرتا ہے تو اس کے لیے اس کے سینوں میں خصوصی کشادگی پیدا کرتا ہے۔ ان کے قلب میں حکمت کے چشمے جاری کرتا ہے اور انہیں الہامی علم سے نوازتا ہے جس کے بعد وہ کسی جواب سے عاجز نہیں رہتے اور نہ راہِ صواب (حق بات) ان سے الگ ہوتی ہے۔"

وہ معصوم ہوتے ہیں، انہیں (اللہ کی خصوصی) تائید حاصل ہوتی ہے۔ توفیق الٰہی شامل حال رہتی ہے اور وہ اس کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ خطا و لغزش وغیرہ سے محفوظ ہوتے ہیں اور یہ ان کے لیے اللہ کا خصوصی لطف و کرم ہوتا ہے تا کہ وہ بندوں کے لیے حجت الٰہی بنیں اور مخلوقات پر اس کی طرف سے گواہ ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے عطا کرتا ہے اور اللہ عظیم فضل والا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بندے بھی اس بات پر قادر ہیں کہ جو کچھ اللہ عطا کرتا ہے، وہ بھی کسی کو عطا کر سکیں؟ اور کسی کو ہادی منتخب کر لیں؟ اور جس کو منتخب کریں اس میں یہ صفات پیدا ہو جائیں؟ خانۂ کعبہ کی قسم ان لوگوں نے حق سے تجاوز کیا اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا، جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں، جب کہ اس میں ہدایت بھی ہے، شفا بھی۔ لیکن انہوں نے اسے ایک طرف ڈال کر اپنی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ نے ان کی مذمّت کی، ان سے ناراض ہوا۔

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: "اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو ہدایتِ الٰہی کے بجائے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والے لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔" (سورۂ قصص، آیت ۵۰)۔

ایک اور جگہ فرمایا: "ان لوگوں کے لیے بربادی ہے اور ان کے اعمال غارت ہو گئے۔" (سورۂ محمدؐ (۴۷)، آیت ۸)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا: "۔۔۔ (یہ لوگ) اللہ اور صاحبان ایمان کے نزدیک سخت نفرت کے حقدار ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر مغرور اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔"

(بحوالہ حیاۃ الامام علی بن موسیٰ الرضاؑ: باقر شریف قرشی)۔

امامت کے لیے دلائل بہت سے ہیں، کوئی مانے یا نہ مانے۔ موٹی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وقت معلوم تک کی مہلت دی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو بہکاتا رہے۔ یہ اللہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا تدارک کرے یعنی جب تک شیطان اپنا کام کرے اس وقت تک ایک ہادی کا وجود بھی رہے جو انسان کی ہدایت کرتا رہے۔

جو ہٹائے سیدھی صراط سے، اسے دیکھے بن ہیں یہ مانتے
انہیں شیطنت پہ یقین ہے پہ یقین راہ براں نہیں

مآخذ

"سوانح حیات امام علی رضا علیہ السلام" از حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید رضی جعفر نقوی، مدظلہ العالی۔

امام عسکریؑ اور نظریۂ غیبت

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو اس امر کا بخوبی علم تھا کہ آپ کا فرزند بحکم خدا زمین پر نظام حکومت الٰہیہ قائم کر کے اسے پوری دنیا میں نافذ کرنے، محروموں اور کمزوروں کی مدد کرنے اور ان کو خوف و ہراس کو سکون و اطمینان میں بدل کر فقط خدائے یگانہ کی پرستش کو باقی رکھنے کے لیے پردۂ غیبت میں چلا جائے گا۔ چنانچہ آپ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ اپنے بیٹے کی غیبت کے لئے فضا ہموار کریں، کیوں کہ لوگ ظاہری اور حیاتی معرفت و ادراک کے عادی ہو چکے تھے۔ لہٰذا محسوسات کے عادی افراد کا وسعت فکری سے ہم کنار ہونا ایک مشکل کام تھا۔

امام علیہ السلام کے دور کا معاشرہ، فکری و روحانی انحراف و زوال کے باعث ایمان کی گہرائی اور فکری بلندی کے اس مقام تک پہنچنے سے عاجز تھا۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ امامؑ کی غیبت کا مسئلہ امت کی تاریخ میں ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ امام آخر الزماںؑ کے بارے میں گزشتہ پیشین گوئیاں نیز تعداد و تسلسل کے ساتھ مروی صحیح اور متواتر احادیث کا سلسلہ رسول اکرمؐ پر ختم ہوتا تھا انھیں صحاح کے مولفین نے بھی نقل کیا ہے جو اس دور یا اس سے بھی گزشتہ ادوار کے لوگ تھے اور ان میں بخاری، مسلم، احمد بن حنبل وغیرہ بھی شامل تھے۔

''نظریۂ انتظار'' کو عام لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے میں ان احادیث کو بڑا دخل تھا۔ اس کے علاوہ ان احادیث پر لوگوں کا عقیدہ بھی ان کے ایمان کی گہرائی، فکری وسعت اور مذہبی اعتقاد کے مطابق تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ روایات فقط اسی حد تک

امامؑ کے لئے معاون تھیں کہ یہ لوگوں کو ایک طرف تو نظریہ غیبت کو ماننے پر آمادہ کرتی تھیں اور دوسری طرف اس بات کو واضح کرتی تھیں کہ وہ صاحب ہستی آپ کے فرزند حضرت مہدی علیہ السلام ہیں۔

امام مہدی علیہ السلام کے والد کی حیثیت سے امام حسن عسکریؑ کی سب سے مشکل ذمہ داری لوگوں سے یہ منوانا تھا کا غیبت کا مرحلہ آچکا ہے اور اس کے مظہر آپ کے فرزند حضرت مہدیؑ ہیں۔ یقیناً یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا کیوں کہ عام لوگوں کے ایمان اور نظریات کو غیبت کے بارے میں اچانک دھچکا لگنے والا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی عام شخص کا ایک چیز پر غیر معینہ مدت کے لئے ایمان رکھنا، جب کہ اس کی زندگی میں اس کے اثرات مرتب نہ ہوں، اور بات ہے لیکن کسی ایسے غیبی امر پر ایمان رکھنا جسے اس کے اعتقاد کے مطابق اس کی زندگی میں عملی جامہ پہننا ہو، دوسری بات ہے۔ یہ مسئلہ اس بات کا متقاضی تھا کہ امام حسن عسکریؑ اس فکری بحران اور ذہنی دھچکے کی شدت کو کم کرتے ہوئے بغیر کسی شک و تردید کے لوگوں کو مذکورہ امر کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے حتی المقدور سعی فرماتے۔ نیز اپنے اصحاب اور حامیوں کو اس حقیقت سے وابستہ رہنے کا خوگر بناتے۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ آپ ایک ایسی بیدار نسل کی تربیت کے خواہاں تھے، جو آنے والی نسلوں کی تربیت کے لئے بنیادی کردار ادا کرتی اور اپنی کوششوں سے غیبت صغریٰ و غیبت کبریٰ کی تاریخ رقم کرتی۔

جب ہم ان مسائل، ان سنگین حالات جن کا آپ اور آپ کے اصحاب کو سامنا کرنا پڑا، نیز مہدویت کے انقلابی نظریہ کی ترویج جو حکام کی نظر میں ان کے وجود کے لئے خطرناک اور ان کی حکومت کے خلاف بغاوت و نافرمانی سے عبارت تھا، کی اہمیت پر نظر کرتے ہیں تو یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ امام علیہ السلام کو کس قدر باریک بینی کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی ضرورت تھی۔ نیز یہ کہ اس

نظریۂ غیبت کی طرف دعوت دینے کا کام کس قدر مشکل تھا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے امام حسن عسکری علیہ السلام نے اصولوں کو اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دیا۔ اوّل یہ کہ چند مخصوص افراد کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی نظروں سے امام مہدی علیہ السلام کو پوشیدہ رکھنا، دوسرے یہ کہ نظریۂ غیبت سے لوگوں کو آگاہ کرنا، اس سلسلے میں انھیں اپنی شرعی ذمہ داریوں سے باخبر بنانا اور غیبت کے تقاضوں کا آشنا اور خوگر بنانا۔

اس دوسرے اصول کے تحت امام حسن عسکریؑ نے اپنے فرمودات اور بیانات سے لوگوں کو مستفید کیا۔ یہ اقدام ان فرمودات اور تعلیمات کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جن کے ذریعہ رسول اکرم اور ائمہ معصومینؑ نے بشارتیں دی تھیں۔

اس بارے میں میں امام حسن عسکریؑ کے بیانات تین طرح کے ہیں۔

(الف) عام بیان۔ مثلاً امام کے ظہور اور آپ کی عالم گیر حکومت کے قیام کے بعد آپ کی صفات وخصوصیات کا ذکر۔ جیسا کہ آپ نے اپنے ساتھی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"جب وہ قیام کریں گے تو اپنے علم (علم لدنی) کی بنا پر لوگوں کے فیصلے کریں گے، جس طرح حضرت داؤدؑ فیصلے کیا کرتے تھے اور انھیں گواہوں کی ضرورت نہ ہوگی۔" (ارشاد ص ۳۴۳)

(ب) "نظریہ مہدویت" کا تقاضا حالات کو بدلتا ہے۔ اس حقیقت کے ذیل میں آپ نے فرمایا:

"جب امام مہدیؑ خروج کریں گے تو وہ مساجد کے اندر تعمیر شدہ خصوصی منبروں اور حفاظتی محرابوں کو گرانے کا حکم دیں گے۔" (مناقب ج ۳ ص ۵۲۶۔)۔

واضح رہے کہ اس قسم کے محراب خلفاء کی حفاظت اور لوگوں پر ان کے رعب ودبدبے میں اضافہ کی غرض سے بنائے جاتے تھے۔

(ج) اپنے اصحاب اور حامیوں کی عام رہنمائی، تاکہ انھیں نظریۂ غیبت کے عام پہلوؤں

سے روشناس کیا جا سکے، نیز معاشرتی لحاظ سے انھیں اس طرح تیار کرنا کہ وہ مستقبل میں امامؑ کی غیبت وجدائی سے پیدا ہونے والے تلخ حالات کا سامنا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام حسن عسکریؑ نے ابن بابویہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں فرمایا:

''تم پر لازم ہے کہ تم صبر وتحمل کے ساتھ قیام مہدی کا انتظار کرو۔ کیوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا سب سے بہترین عمل امام مہدیؑ کا انتظار ہے۔ ہمارے شیعہ مسلسل غم واندوہ کا شکار رہیں گے، یہاں تک کہ میرے بیٹے کا ظہور ہوگا اور وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر گئی ہوگی۔ اے ابوالحسنؑ بن علی! تم بھی صبر کا مظاہرہ کرنا اور ہمارے شیعوں کو بھی صبر کی تلقین کرنا۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے اس کا مالک بناتا ہے۔ (مناقب ج ۳ ص ۵۲۷)۔

ظاہر ہے کہ اگر قبل از وقت تیاری کے بغیر غیبت واقع ہوتی تو یہ امر لوگوں میں ایک غیر متوقع بحران پیدا کرتا، لہٰذا امام حسن عسکریؑ نے امت کو ذہنی طور پر آمادہ و بیدار کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ کار اپنایا تاکہ لوگ مذکورہ اسلوب کو بغیر کسی حیرت واستعجاب کے آسانی سے قبول کرلیں اور اس سلسلے میں غیر مناسب اعتراضات نہ کریں۔

اس نظریہ کی تیاری اور منصوبہ بندی کی ابتدا امام علی نقیؑ کے دور میں ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ نے اکثر معتقدین سے فقط خطوط اور دستخط شدہ تحریروں کے ذریعہ رابطہ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ (اثبات الوثیہ ص ۲۶۲)۔ نیز ان کی نظروں سے پوشیدہ رہنے لگے تھے تاکہ اپنے شیعوں کو بتدریج مذکورہ روش کا عادی بنائیں۔ اس طرح عملی طور پر آپ کے اصحاب ومعتقدین کو خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ قائم کرنے اور سوالات پوچھنے کی عادت ہو گئی۔ (ارشاد ص ۳۲۳)۔ اسی طرح امام حسن عسکریؑ کا اپنے حامیوں کے امور کو اپنے نمائندوں اور وکیلوں کے ذریعہ چلانا بھی نظریہ غیبت کے لئے فضا کو سازگار بنانے کا ایک طریقہ تھا۔

آپؑ کے مواعظ و نصائح:

روایات میں حضرت امام حسن عسکریؑ کے مواعظ و ارشادات، وصایا اور نصائح کے علاوہ تقریباً پچاس کلمات قصار کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کے ایک ایک لفظ میں رشد و ہدایت کا ایک دریا کوزے میں بند ہے۔

۱۔ جب امور ارادۂ الٰہی کے مطابق انجام پاتے ہیں تو فریاد کس بات کی ہے۔

۲۔ مومن کا وجود مومن کے حق میں برکت اور کافر کے حق میں پروردگار کی حجت ہوتا ہے۔

۳۔ احمق کا دل اس کی زبان پر اور عقلمند کی زبان اس کے دل میں ہوتی ہے۔

۴۔ غضب ہر شر کی کنجی ہے۔

۵۔ سب سے کم آرام حسد کرنے والے کے مقدر میں ہوتا ہے۔

۶۔ واقعاً متقی وہ ہے جو شبہات میں احتیاط سے کام لے۔

۷۔ خبردار! جس رزق کی ضمانت دی جا چکی ہے اس کی تلاش فرائض سے غافل نہ کر دے۔

۸۔ جو ظہور میں حد سے بڑھ جاتا ہے وہ خود بخود کمزور ہو جاتا ہے۔

۹۔ جس صاحب عزت نے حق چھوڑ دیا وہ ذلیل ہو گیا اور جس ذلیل نے اسے لے لیا وہ صاحب عزت ہو گیا۔

۱۰۔ جاہل کا دوست خستہ حالی ہے۔

۱۱۔ دو باتوں سے بالا تر کوئی شے نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان اور برادرانِ ایمانی کی حاجت روائی۔

۱۲۔ بچپنے میں بیٹے کی باپ کے حق میں جسارت آگے چل کر اسے عاق بنا دیتی ہے۔

۱۳۔ رنجیدہ کے سامنے خوشی کا اظہار بے ادبی ہے۔

۱۴۔ جس کے بغیر زندگی بُری لگے وہ زندگی سے بہتر ہے اور جس کے آنے پر موت اچھی لگے وہ موت سے بدتر ہے۔

۱۵۔ کسی عادی شخص کا عادت سے الگ کر دینا ایک طرح کا معجزہ ہے۔

۱۶۔ تواضع وہ نعمت ہے۔ جس پر حسد نہیں کیا جاتا ہے۔

۱۷۔ کسی کا احترام اس طرح نہ کرو کہ وہ زحمت محسوس کرے۔

۱۸۔ جس نے خاموشی سے نصیحت کی اس نے انسان کی عزت کی اور جس نے علی الاعلان نصیحت کی اس نے اسے عیب دار بنا دیا۔

۱۹۔ مومن کے لیے بدترین بات یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی رغبت ہو جو اسے ذلیل کر دے۔

۲۰۔ ادب کے لیے یہ کافی ہے کہ جس چیز کو دوسرے کے لیے بُرا سمجھو اس سے خود بھی پرہیز کرو۔

۲۱۔ خاموش ہوشمند سے ہوشیار رہو۔

۲۲۔ اگر تمام اہل دنیا ہوشیار ہو جاتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔

۲۳۔ وہ دشمن تدبیر میں کمزور ہے جو دشمنی کا اظہار کر دے۔

۲۴۔ بہترین خدائی وہ ہے جو تمھاری بُرائی کو نظر انداز کر دے اور تمھارے احسانات کو یاد رکھے۔

۲۵۔ صورت کا حسن ظاہری جمال ہے اور عقل کا حُسن باطنی جمال ہے۔

۲۶۔ جو خدا سے مانوس ہو جاتا ہے وہ انسانوں سے مانوس نہیں ہوتا ہے۔

۲۷۔ جو بندوں سے نہیں ڈرتا ہے وہ اللہ کا خوف بھی نہیں رکھتا۔

۲۸۔ تمام خبائث کو ایک گھر میں بند کر دیا جائے تو اس کی کنجی جھوٹ ہے۔

۲۹۔ جب دل آمادہ ہو تو اسے باتیں بتاؤ اور جب بیزار ہو جائے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔

۳۰۔ جس سے خیر کی امید ہے اس سے ملحق ہو جانا اس بات سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ رہے جس کے شر سے محفوظ نہیں ہے۔

۳۱۔ جس نے غصہ کو پینے کا مزہ نہیں حاصل کیا وہ دل کی راحت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

۳۲۔ جہالت دشمن ہے اور بردباری حکمت۔

۳۳۔ کریم کا انعام محبوب بناتا ہے اور ذلیل کا احسان ذلیل بنا دیتا ہے۔

۳۴۔ جس کی عادت تقویٰ ہو اور جس کا زیور فضل و کرم ہو وہ ہمیشہ دشمنوں پر بہترین تعریف کے ذریعہ فاتح رہے گا۔

۳۵۔ جس نے غیر مستحق کی مدح کی اس نے اپنے کو متہم کر دیا۔

۳۶۔ نعمت کا عرفان صرف شکر گذار کو ہوتا ہے اور نعمت کا شکریہ صرف صاحب عرفان ادا کرتا ہے۔

۳۷۔ بیداری سے نیند کی لذت بڑھ جاتی ہے اور بھوک سے کھانے کے مزہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳۸۔ اللہ کی بارگاہ میں حاضری ایک سفر ہے جس کے لیے رات میں راستہ طے کرنا ضروری ہے۔

۳۹۔ جسے منع کرنا نہیں آتا ہے اسے عطا کرنا بھی نہیں آتا۔

۴۰۔ اس سے خلوص کا مطالبہ نہ کرو جس سے تمھیں خود خلوص نہیں ہے اور اس سے نصیحت کی توقع نہ کرو جس سے بدظنی رکھتے ہو۔ اس لیے کہ دوسرے کا قلب بھی تمھارے ہی جیسا ہے۔

۴۱۔ بلاسبب ہنسنا جہالت کی علامت ہے۔

۴۲۔ کلامِ الٰہی کا کلام بشر پر وہی شرف ہے جو خود اللہ کا تمام کائنات کے مقابلے میں ہے۔

۴۳۔ تواضع کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جس کے پاس سے گذرو اسے سلام کرو اور مجلس میں بلند ترین مقام پر نہ بیٹھو۔

۴۴۔ محبت کے لیے سب سے زیادہ حق دار وہ ہے جس سے سب سے زیادہ امید رکھی جائے۔

۴۵۔ سب سے زیادہ کمر توڑ وہ ہم سایہ ہوتا ہے جو نیکی کو چھپا دیتا ہے اور بُرائی کا اعلان کر دیتا ہے۔

۴۶۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اسم اعظم سے اتنا ہی قریب ہے جس قدر آنکھ کی سیاہی سفیدی سے قریب ہوتی ہے۔

۴۷۔ جھگڑا مت کرو کہ حسن چلا جائے اور زیادہ مذاق نہ کرو کہ لوگ جری ہو جائیں۔

۴۸۔ جو کسی مجلس میں اپنے مقام سے کم پر راضی ہو جائے اس پر اللہ اور ملائکہ کی طرف سے مسلسل رحمت کا نزول رہتا ہے جب تک مجلس برخاست نہ ہو جائے۔

۴۹۔ شرک لوگوں کے دلوں میں اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی رفتار سے زیادہ آہستہ چلتا ہے۔

۵۰۔ مقدرات زور آوری سے نہیں ٹلتے ہیں اور رزق طمع اور لالچ سے نہیں حاصل ہوتا ہے۔ اپنے نفس کو مقدرات کے لیے ہموار کرو اور یہ سمجھ لو کہ حاصل اتنا ہی ہوگا جتنا لکھ دیا گیا ہے۔

ماخذ

۔ "ذکر و فکر" علامہ سید ذیشان حیدر جوادی۔

۔ علامہ فروغ کاظمی اعلی اللہ مقامہٗ کی کتاب "تفسیر اسلام" مطبوعہ عباس بک ایجنسی، لکھنؤ۔

مباہلہ میں کیا ہوا؟

مباہلہ تاریخ اسلام کا وہ شاندار باب ہے جو پنجتن پاک علیہم السلام کے فضائل کی منہ بولتی تصویر ہے۔ جس کا مشاہدہ حضور اکرمؐ کے دور کے تمام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام غیر مسلم افراد نے بھی کیا۔ قرآن مجید نے اس کو بیان کیا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ تمام صحابہ اکرام نے اس کی تصدیق کی۔ یہ واقعہ حدیث کساء سے مربوط ہے۔ لیکن کساء کا واقعہ چونکہ گھر کے اندر ایک چادر کے گھر کی بات تھی لہٰذا اسے مشکوک بنانے اور آیہ تطہیر سے علیحدہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر بات وہی ہے کہ ع۔ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ان پانچ ہستیوں کو جو مرتبہ اعلیٰ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا اسے دنیا کی کوئی طاقت دروغ گوئی، طاقت، ظلم یا کسی بھی طریقہ سے ختم تو کیا کم بھی نہیں کرسکتی۔

آیئے سب سے پہلے مختصراً اس واقعہ کا پس منظر دیکھتے ہیں۔ دعوت اسلام کے بعد ایک زمانہ حضور اکرمؐ کا مخالف ہوگیا۔ مدینہ منورہ سے کچھ حامیانِ اسلام کے خطوط اور وہاں آنے کی دعوتیں آرہی تھیں۔ یہاں مکہ میں شعب ابوطالبؑ کے پرآشوب ماہ و سال گزارنے اور جناب ابوطالبؑ اور جناب خدیجہؑ کے گزرنے کے بعد حضور اکرمؐ پر ان کے جدی وطن کی زمین تنگ کردی گئی۔ آخرکار آپؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کا فیصلہ کیا۔ مدینہ میں آپ کا پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی کی بنیادیں رکھی گئیں۔ لیکن کفار اور یہودیوں کی طرف سے جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق، جنگ خیبر اور بہت سی جنگیں آپؐ

پر مسلط کی گئیں جن کا آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کبار اور سب سے بڑھ کر جاں نثار بھائی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے بڑھ کر مقابلہ کیا۔

جب ذرا امن و امان کی فضا بحال ہوئی تو آپؐ نے آس پاس کے علاقوں میں دعوت اسلام کے قبول کرنے کے لیے خطوط ارسال کیے اور دور دراز علاقوں میں اسی مقصد کے لیے وفود بھیجے۔ ایسا ہی ایک دعوت نامہ آپؐ نے نجران، جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی، بھیجا۔

اس دعوت پر بنی نجران کی طرف سے ایک وفد آیا جس میں ان کے قبیلے کے بڑے بڑے علماء اور سردار تھے۔ یہ سب لوگ زرق برق کپڑوں میں یعنی ریشم و اطلس میں ملبوس تھے۔ ان کے گلوں میں قیمتی سونے چاندی اور ہیروں کے ہار پڑے تھے گویا وہ اس وقت حضور اکرمؐ پر اپنی امارت اور دولت کی ہیبت طاری کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہاں تو ایک افضل البشر ہونے کے باوجود سادہ لوح بوریا نشین فاقہ کش رسول تھا۔ آپؐ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنے صحابہ کبار سے محوِ گفتگو رہے۔ یہ سب بہت حیران و پریشان ہوئے۔ آس پاس کے لوگوں سے پوچھا کہ کیا بات ہے، رسول اکرمؐ ہمارا استقبال کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ سب نے کہا کہ اس کا سبب سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ اگر جاننا ہی چاہتے ہو تو حضرت علی ابن ابی طالب علیہم السلام کے پاس جاؤ اور معلوم کرو کیونکہ وہ آپؐ سے بہت قریب اور حضورؐ کے مزاج آشنا ہیں۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ سے حضور کی بے اعتنائی کا سبب پوچھا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا یہ زیب و زین، یہ ریشم و اطلس و کمخواب، زیورات وغیرہ خواتین کو زیب دیتے ہیں، مردوں کو نہیں۔ آنحضرت کو یہ نمود و نمائش بالکل پسند نہیں۔ آپ سادہ ملبوس میں بغیر زیورات وغیرہ کے تشریف لایئے، حضورؐ آپ کا خیر مقدم کریں گے۔

اگلے دن وہ سب سادہ ملبوس میں آئے۔ آنحضرتؐ نے بڑھ کر استقبال کیا۔ اپنے پہلو میں بٹھایا اور نہایت اخلاق اور سادگی سے اسلام کی دعوت دی اور کہا کہ اللہ وحدہٗ

لاشریک ہے۔ نہ اس کو کسی نے جنا نہ اس نے کسی کو جنا۔ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہر گز نہیں۔ ایسا کہنا بہت بڑا شرک ہے۔ عیسائیوں نے کہا کہ ہر جان دار کا باپ ہوتا ہے پھر بتایئے حضرت عیسیٰ کا باپ کون تھا؟

ان مباحث کا تفصیل سے ذکر قرآن مجید کے تیسرے سورے آلِ عمران کی ابتدائی ۸۰ (اسی) آیات میں کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّ العزت ہوا اے رسولؐ ان سے کہہ دیجیے کہ حضرت عیسیٰ کی مثال آدمؑ جیسی ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا اور پھر کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔ پھر آیت ۶۱ میں ارشاد ہوا: ترجمہ، علامہ ذیشان حیدر جوادی:۔ "پیغمبرؐ علم کے آجانے کے بعد جو لوگ آپؐ سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجیے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزندوں، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر اللہ کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت قرار دیں"

یہاں ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ مفسرین نے "ابنآءنا" اور "نسآءنا" کے معنی بالترتیب بیٹے اور عورتیں لیا ہے جب کہ بعض مفسرین اور مترجمین نے "انفسنا" کے معنی مختلف لیے ہیں۔ تقابل کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی:

۔۔۔۔۔تو اے محمدؐ! اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں۔۔۔۔۔

۲۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلویؒ:

۔۔۔۔۔ان سے فرمادو آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹے اور تمھارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمھاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمھاری جانیں پھر مباہلہ کریں۔۔۔۔۔۔۔

۳۔ مولانا وحید الدین خاں:

۔۔۔۔۔ان سے کہو کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو، اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو۔ اور ہم اور تم خود بھی جمع ہوں۔ پھر ہم مل کر دعا کریں۔۔۔۔

لفظ "انفسنا" کے لغوی معنی جو ہم نے "قرآن مجید کا عربی۔اردو لغت" مرتبہ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد میں دیکھے تو یہ تھے: "اپنی جانیں، ہماری جانیں"

قطع نظر لفظ انفسنا کے اردو ترجمے کے آیئے اب اس آیت کی عملی تفسیر:

دعوت مباہلہ کے بعد حضور اکرمؐ مقررہ وقت پر پہنچے تو منظر یہ تھا کہ حضور اکرمؐ کی گود میں حضرت امام حسینؑ، حضرت امام حسنؑ کی انگلی تھامے ہوئے، پیچھے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا اور سب سے پیچھے برادر وفادار حضرت علی ابن ابی طالبؑ۔

از روئے حکمت علیؑ نے اس جگہ رکھا قدم
اے بنو نجران جس جا نقشِ پا زہراؑ کا ہے

علی اظہار

مباہلہ میں آنے سے پہلے صورت حال یہ تھی کہ مسجد نبویؐ میں بنی نجران سے مباحثہ کرتے ہوئے کئی روز ہو گئے تو وحی الٰہی آئی جو سورہ بقرہ کی آیت ٦١ میں بیان ہوئی، جس کا ترجمہ اوپر درج ہے۔ حضور اکرمؐ اس فکر میں تھے کہ مباہلے میں کس کس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ۲۴ ذی الحج کی صبح آپؐ جناب ام سلمیٰؓ کے گھر تشریف لائے۔ جناب فاطمہ زہراؑ وہیں تھیں۔ آپؐ نے بیٹی سے فرمایا کہ میں اپنے بدن میں کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یمنی چادر دے دو۔ آپؐ وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ جناب زہراؑ فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرۂ مبارک چودھویں کے چاند کی طرف چمکنے لگا۔ ذرا دیر بعد میرا بڑا بیٹا حسنؑ میرے پاس آیا، سلام کیا اور کہا اے امی جان میں آپ کے پاس اپنے جدّ بزرگوار جناب رسالت مآب کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے کہا "بے شک! تمھارے نانا جان

یعنی چادر اوڑھے آرام کر رہے ہیں"۔ جناب امام حسنؑ قریب گئے، اجازت لے کر چادر میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح میرا دوسرا بیٹا حسینؑ گھر میں داخل ہوا، مجھے سلام کیا، پھر نانا کو سلام کیا اور اجازت لے کر چادر میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد میرے سرتاج حضرت علیؑ گھر میں آئے، مجھے اور بابا کو سلام کر کے اور اجازت لے کر چادر میں داخل ہو گئے۔ ان سب کے بعد اجازت لے کر میں بھی چادر میں آ گئی۔ جب ہم پانچوں چادر میں اکٹھے ہو گئے تو حضورؐ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "اے اللہ! بس میرے اہلِ بیت یہی ہیں۔ یہی میرے خاص الخاص آدمی ہیں، جن کا گوشت میرا گوشت، جن کا خون میرا خون ہے، جس نے ان کو اذیت دی، اس نے مجھ کو اذیت دی۔ جس نے انہیں رنجیدہ کیا، اس نے مجھے رنجیدہ کیا، جس نے ان سے لڑائی کی اس نے مجھ سے لڑائی کی۔ جس نے ان سے صلح کی اس نے مجھ سے صلح کی۔ ان کا دشمن میرا دشمن اور ان کا دوست میرا دوست ہے۔ یقیناً یہ مجھ سے اور میں ان سے ہوں۔ بس اے اللہ! اپنی صلوٰۃ، برکتیں، رحمتیں اور رضامندیاں مجھ پر اور ان پر نازل فرما اور ان سے ہر قسم کے رجس کو دور رکھ اور انہیں پاک و پاکیزہ قرار دے جیسا کہ پاک و پاکیزہ قرار دینے کا حق ہے۔"

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے میرے فرشتو! اور اے میرے عرش پر رہنے والو! میرا آسمان کو خلق کرنا، زمین کو بچھانا، چاند کو منور کرنا، سورج کو روشنی دینا، گھومتے ہوئے فلک کو قائم کرنا، دریاؤں میں پانی جاری کرنا اور ان میں کشتیوں کو رواں رکھنا یہ سب کچھ ان پانچ ہستیوں کی وجہ سے ہے، جو اس وقت اس کسائے یمانی کے نیچے ہیں۔ اس پر جبرائیل امینؑ نے عرض کی، پالنے والے یہ مقدس مقدس ہستیاں ہیں کون؟ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا: "یہ میرے رسولؐ کے اہل البیت ہیں۔ یہ رسالت کی کان (معدن) ہیں یعنی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، ان کے والد بزرگوار محمد مصطفیٰؐ اور ان کے شوہر نامدار علی مرتضیٰؑ اور ان کے دونوں برخوردار

حسن مجتبیٰ اور حسینؑ شہید کربلا ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کے بعد جناب جبرائیلؑ بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے اجازت لے کر چادر میں تشریف لے آئے۔ پھر فرمایا: یا رسول اللہؐ! اللہ رب العزت نے آپ حضرات کی شان میں یہ وحی فرمائی ہے: ''بے شک اللہ چاہتا ہے کہ اے اہل البیت! آپ سے رجس کو اس طرح دور رکھے جیسا کہ دور رکھنے کا حق ہے۔''

(ہم معذرت خواہ ہیں کہ حدیث کساء کو ہم نے بہت مختصر نقل کیا ورنہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ کی وضاحت پوری کتاب کی متقاضی ہے)۔ ورنہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ کی وضاحت پوری کتاب کی متقاضی ہے۔

اب جناب رسالت مآب کا دل مطمئن، شاداں و فرحاں ہو گیا۔ اور یہیں سے میدان مباہلہ میں تشریف لے گئے۔ مباہلہ میں پنجتن پاک علیہم السلام کے جانے کی صورت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

انہیں آتا دیکھ کر بنی نجران کے سرداروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آپس میں مل کر کہنے لگے بخدا ہم وہ چہرے دیکھ رہے ہیں جو اگر اشارہ کردیں تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ان سب نے مباہلہ سے گریز کیا اور صلح کی پیش کش کی۔ جس کے عوض ہر سال جزیہ اور کچھ جنگی سامان دینے کا وعدہ کیا۔ پنجتن پاکؑ نے ابھی لب بھی نہ کھولے تھے کہ معرکہ سر کر لیا۔

مفسر قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی ''خلاصۃ التفسیر'' میں اس آیت (سورۂ آلِ عمران، آیت ۶۱) کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''محققین نے نتیجہ نکالا:

۱۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ابنائے رسولؐ ہیں کہ حضورؐ ''ابناءنا'' کے تحت اُن کو لے گئے۔

۲۔ جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو ''نساءنا'' کے تحت لے گئے۔

۳۔ حضرت علیؑ نفسِ رسولؐ ہیں کہ حضورؐ "انفسنا" کے تحت صرف حضرت علیؑ کو لے گئے۔

۴۔ دعا انہیں حضرات کا واسطہ دینے سے قبول ہوتی ہے۔

۵۔ یہی پنجتن پاک اسلامی تعلیمات کا کامل ترین نمونہ ہیں۔ اسی لیے حضورؐ اللہ کے حکم پر صرف انہیں کو مباہلے کے لیے لے گئے۔

۶۔ حضرات علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ ہی حقیقی معنیٰ میں صادقین یا صدیقین ہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے جھوٹوں پر لعنت کے لیے انہیں کو منتخب فرمایا۔ ان حضرات کی صداقت قرآن سے ثابت ہے، اس لیے یہی حضرات اس بات کے اہل ہیں کہ ان سے دین کو سیکھا جائے اور احادیثِ رسول کو ان ہی سے اخذ کیا جائے۔ کیونکہ صدیقین ہونے کی حیثیت سے یہی حضرات حضور اکرمؐ کے بعد سب سے افضل ہیں اور مثالی کردار کے حامل ہیں۔

ایک مرتبہ مامون رشید نے حضرت امام علی رضاؑ سے عرض کی کہ آپ اپنی فضیلت قرآن سے بیان فرمائیں لیکن "ابناءنا" سے استدلال نہ فرمائیں۔ حضرت امام رضاؑ نے فرمایا، ہمارے لیے اللہ کا "انفسنا" فرما دینا ہی ہماری فضیلت کے لیے بہت کافی ہے، اس لیے کہ ہم کو اللہ نے نفسِ رسول قرار دیا ہے۔

علامہ نیشاپوری نے لکھا "یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جو رسول کی بیٹی کے فرزند تھے، انہیں فرزند رسول کہنا درست ہے کیونکہ رسولؐ "ابناءنا" کے تحت ان لوگوں کو لے کر گئے تھے۔

مثالی شریکِ حیاتِ پیمبرؐ

دورِ جاہلیت میں عورت بہت بے وقعت تھی۔ اس پر بے پناہ مصائب توڑے گئے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اسے زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ اس دور کی عورت کی دشواریوں اور مصیبتوں کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اللہ کی قدرت عظیم ہے۔ اس نے حضرت آدمؑ کے ساتھ جناب حوّا کو بنایا تھا۔ اس لیے بنی نوع انسان کی ارتقاء کے لیے عورت کے وجود کو لازماً برقرار رکھنا تھا اور اسے عزت و وقار بھی دینا تھا کیونکہ اسے انبیاء و اوصیاء کی ماں بننا تھا۔ اس لیے اس دور میں جہاں ظالم اور قاہر قبیلے عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے وہیں کچھ قبیلے ایسے بھی تھے جو مہذب اور غیرت مند تھے جو عورت کو عزت و وقار دینے کے حامی تھے۔ ان قبائل میں عورت کے ساتھ محبت، شفقت اور احترام کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے خاندان تعداد کے اعتبار سے کم تھے۔

حجاز میں ایسا ہی ایک خاندان جناب خویلد کا تھا، جو شریف اور معزز شمار ہوتا تھا۔ یہ خاندان چوتھی پشت میں حضور اکرم کے خاندان سے مل جاتا ہے۔ شرافت و کرامت، فضل و شرف اور امارت و سیادت میں یہ خاندان پورے عرب میں مشہور تھا بلکہ بنی ہاشم کے بعد قابلِ ذکر خاندان اگر کوئی تھا تو یہی تھا۔ اس بات کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ دعوت اسلام اور اپنی پہلی شادی کے بعد جب کفارِ مکہ حضورؐ کے مکان پر پتھراؤ کر رہے تھے تو حضورؐ نے فرمایا: ”تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم اپنی نجیب ترین خاتون کے گھر پتھر پھینک رہے ہو!“

جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ قدرت نے ان ہی کو خاتم المرسلین کا ہمسر بننے کا موقعہ دیا تھا۔ ان ہی کے ذریعہ عورت کے وقار کو اقوامِ عالم میں سربلند کیا۔ ان ہی کے بطن سے اس خاتون کو جنم دینے کا ارادہ کیا جو عالمین کی خواتین کی سردار بننے والی تھی، جو اوصیاء و ائمہ کی خلقت کا باعث بننے والی تھی جو اسلام کے ابدی پیغام کو، جو حضور اکرمؐ کے ذریعہ اللہ نے روشناس کرایا تھا، انسانوں تک پہنچانے پر معمور ہونے والے تھے۔

ماں باپ کی وفات، جو آپؑ کی کم عمری ہی میں ہو گئی تھی، کے بعد جناب خدیجہؑ نے انتہائی شرافت اور پاکیزہ ماحول میں تربیت پائی۔ اس طرح آپؑ کے اندر وہ تمام عادات وخصائص اور کمالات جمع ہو گئے جو کسی شریف عورت کے لیے ضروری ہو سکتے ہیں۔ آپؑ عظمت کردار اور حسن اخلاق کے ان تمام زیورات سے سر سے پیر تک آراستہ ہو گئیں جو خاتم النبیینؐ کی رفیقۂ حیات اور ام المومنین کے لیے ضروری سمجھے جا سکتے ہوں۔ اپنے گھر میں گزارے ہوئے ۲۵ یا ۲۸ سال انتہائی خوش اخلاقی اور متانت سے گزارے۔ تمام اعزہ اور اقربا سے آپؑ کا سلوک انتہائی مخلصانہ اور مشفقانہ تھا۔ ان کی سابقہ زندگی کا کوئی چھوٹا سا بھی منفی واقعہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ سہیلیوں، کنیزوں اور غلاموں سے آپؑ کا حسن سلوک مثالی تھا۔

ترکہ میں جناب خدیجہؑ کو کثیر مال ومتاع ملا تھا جو آپؑ نے انتہائی بردباری سے تجارت میں لگایا۔ تجارت انتہائی ایمان داری اور احتیاط سے کی۔ شروع شروع میں یہ تجارت مکہ اور اس کے اطراف تک محدود رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا دائرہ بڑھا۔ اس کے بعد جناب خدیجہؑ کا مال آس پاس کے بڑے شہروں اور تجارتی مراکز تک جانے لگا۔ اپنی عالی دماغی، فہم و فراست، تدبر اور عقل مندی سے آپؑ نے اپنی تجارت کو خوب وسعت دی۔ خاتون ہوتے ہوئے، شرم وحجاب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تجارت کے میدان میں آپؑ کی یہ کامیابی قابل رشک تھی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے آپؑ مکہ کی رئیس ترین خاتون بن گئیں۔

عرب کا مشہور مورخ واقدی لکھتا ہے:

''خدیجہؓ بنتِ خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ایک عقل مند اور شریف بی بی تھیں۔ اس خوبی، بزرگی اور مکرمت کے علاوہ جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرمالیا تھا، آپؓ اپنے زمانے میں سب سے بہتر نسب اور شرف کے اعتبار سے عظیم تر اور مالی اعتبار سے امیر ترین خاتون تھیں۔ بہت سے رؤسا و شرفائے عرب، آپؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے۔''

ایک اور جگہ واقدی نے لکھا:

''جناب خدیجہؓ بے حد صاحبِ شرافت اور بے پناہ مال کی مالک تھیں۔ وہ ایک تاجر خاتون تھیں جن کا مال ملک شام کی منڈیوں میں جایا کرتا تھا۔ پورے رؤسائے قریش کا جتنا مال تجارت ہوا کرتا تھا اتنا مال تجارت تنہا جناب خدیجہؓ کا ہوا کرتا تھا۔ آپؓ لوگوں سے اجرت پر تجارت کا کام لیا کرتی تھیں اور منافع کی شرکت پر مال دیا کرتی تھیں۔''

اس دور کے اکابر مورخین نے بھی انہی امور کو رقم کیا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جناب رسالت مآب کی صداقت، امانت داری، علم، حلم اور فہم کی گونج مکہ کی فضاؤں میں گردش کر رہی تھی۔ بنی ہاشم پہلے ہی اپنی شرافت اور دیانت داری کا معیار رکھتے تھے۔ ایسے میں جناب خدیجہؓ کے دل میں ایک خیال جاگزیں ہوا کہ کیوں نہ اس پاک باز نوجوان کو امور تجارت سونپ کر دیکھا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی آپؓ نے حضور اکرم کو بلا بھیجا۔ تجارت میں شراکت کے امور طے کیے۔ بہت سا مال، غلام، زاد سفر وغیرہ دے کر ملک شام روانہ فرمایا۔ دوسری روایات کے مطابق پہل جناب رسالت مآبؐ کی جانب سے، جناب ابوطالبؑ کی ایماء پر ہوئی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس تجارت

کے لیے جناب خدیجہؓ نے آپ کو بطور ملازم بھیجا تھا۔ چنانچہ یعقوبی جن کی تاریخ قدیم ترین معتمد ترین مصدر و ماخذ سمجھی جاتی ہے لکھتے ہیں: لوگ کہتے ہیں جناب خدیجہؓ نے آپ کو ملازم کی حیثیت سے بھیجا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپؐ ہرگز کسی کے ملازم نہیں رہے۔ حضرت امام حسن عسکریؑ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ جناب خدیجہؓ کے مال سے مضاربہ کی صورت میں تجارت کے لیے شام کا سفر کرتے تھے۔ جو بھی ہو روشن مستقبل کے حصول کے سلسلہ کا یہ ایک سنہری قدم تھا جو بعد میں ایک بہت کامیاب اور مبارک دور کا آغاز ثابت ہوا۔ حضور اکرمؐ نے تمام امور کا جائزہ لیا اور شام کی راہ لی۔ نیت نیک تھی اس لیے ہر قدم پر کامیابی نے پاؤں چومے۔ جو مال تجارت کی غرض سے آپؐ لے کر گئے تھے بازار میں ان کے اچھے سے اچھے گاہک تلاش کیے۔ سب سے نرخ معلوم کیے۔ سب سے اچھے دام دینے والے کے ہاتھ اپنے مال کا سودا کیا۔ اسی طرح سے جو مال وہاں سے لینا تھا، تاجروں میں جس نے سب سے کم نرخ پر مال دیا اس سے لینے اور اچھے معیار کا مال خریدنے کو ترجیح دی۔ ہر لین دین کو تحریر کیا۔

راستے میں کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ غلام میسرہ بہت حیران ہوا۔ جہاں کہیں دھوپ کا سامنا ہوتا تھا، بادل کا ایک ٹکڑا آپؐ پر سایہ فگن ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے دو فرشتے آپؐ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ جب چلتے تو خاک پر نقشِ قدم نہ بنتے، نہ ہی آپ کا سایہ زمین پر پڑتا۔ آپؐ جہاں سے گزرتے شجر و حجر سلام کرتے۔ جب کھانا کھاتے، ہمیشہ اس کے بعد کھانا بچ رہتا۔ ایک جگہ ایک خاص درخت کے نیچے آپؐ نے قیام فرمایا۔ ادھر سے نسطور نامی ایک راہب کا گزر ہوا۔ اس نے کچھ ایسی علامات دیکھیں کہ حیران ہو گیا۔ میسرہ کو بلا کر پوچھا کہ کیا ان کی آنکھوں میں ہمیشہ سرخی رہتی ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر نسطور نے حضورؐ کے دوسرے کوائف دریافت کیے تو

کہنے لگا: ''اس پیڑ کے نیچے تو کوئی نبی ہی نزول اجلال فرما سکتا ہے۔ جو علامات میں دیکھ رہا ہوں اور جن کی بابت میں نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے، میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ اس زمانہ کے نبی آخرالزماںؐ ہیں۔''

شاداں و فرحاں یہ قافلہ مکہ واپس آیا تو حضورؐ نے جناب خدیجہؓ کو خطیر منافع کی مبارک باد دی۔ ملیکہ کو اس سے قبل اتنا زیادہ منافع کبھی نہیں ملا تھا۔ میسرہ نے راستے میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات بتائے۔ ایک مسرّت انگیز احساس کے ساتھ جناب خدیجہؓ خوشی سے سرشار ہو گئیں۔ آپ نے خوش ہو کر اسی وقت میسرہ کو آزاد کر دیا اور بہت سی دولت بھی عنایت فرمائی۔ آپ کے ایک چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل، ایک عالم فاضل شخصیت تھے۔ انہوں نے بہت سے آسمانی صحیفوں کا مطالعہ کر رکھا تھا اور اس دور کے بڑے علماء سے مذاکرات کرتے رہتے تھے۔ ان کے حاصل کردہ علوم کے چرچے جناب خدیجہؓ کے کانوں میں بھی پڑتے رہتے تھے۔ ان کا ذہن اس امر سے آشنا تھا کہ ایک نبی برحق کا نزول ہونے ہی والا ہے۔ میسرہ سے ان آثار کو سننے کے بعد آپؓ جناب ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئیں اور تمام باتوں کو ان کے گوش گزار کیا۔ ساتھ ہی حضورؐ سے اپنے رشتہ کے سلسلے میں مشورہ کیا۔ بیان سننے کے بعد ورقہ نے فرمایا:

> ''اگر یہ درست ہے تو خدیجہؓ یقیناً محمدؐ اس امت کے نبی ہیں۔ بے شک میں پہچانتا ہوں کہ زمانے کو جس نبی کا انتظار ہے اس امت کے ہونے والے نبی یہی ہیں۔''
>
> (سیرت ابن ہشام، جلد ا، ص ۱۸۰)

جناب خدیجہؓ کو شروع سے ہی اپنے تابناک اور روشن مستقبل کا وجدان تھا۔ ان کی پیش بین نگاہیں اس شخص کی متلاشی تھیں جو عالم انسانیت پر سورج بن کر طلوع ہونے والا تھا۔ جناب خدیجہؓ نے ایک شب خواب دیکھا کہ ان کے گھر میں سورج اتر پڑا ہے اور اس کی

روشنی سے مکہ کے تمام در و دیوار جگمگا اٹھے ہیں۔ حسب عادت وہ جناب ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں اور خواب کو بیان کیا۔ ورقہ نے خواب کی تعبیر بتائی کہ تمہاری شادی ایسے شخص سے ہوگی جس کو اللہ نبوت اور رسالت کے عہدۂ جلیلہ سے سرفراز فرمائے گا۔

اب رشتہ کے لیے میدان ہموار ہو گیا تھا چنانچہ میسرہ سے سنے ہوئے واقعات، معجزات و کرامات، راہب کی پیشین گوئی، صحف آسمانی اور کتب سماوی کی متواتر و مسلسل خبروں، اپنا خواب اور پھر چشم دید حالات نے جناب خدیجہؓ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس رشتہ کے بارے میں خود سلسلہ جنبانی کریں۔ ایک روز جب حضور اکرمؐ سفرِ تجارت کے بارے میں مزید بات چیت کے لیے جناب خدیجہؓ کے ہاں تشریف لے گئے تو آپؓ نے ہمت کر کے اس بات کو خود حضور اکرمؐ کے گوش گزار کر دیا۔ فرمایا:

> ''میرے سردار! اگر آپؐ کی اجازت ہو تو عرض کروں کہ میں نے آپؐ کے لیے ایک اچھی سی عورت پسند اور منتخب کی ہے۔ وہ اسی مکہ کی ہے۔ آپؐ کی قوم سے ہے، مال دار ہے، خوب صورت ہے، کمالات کی بلندیوں پر ہے، بڑی عفیفہ، حیادار اور طاہرہ ہے۔ نسب میں آپؐ سے بہت قریب ہے۔ اس کی وجہ سے سلاطین و رؤسائے عرب آپؐ سے حسد کرنے لگیں گے۔''

آپؐ اس پیغام کو سن کر سمجھ گئے۔ وضاحت طلب کرنے پر جناب خدیجہؓ نے فرمایا:

> ''جی! وہ کنیز یہ خدیجہ ہی ہے۔ واللہ میں آپؐ کے احکام کی کبھی مخالفت نہیں کروں گی۔''

حضور اکرمؐ نے جناب خدیجہؓ کو سمجھایا کہ ان کے پاس کوئی مال و دولت نہیں ہے، جب کہ آپؓ بہت مال دار ہیں۔ بہتر ہے کہ آپؓ کا شوہر کوئی بادشاہ اور صاحب تخت و تاج ہو، نہ کہ ان جیسا تنگ دست۔ مگر جناب خدیجہؓ اپنے فیصلہ سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوئیں۔

جناب رسالت مآبؐ وہاں سے اٹھے اور اپنے شفیق چچا جناب ابوطالبؑ کے پاس آئے۔ پورا معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔ انہیں یہ سب سن کر ایک خوشگوار حیرانی ہوئی کیونکہ ان کے کانوں میں یہ بات پہنچ چکی تھی کہ جناب خدیجہؓ بڑے بڑے رؤسا و شرفا کے رشتے ٹھکرا چکی ہیں۔ گھر کے دوسرے افراد سے مشاورت ہوئی۔ طے یہ پایا کہ حضور کی پھوپھی جناب صفیہ کو جناب خدیجہؓ کا عندیہ لینے کے لیے بھیجا جائے۔ جناب صفیہ خوشی خوشی گئیں اور خوش خبری لے کر واپس آئیں۔ اس کے بعد جناب ابوطالبؑ، ہاشمی دانش مندوں اور نوجوانوں کے ہمراہ باقاعدہ جناب خدیجہ کے درِ دولت پر آئے اور یہ مقدس رشتہ طے ہوگیا۔

الغرض یہ شادی دھوم دھام سے انجام پائی۔ جناب ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا جس کے ابتدائی الفاظ "الحمدللہ" تھے۔ ابھی قرآن کے ظاہری نزول کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ الفاظ اتنے پسند آئے کہ قرآن مجید کے ابتدائی سورے، سورۂ فاتحہ کے ابتدائی الفاظ قرار پائے۔

جناب خدیجہؓ کی حیات مبارک پر کسی اور طرح کے اختراع کا موقع نہ ملنے پر ان کی عمر کو متنازع بنا دیا گیا۔ یعنی کہا گیا کہ شادی کے وقت آپؑ کی عمر ۴۰ سال تھی اور اس سے پہلے آپؑ کی دو شادیاں ہو چکی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت جناب خدیجہؓ کی عمر ۲۵ یا ۲۸ سال اور جناب رسالت مآبؐ کی عمر مبارک ۲۵ سال تھی اور یہ ان دونوں کی پہلی شادی تھی۔ اپنی وفات تک جناب خدیجہؓ نے بھرپور رفاقت سرانجام دی۔ اس میں جہاں سکون و شادمانی کی گھڑیاں آئیں وہیں تکلیف و پریشانی کی ساعتوں نے بھی ان کا دامن نہیں چھوڑا۔ ملیکۃ العربؑ نے صبر و ایثار کی وہ مثال پیش کی جو خواتین عالم کے لیے مشعل راہ ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی وحی کے نزول کا ماجرا حضور اکرمؐ نے سب سے پہلے جناب خدیجہؓ کو سنایا۔ آپؓ اس خبر کو سن کر نہ گھبرائیں نہ پریشان ہوئیں۔ بلکہ ایسا لگا کہ وہ اس خبر کی منتظر تھیں۔ چنانچہ آپؓ نے نزول وحی کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ دعوت اسلام کو قبول کر کے پہلی مسلمان فرد ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

اسی اثناء میں شہزادیِ کونین جناب فاطمۃ الزہراؑ کی ولادت ہوئی۔ اللہ کی اس عظیم نعمت کے شکمِ خدیجہؓ سے آغوشِ خدیجہؓ میں آنے کے واقعہ کی تفصیل الگ ہے۔ اس رحمت پروردگار کا رحمت اللعالمین کی گود میں آنا اس نوبیاہتا جوڑے کی خوشیوں کی ابتدا بھی تھی اور انتہا بھی۔

اعلان نبوت کے بعد تو جیسے دنیائے عرب میں زلزلہ آگیا۔ پوری دنیا آپ کی دشمن ہو گئی۔ اگر کوئی حامی و مددگار تھا تو وہ جناب خدیجہؓ تھیں یا جناب ابوطالبؑ کا کنبہ۔ اس دور میں حضور اکرمؐ پر جو مصائب گزرے اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔ دعوتِ ذوالعشیرہ، جو حضورؐ نے اللہ کے حکم پر اس لیے دی تھی کہ کم از کم اپنے خاندان کی حمایت حاصل کرلیں۔ سوائے حضرت علیؑ اور حضرت ابوطالبؑ کسی نے آپ کی اعلانیہ حمایت کا اعلان نہ کیا۔ مخالفت کا سلسلہ شدید سے شدید ہوتا چلا گیا۔ مسلمانوں پر یہ وقت بہت سخت تھا۔ ایسے میں مکہ میں قحط پڑ گیا۔ حضورؐ بڑے مخمصے میں تھے۔ بیوی سے مدد مانگنے میں شرم مانع تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ذہین اور سمجھ دار زوجہ نے معاملہ کا ادراک کیا اور اپنی تمام دولت محبوب شوہر کے سامنے ڈھیر کردی۔ لکھا ہے کہ خدام نے لا لا کے دونوں کے سامنے درہم و دینار کا اتنا بڑا انبار لگا دیا کہ دونوں دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ تمام دولت آپؓ نے سب کے سامنے حضورؐ کو ہبہ کردی کہ چاہیں تو خود رکھیں یا دوسروں پر خرچ کریں۔

کفار کے ظلم و ستم کا سلسلہ بڑھتا گیا اور بالآخر مقاطعہ تک آپہنچا۔ مقاطعہ کے نتیجہ میں حضور اکرمؐ کے ساتھ جناب خدیجہؑ، جناب فاطمہؑ، جناب ابوطالبؑ اور خاندان کے بہت سے افراد کئی سال تک شعب ابوطالبؑ میں محصور رہے۔ اللہ ہی جانتا ہے اس دوران ناز و نعم میں پلی ملیکۃ العرب جناب خدیجہؑ پر کیا گزری ہوگی۔ مقاطعہ ختم ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد جناب ابوطالبؑ کی اور پھر جناب خدیجہؑ کی وفات ہوگئی۔ مخالفین کی ریشہ دوانیاں اور بڑھ گئیں، بالآخر حضور کو مکہ سے ہجرت کا فیصلہ کرنا پڑا۔

جناب خدیجہؑ کی وفات سے حضور اکرم کو بہت صدمہ پہنچا۔ آپؐ ان کا ذکر بہت محبت سے فرمایا کرتے اور جب بھی ان کی یاد آتی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

جناب خدیجہؑ کی کئی اولیات ہیں یعنی ان کے کچھ فضائل ایسے ہیں جو کسی اور کے نہیں:

۱۔ آپؑ آنحضرت کی پہلی زوجہ ہیں۔ ان کی حیات میں حضورؐ نے دوسرا عقد نہیں فرمایا۔ نبی آخرالزماں کی شریک حیات ہونا اور تاعمر مثالی زوجہ کا رتبہ پانا کوئی معمولی اعزاز نہیں۔

۲۔ نزول وحی اور اپنی بعثت کا تذکرہ حضورؐ نے سب سے پہلے جناب خدیجہؑ سے کیا۔ آپؑ نے نہ صرف ان باتوں کی تصدیق کی بلکہ حلقۂ اسلام میں سب سے پہلے داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ سورۂ والعصر (۱۰۳) میں اللہ کے فرمان کے مطابق چار خصوصیات کے انسان خسارے سے مبرّا ہیں: ''ایمان لانے والے، نیک اعمال کرنے والے، ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرنے والے۔'' جناب خدیجہؑ ان چاروں اوصاف سے ہمہ تن مزین ہیں۔ پہلی صفت یعنی ''ایمان لانے'' کے معاملے میں تو وہ حرف اول و آخر ہیں۔

۳۔ سب سے پہلے نماز جناب خدیجہؑ نے جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ پڑھی۔

۴۔ جناب رسالت مآب کی نسلِ مبارک آپؑ ہی کے ذریعہ پروان چڑھی۔ سورۂ کوثر (۱۰۸) میں حضور اکرم کو کوثر یعنی جناب فاطمہؑ یا خیر کثیر یا نسل کثیر عطا کرنے کی نوید دی گئی

ہے۔ حضورؐ کو یہ نعمت عظمیٰ جناب خدیجہؑ کے توسط سے حاصل ہوئی۔

۵۔ آپؑ دنیا کی چار بہترین عورتوں (جناب آسیہؑ بنت مزاحم زوجہ فرعون، جناب مریمؑ بنت عمران، جناب خدیجہؑ بنت خویلد اور جناب فاطمہؑ بنت محمدؐ) میں سے ایک ہیں اور آپؑ کی دختر نیک اختر عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔

۶۔ جناب خدیجہؑ حضورؐ سے شادی سے پہلے عرب کی مال دار ترین فرد تھیں۔ شادی کے بعد آپؑ نے اپنا کل مال و متاع حضورؐ اور اسلام پر صرف کر دیا۔ شہزادی کے اس عمل خیر کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ والضحیٰ (۹۳) کی ایک آیت میں سراہا کہ کیا اس نے آپ کو تنگ دست پا کر غنی (مال دار) نہیں بنایا؟

مآخذ

"ملیکۃ العرب" تصنیف: جناب مولانا سید کرار حسین صاحب قبلہ دام مجدہٗ (میر پوری)۔

"منارۂ ہدایت خاتم الانبیا محمد مصطفےٰ" مولفین سید منذر حکیم اور عدی غریباوی، مترجم نثار احمد زین پوری۔

شیرِ خدا کے شیر، حضرت عباسؑ

اس شیر سا دنیا میں کوئی شیر نہیں ہے
عباسؑ کے تو نام میں بھی زیر نہیں ہے

حضرت عباسؑ، مولائے متقیان حضرت علیؑ کے فرزند ارجمند ہیں۔ یہ وہ ہستی ہیں جن کی آمد کی دعا حضرت علیؑ اور جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے خود فرمائی۔ ان کے اجداد کے بارے میں کیا بیان کیا جائے، ان کے اجداد وہ تھے جو جناب حسنین کریمین کے تھے، جو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے تھے بلکہ وہ تھے جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تھے۔ اس تعارف کے بعد تو قلم گونگا ہو جاتا ہے۔ اجداد کا اس سے زیادہ معتبر اور باکرامت سلسلہ تو کسی ذی روح کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی بھی شخصیت کی سیرت جاننے اور سمجھنے کے لیے اس کے سلسلۂ نسب پر نگاہ کرنا ضروری ہے۔ حضرت عباسؑ کے والدِ ماجد حضرت علیؑ، دادا شیخ بطحا جناب ابوطالبؑ، پردادا سید القریش عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی، بن کلاب، بن مرہ، بن کعب، بن لوی، بن غالب، بن فہر، بن مالک، بن نضر، بن کنانہ، بن خزیمہ، بن مدرکہ، بن الیاس، بن مضر، بن نزار، بن معد، بن عدنان ہیں۔ حضور ختمی مرتبت کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب میرا سلسلہ نسب عدنان تک پہنچ جائے تو اس سے آگے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔" (مناقب شہر آشوب، ج ۱، ص ۱۰۶)۔ دیانت دار محققین کا کہنا ہے کہ آپؑ کے اجداد کرام جاہلیت کی آلودگی سے ہمیشہ منزا

رہے، کبھی بتوں کی پرستش نہیں کی۔ اس مقدس سلسلۂ نسب پر سورۂ شعراء کی آیت ۲۱۹ سند ہے، جس کا ترجمہ ہے: ''اور اللہ سجدہ کرنے والے لوگوں میں آپ کی نقل و حرکت اور آنے جانے پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔'' مفسر قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی صاحب نے اس کی بابت تفسیر میں لکھا ہے ''سجدہ کرنے والوں میں حرکت'' کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے والد جناب عبداللہؑ تک حضور اکرم کا نور پاک و پاکیزہ صلبوں میں منتقل ہوتا آیا ہے۔ یعنی آپ کا نور ہمیشہ ان لوگوں کے اصلاب میں منتقل ہوتا رہا جو سجدہ کرنے والے موحد تھے۔

(تفسیر علی ابن ابراہیم)

جناب رسالت مآب کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جب اللہ نے ہماری خلقت کا ارادہ فرمایا تو ہمارے نور کو صلب آدمؑ میں قرار دیا جو ان کی پیشانی میں ضوبار رہا۔ پھر یہی نور ان کے وصی حضرت شیثؑ کی طرف منتقل ہوا۔ انہیں جناب آدمؑ کی وصیت تھی کہ اس نور کو صرف پاکیزہ عورت کے رحم میں منتقل کریں۔ لہٰذا آنحضرتؐ کے بزرگوں نے اپنے وصی کے لیے پاک و پاکیزہ عورتوں کا انتخاب کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہم نیک مردوں اور پاک و پاکیزہ عورتوں کے اصلاب و ارحام سے ہوتے ہوئے صلب حضرت عبدالمطلبؑ تک پہنچے۔ وہاں سے اللہ نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصہ جناب عبداللہ سے جناب آمنہؑ کی طرف منتقل ہوا جس سے میں ہوں اور دوسرا جناب ابوطالبؑ سے جناب فاطمہ بنت اسدؑ تک پہنچا جس سے علیؑ ہیں۔''

(بحار، جلد ۱۵، ص ۱۵)

مادرِ گرامی جناب ابوالفضلؑ:

حضرت ابوالفضلؑ کی والدۂ ماجدہ کا نام فاطمہ ہے لیکن آپ کی شہرت ''ام البنین'' کے لقب سے ہوئی۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام حزام بن خالد تھا۔ حضرت عباس کے ننھیالی خاندان والے اپنے دور کے شجاع و بہادر مشہور تھے۔ حضرت عباس میں ددھیال اور ننھیال

دونوں طرف سے شجاعتیں جمع ہوگئی تھیں۔

جناب ام البنینؑ کی سیرت اور خاندانی پس منظر کے بارے میں ہم اپنے سابقہ مضامین میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کے بزرگوں میں عامر بن کلاب، عامر بن صعصعہ اور جناب عامر بن طفیل جیسے اشجع کے نام آتے ہیں۔ جناب امیر المومنینؑ سے جناب فاطمہ کلابیہ (ام البنینؑ) کی شادی کی ایک بڑی وجہ بھی یہی خاندانی شجاعت اور بہادرانہ پس منظر تھی۔

ولادت باسعادت:

ولادت حضرت ابالفضل سے عالم امکان کو ایک نئی روشنی ملی۔ افق علوی کے اس آفتاب نے دنیا کو وفا کے نور سے جگمگا دیا۔ چونکہ حضرت عباسؑ آغوش شجاعت میں پروان چڑھے تھے اور انہوں نے دامان ابوالائمہ کے عصمتی کردار سے استفادہ کیا تھا لہٰذا آغوش اور ماحول کے اثرات نے انہیں عزت نفس، شہامت، جرأت، طہارت، پاکیزگی، خرد کامل، علم وافر اور اخلاق حمیدہ کا مہر نیم روز بنا دیا تھا۔ قمر بنی ہاشم آفتاب امامت کے پرتو میں پروان چڑھ رہے تھے۔ آپ نے جس جگہ قدم رکھا وہ شرافت و سیادت کی جگہ تھی، اگر لب کشا ہوئے تو ہدایت و سعادت کا پیغام ساتھ رہا، جس طرف کا رخ کیا وہ حق تھا، جدھر سے منہ موڑ لیا وہ باطل تھا۔ ان کے نفس غیور نے کسی چیز کا انکار کیا تو یقیناً وہ ظلم و زیادتی تھی۔ جناب عباسؑ فضیلتوں کا مرکز و مصدر تھے اور کرامت و بزرگی کا نمونۂ اعلیٰ۔ درحقیقت امام حسینؑ کی تجلی امامت کا نام عباسؑ ہے۔ حضرت عباسؑ کے دہن میں حضرت امام حسینؑ کی زبان تھی۔ ان کے قالب میں سید الشہداء کی روح کارفرما تھی۔

حضرت عباسؑ علقمی حضرت امام حسینؑ کے لیے ہوئے تھے۔ ہر مرحلۂ حیات میں امام حسینؑ ان کے مقتداء امام رہے۔ لہٰذا ولادت کے اعتبار سے بھی دونوں میں امام و ماموم

جیسا ہی ایک قدم کا فرق ہے۔ امام مظلومؑ کی ولادت تین شعبان کو ہوئی تو حضرت عباسؑ کی ولادت چار شعبان المعظم کو۔

ولادت کے بعد شہزادے کو اذان و اقامت کے لیے آغوش امیر المومنینؑ میں لایا گیا۔ بچہ پر نظر پڑتے ہی واقعہ کربلا ان کی نظر میں پھر گیا ہوگا۔ بچے کے سر پر نظر پڑتے ہیں وہ گُرز یاد آیا ہوگا جس سے یہ سرِ اقدس پاش پاش ہونے والا تھا۔ بازو دیکھتے ہی ان کے یکے بعد دیگرے قلم ہونے کا منظر نظروں کے سامنے آ گیا ہوگا۔ جب سینہ کو دیکھا ہوگا تو تیروں سے چھلنی سینہ آنکھوں میں گھوم گیا ہوگا۔ اس وقت کے جناب امیر المومنینؑ کے جذبات اور احساسات کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ اس میں کیا کلام ہے کہ نگاہ مرتضوی اور فاطمی نے کیسے کیسے طوفانوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ان بچوں کی پرورش کی ہوگی۔

جانے کیوں دیکھ کے رو دیتے تھے
بازو عباسؑ کے اکثر حیدرؑ

جس وقت حضرت علیؑ حضرت عباسؑ کے قدِ زیبا اور شجاعت و سیادت کے اطوار و انداز کو دیکھتے تو آپ کی خوشی کی انتہا نہ رہتی لیکن جب علیؑ کی نظر کربلا کے عباسؑ کو دیکھتی تو تشنگی، زخم، زغۂ اعدا یاد آ جاتا اور آپ غم و اندوہ میں ڈوب جاتے۔

جناب امیر المومنینؑ اور جناب عباسؑ علمدارؑ عالم امکان کی اعجازی شخصیات کے نام ہیں۔ ان حضرات گرامی کے فضائل و مناقب کے بیان پر کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

مولفِ ''قمر بنی ہاشمؑ'' لکھتے ہیں:

ایک دن حضرت ام البنینؑ نے دیکھا کہ امیر المومنینؑ حضرت عباسؑ کو گود میں لیے ہوئے ہیں اور بازوؤں کے بوسے لے لے کر گریہ فرما رہے ہیں۔ جناب ام البنینؑ بے چین ہو گئیں اور حضرت سے گریہ کی وجہ پوچھی۔ آپؑ نے فرمایا: ''اس بچے کے دونوں ہاتھ

حسینؑ کی نصرت میں قلم ہو جائیں گے۔" یہ سنتے ہی ماں کا دل بھر آیا اور چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ مولائے متقیانؑ نے بی بی کو تشفی دیتے ہوئے فرمایا: "اللہ عباسؑ کو اس کے بازوؤں کے بدل جنت میں دو پر عنایت فرمائے گا، جیسے کہ جناب جعفر بن ابی طالبؑ کو عنایت فرمائے گئے ہیں، جن کی مدد سے وہ جنت میں ملائکہ کے ساتھ پرواز کریں گے۔"

شمائل مبارک:

اللہ تعالیٰ نے جناب علیؑ ابن ابی طالبؑ کے فرزند کو شجاعت، غیرت، سخاوت، عزت نفس، بزرگی، کرم، رحم دلی، خوش اخلاقی سے نوازا یعنی صفاتِ جلال و جمال دونوں کا مرقع بنایا۔ جناب عباسؑ کا قدِ زیبا، شگفتہ چہرہ، دل نشین خدوخال ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ آپؑ کی پیشانی سے ایمان کی نورانیت اور سراپے سے علیؑ کی ہیبت ٹپکتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ کو قمر بنی ہاشم کہا جاتا تھا۔ یہ اعزاز انہیں اپنے جد سے وراثتاً ملا تھا۔ جناب عبدِ مناف کو ماہِ مکہ اور جناب عبداللہ کو ماہِ حرم کہا جاتا تھا۔ ان حضرات کی پیشانیوں سے نور ساطع ہوتا تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ "جناب عباسؑ بہت دیدہ زیب و جاذب نظر تھے۔ جب اپنے راہوار پر سوار ہوتے تو آپؑ کے پیر بن زمین پر خط دیتے جاتے اور لوگ انہیں "قمر بنی ہاشم" پکار اٹھتے۔ راویوں کا یہ بھی بیان ہے کہ آپ کی پیشانی مبارک پر سجدے کا نشان تھا۔

کنیت والقاب:

حضرت ابوالفضل العباسؑ کے لقب اور کنیت میں کچھ القاب و کنیتیں ایسی ہیں جو واقعۂ کربلا کے بعد آپ کو ملیں، جیسے ابوقربہ۔ قربہ کے معنی مشک ہوتے ہیں۔ اس کنیت کی وجہ واضح ہے۔ جب یزیدی لشکریوں نے عترتِ مصطفیٰؐ پر پانی بند کر دیا تو جناب عباسؑ نے پیاسوں کو سیراب کرنے کی کوشش کی۔ باوجود اس کے کہ ہجوم کثیر مزاحمت کر رہا تھا۔ جناب عباسؑ بجلی بن کر ان پر ٹوٹ پڑے اور راستہ بناتے ہوئے نہر فرات تک پہنچ گئے۔ مشکیزہ کو

پانی سے بھرا اور واپس خیمہ گاہ تک جانے کی کوشش کی۔ لیکن دشمن نے پیچھے سے گرز کا وار کیا پھر ہاتھوں پر وار کر کے انہیں شہید کیا۔ آخرِ کار جب مشکیزہ پر تیر آ کر لگا تو اہلِ حرم کی آس ٹوٹ گئی اور وہ پیاسے ہی رہ گئے۔

وفا:

غلام کیا کہیں عباسؑ کو کہ نام ان کا
لغت نے مانگ لیے معنیٔ وفا کے لیے
(شاداںؔ دہلوی)

ایسا لگتا ہے جیسے لفظِ وفا، حضرت عباسؑ کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ دنیا میں چھوٹے بھائی تو بہت سے گزرے ہیں، بڑے بھائیوں سے ان کی عقیدت، محبت اور یگانگت کی وجہ فطری ہے۔ لیکن بھائی کو آقا سمجھنا، ہمہ وقت بھائی پر قربان ہونے کے لیے آمادہ رہنا، بھائی کے بچوں پر جان نثار کرنے کی شدید آرزو رکھنا، تاریخ میں نہیں ملتا۔ جناب عباسؑ نے ماں کی تربیت اور اور وصیت کے مطابق اپنی ایک ایک سانس کو خدمتِ اہلِ بیتؑ کے لیے وقف کر دیا تھا۔

ابوالفضل:

آپؑ کی دیگر کنیتوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپؑ کے ایک بیٹے کا نام فضل تھا۔ دوسری وجہ معنوی تھی۔ یعنی آپؑ کی ذات گرامی فضائل کا مجموعہ تھی۔

قمرِ بنی ہاشم:

جیسا کہ پہلے تحریر کیا، حضرت عباس کا چہرہ ماہِ کامل کی طرح چمکتا اور دمکتا ہوا تھا۔ انسان کی شخصیت کا پرتو اس کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ آپؑ ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے راہِ تقویٰ پر گامزن تھے چنانچہ یہ صفات چہرہ مبارک سے مترشح ہوتی تھیں۔

شہید:

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا جب آپ کو فدک واپس ملا تو اس کی تقسیم کس طرح فرمائی؟ آپؑ نے فرمایا: ''ایک چوتھائی فرزندان عباسؑ شہید کو دیا، باقی ہمارے اختیار میں ہے۔

کربلا میں جناب سید الشہداء کے اہلِ خاندان اور ان کے انصار کو جس بے دردی سے شہید کیا گیا وہ سب جانتے ہیں لیکن حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی شہادتیں بالکل منفرد تھیں۔

عبدِ صالح:

عبد صالح وہ فضیلت ہے جو انسان کے کمال کی آخری حد ہے۔ عبد کے معنی ہیں بندہ، غلام۔ ہر انسان کے اللہ تعالیٰ سے تین طرح کے رشتے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کا پالنے والا ہے، انسانوں کا حکمراں ہے اور انسانوں کا معبود ہے۔ اس بات پر سورۂ الناس گواہ ہے۔ عبدیت عظیم مرتبہ ہے اور عبد صالح عظیم ترین۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے عبدیت جیسے اعلیٰ کمال کی نسبت حضرت عباسؑ کو دی ہے۔ چنانچہ اپنی تاکید کردہ زیارت میں آپؑ نے حضرت عباسؑ کے لیے فرمایا: "السلام علیک ایھا العبد الصالح......"

سقائے حرم:

حضرت عباسؑ کے القاب میں ایک لقب ''سقائے حرم'' بھی ہے۔ پانی سرمایۂ حیات ہے۔ دنیا کی کوئی شے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ارشادِ باری ہے: سورۂ الانبیا (۲۱)، آیت ۳۰: ''......ہم نے ہر موجود کو پانی سے خلق کیا۔'' پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پانی شہ رگِ حیات ہے۔ پانی پہنچانا اور پانی پلانا بڑی سعادت ہے۔ ایسا انسان جو کسی کو پانی پلائے اس کے سینہ میں عاطفت و محبت کا خزانہ ہے۔ اس کے اندر مہر و مروت سے لبریز دل

پایا جاتا ہے۔

اس ضمن میں بہت سی روایات حضرات ائمہ طاہرینؑ اور رسول مقبولؐ سے وارد ہوئی ہیں جس میں سقائی اور پانی پلانے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ یہاں صرف چند احادیث پیغمبرؐ پیش کی جاتی ہیں:

حضور اکرمؐ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک بہترین عمل پیاسے کو پانی پلانا ہے، خواہ حیوان ہو یا انسان۔

دوسری حدیث: ''اگر کسی نے پانی کی قلت کے باوجود پانی پلایا تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے درختوں کے پتے۔''

ایک اور حدیث ہے: ''اللہ پانی پلانے والے کو ہر قطرۂ آب کے عوض سیم وزر اور سر بمہر شراب طہور مرحمت فرمائے گا اور اگر کسی نے صحرا و بیابان میں کسی کو سیراب کیا تو یہ شخص انبیائے کرام کے ساتھ حوض کوثر پر وارد ہوگا۔''

ان احادیث کی روشنی میں حضرت عباسؑ کی سقائی بام عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

آخر میں سورۂ البقرہ کی آیت ۲۴۹، جس میں جناب طالوت کے بارے میں بیان ہے۔

''اب جب طالوت افواج کو لے کر روانہ ہوئے تو کہا کہ اللہ تم لوگوں کی آزمائش کرنے والا ہے ایک نہر سے، تو جو اس میں سے پی لے گا وہ مجھ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا اور جو اسے چکھے گا بھی نہیں وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر وہ جو بس چلو میں پانی لے لے......(الخ)''

علامہ سید علی نقی نقوی، ''بیان القرآن'' میں فرماتے ہیں: ''عام مفسرین اور مترجمین نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ ایک چلو پی لے تو کوئی حرج نہیں، مگر جب اس کے پہلے یہ لفظ ہے کہ وہ جو اسے چکھے گا بھی نہیں وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہوگا تو ایک چلو پینے کی اجازت کا کوئی

محل نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں نہ اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ بس چلو میں پانی لے کر پھینک دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی نظیر دورِ آخر میں نہرِ فرات اور ابوالفضل العباسؑ اور لب تر نہ کرنے اور چلو میں پانی لے کر پھینک دینے کی شکل بھی موجود ہے۔''

آخر میں حضرت عباس علمدارؑ کا وہ خطبہ جو آپ نے ۸ ذی الحجہ ۵۹ھ کو مکۂ معظمہ میں عامۃ المسلمین کو ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آپؑ کا علم، عرفان، شجاعت، نفاست طبع اور طاعتِ امام کا جذبہ جھلک رہا ہے:

''اس اللہ کی حمد بجالاتا ہوں جس نے خانۂ کعبہ کو میرے آقا و مولا امام حسینؑ کے والدِ ماجد امیر المومنینؑ کی ولادت سے شرف بخشا۔ کل تک یہ ایک گھر کی حیثیت رکھتا تھا اور آج (امیر المومنینؑ کی ولادت کی برکت سے) قبلۂ عالم بن چکا ہے۔ اے فاسق و فاجر کا فرو! آیا نیکیوں کے امام پر حج کا راستہ بند کر رہے ہو۔ امام حسینؑ سے زیادہ خانۂ کعبہ جانے کا حق کسی کو ہے؟ ان سے زیادہ خانۂ کعبہ کے نزدیک کون ہے؟ اور اللہ تعالیٰ جو انتہائی بلند مرتبہ ہے اس کی حکمت اگر نہ ہوتی اور بلند و بالا اسرار الٰہی اور الٰہی آزمائشوں کا سلسلہ نہ ہوتا تو یقیناً تم دیکھتے کہ بیت اللہ امام حسینؑ کی قدم بوسی کے لیے بڑھتا، قبل اس کے کہ لوگ اس کو چومتے۔ لوگ حجرِ اسود کو چومنے کے لیے آتے ہیں اور حجرِ اسود امام کی دست بوسی کے لیے بڑھتا ہے۔ اور اگر میرے مولا امام حسینؑ کی مشیت جو تابع پروردگار ہے مانع نہ ہوتی تو باز کی طرح تم پر ایسے جھپٹتا جیسے وہ چڑیوں کو پنجے میں دبوچتا ہے۔ جو لوگ بچپن میں موت سے کھیلا کرتے تھے انہیں اب موت سے کیسے ڈرایا جا سکتا ہے، جب وہ جوان مرد ہو چکے ہیں، میری اور تمام موجودات کی جانیں حسینؑ کی جان پر قربان ہو جائیں۔ سوچو اور سمجھو کون اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، جو شراب پیتا ہے یا جو صاحب کوثر ہے، جس کا گھر وحی اور قرآن کا مرکز ہے یا وہ جس کا گھر بیہودگیوں کی نجاسات میں گھرا ہوا ہے۔ وہ جس کے گھر میں آیۂ

تطہیر نازل ہوئی یا وہ جس کے گھر میں لہو ولعب کی محفلیں جمتی ہیں۔ تم بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو رہے جس میں قریش مبتلا تھے۔ وہ پیغمبر اکرم کو قتل کرنا چاہتے تھے اور تم نواسۂ رسول کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ ان کے لیے پیغمبر اکرم کو قتل کرنا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک امیر المومنینؑ زندہ تھے۔ تم امام حسینؑ کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں اس وقت تک قتل نہیں کر سکتے جب تک میں زندہ ہوں۔ آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اگر امام حسینؑ کو شہید کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ پہلے مجھے قتل کر دو اور میری گردن کو جسم سے الگ کر دو تا کہ تمہیں تمہارا مقصود مل جائے۔ اللہ تمہیں اپنے مقصد میں ناکام اور نامراد رکھے۔ تمہاری اولادوں کی عمریں برباد ہو جائیں۔ تم پر تمہارے اجداد پر اللہ کی لعنت ہو کہ نواسۂ رسول کو قتل کرنا چاہتے ہو۔"

شب عاشور حضرت زہیر بن قین کی گفتگو:

جب شب عاشور کی نصف شب گزر چکی تو حضرت زہیر بن قین خیمۂ حضرت عباسؑ پر آئے اور آواز دی۔ حضرت عباسؑ خیمہ سے باہر تشریف لائے تو حضرت زہیر نے کہا: "مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، اسے بیان کرنا چاہتا ہوں، آپ تھوڑی دور چلیں۔" دونوں بہادر گھوڑوں پر روانہ ہوئے۔ جناب زہیر نے گفتگو شروع کی "اے عباسؑ! جب خاتونِ جنت کا انتقال ہو گیا تو مولائے کائنات نے اپنے بڑے بھائی جناب عقیل سے کہا کسی بہادر خاندان کی پرہیزگار بی بی کا انتخاب کرو کہ اللہ مجھے بہادر بیٹا عطا کرے جو میرے حسینؑ کے کام آئے۔ اے عباسؑ! اسی دن کے لیے مولا نے آپ کو رکھا تھا۔ دیکھیے نصرت حسین علیہ السلام میں کوئی کمی نہ ہو۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عباسؑ نے جوشِ شجاعت میں جو انگڑائی لی تو رکابوں کے تسمے ٹوٹ گئے اور کہنے لگے "اے زہیر تم مجھے شجاعت دلا رہے ہو! تم حسین علیہ السلام سے بہت محبت کرتے ہو، میں تو اپنے کو ان کا غلام کہتا ہوں۔ کل دیکھنا! اگر آقا نے

اذن دیا تو ان فوجوں کو دارالامارہ سے ٹکرا دوں گا۔"

مآخذ:

(۱) "صحیفۂ وفا حضرت ابوالفضل العباسؑ" مولف: سید عبدالرزاق موسوی المقرّم، ترجمہ: سید حسین مہدی حسینی، ناشر: دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان، ناظم آباد، کراچی۔

(۲) "بیان القرآن" ترجمہ و تشریح الحاج سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، پبلشر حاجی احسان، مرتبہ نذیر قریشی، اذکار محراب و منبر، لاہور۔

(۳) "خورشید وفا" مولف: حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی، ناشر: باب العلم دارالتحقیق، فروغ ایمان ٹرسٹ، مسجد باب العلم، شمالی ناظم آباد، کراچی۔

(۴) "سفینۃ الشہداء فی مقتل حسینؑ" مولف: مرزا محمد صابر شکیب۔

شیرِ خدا کی شیر دل بیٹی، جنابِ زینب سلام اللہ علیہا

سامانِ حرب، لشکر و سالار کے بغیر
زینبؑ نے جنگ جیتی ہے تلوار کے بغیر
قمر حسنین

کچھ عرصہ قبل ہمارے دیرینہ دوست جناب محمد اکرام صاحب نے ایک ایس ایم ایس ارسال کی، جس کا متن کچھ اس طرح تھا:

''عورت اگر بیٹی ہے تو رحمت، اگر بیوی ہو تو شوہر کی نصف ایمان کی وارث، اگر ماں ہے تو اس کے قدموں تلے جنت لیکن:

جناب سیدہ فاطمہ زہراؑ کی شان دیکھیے۔ اس باپ کے لیے رحمت جو خود رحمت اللعالمین ہیں۔ اس شوہر کے لیے نصف ایمان جو خود ''کلِ ایمان'' ہیں۔ اور آپ کے قدموں میں ان بیٹوں کی جنت ہے جو خود جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔''

ہر عورت کے یہ تین روپ تو عام ہیں یعنی وہ سب سے پہلے کسی کی بیٹی ہو گی۔ پھر شادی کے بعد کسی کی بیوی بنے گی اور اس کے بعد کسی کی ماں کا مقام حاصل کرے گی۔ جناب سیدہ کے یہ تین مرتبے دنیا کے عظیم ترین مراتب ہیں جو کہ اوپر بیان کیے گئے۔ عورت کا ایک روپ اور ہے وہ ہے بہن کا۔ عورت کسی نہ کسی کی بہن بھی ہوتی ہے۔ لیکن جناب سیدہؑ، سید الکونین کی اکلوتی بیٹی ہونے کے ناطے کسی کی بہن نہیں۔ تو کیا ہم یہ فرض کرلیں کہ

نعوذ باللہ آپؑ کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکا۔نہیں ایسا نہیں ہے۔ جناب فاطمہؑ کو یہ مقام ومرتبہ جناب زینبؑ کے ذریعہ حاصل ہوا۔کائنات میں کوئی بہن اس مقام ومنزلت کی نظر نہیں آتی جیسی کہ جناب زینبؑ ہیں۔ یہ بات کوئی اعتقادی نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت پر مبنی ہے۔ جیسا کہ اعتراض کرنے والوں نے یہ اعتراض کیا کہ ''شہادت'' ایک عظیم نعمت ہے مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ طبعی موت سے ہمکنار ہوئے اس لیے شہادت کی منزلت حاصل نہیں کرسکے۔ علماء نے اس کی توضیح اس طرح کی ہے کہ شہادت دو طرح کی ہوتی ہے ایک جہری اور ایک سرّی۔ جہری شہادت وہ ہے جو ایک مومن کسی دشمن سے دوبدو جنگ کرتے ہوئے اعلانیہ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرتے ہوئے حاصل کرے۔ سری شہادت اسے کہتے ہیں جو کوئی مومن اپنے دشمن کی سازش کے نتیجے میں اعلانیہ نہیں بلکہ مخفی طریقہ سے پائے۔ حضور اکرمؐ کے نواسۂ اکبر جناب امام حسنؑ نے دشمن کے دیے ہوئے زہر سے شہادت کو گلے لگایا اور نواسۂ اصغر جناب امام حسینؑ نے علی الاعلان میدان کربلا میں اپنے انصار واقرباء کے ساتھ سر کٹا کے شہادتِ عظمیٰ حاصل کی اور سید الشہداء کہلائے۔ اس طرح جناب رسالت مآبؐ نے اپنے دونوں نواسوں کے توسط سے دونوں طرح کی شہادت کا مقام ومرتبہ حاصل کیا۔ شاید اسی لیے وہ فرمایا کرتے تھے کہ حسنینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسنینؑ سے ہوں۔ (تفصیل کے لیے شیخ محدث دہلوی کی کتاب ''سرّ الشہادتین'' سے رجوع فرمائیں)۔

اس مثال سے ثابت یہ کرنا مقصود ہے کہ جس طرح دونوں طرح کی شہادتوں کا مقام و مرتبہ حضور اکرمؐ نے اپنے نواسوں کے توسط سے پایا اسی طرح ایک عظیم الشان بہن کا درجہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے جناب زینبؑ کے ذریعہ حاصل فرمایا۔

قلم اپنے آپ کو جناب زینبؑ کے فضائل رقم کرنے کے میں بہت مجبور محسوس کرتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سلسلہ کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ مدینہ میں جناب زینبؑ کی

ولادت کے زمانے میں سرپرست خاندان جناب رسالت مآبؐ موجود تھے۔ خانۂ زہراؑ و علیؑ میں پہلی بچی کی آمد تھی۔ مولائے کائنات دیکھ چکے تھے کہ حضور اکرم اپنی جگر گوشہ کی ولادت پر کتنا مسرور ہوئے تھے۔ چنانچہ وہی فرحت وانبساط یہاں بھی تھا۔ شہزادی ابھی چھوٹی سن تھیں کہ شفیق نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ناناؐ کے جاتے ہی شفیق ماں جو کائنات کی افضل ترین خاتون کا مرتبہ رکھتی تھیں چل بسیں۔ اس کے بعد کے حالات سب جانتے ہیں کہ اس خاندان نے کیسے کیسے مصائب جھیلے۔ باپ کی ظاہری خلافت کے دوران کوفہ آگئیں۔ مدینہ میں بھی اور یہاں بھی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی اثناء میں اپنے عم زاد جناب جعفر طیارؓ کے صاحبزادے جناب عبداللہ کے عقد میں آئیں۔ سن چالیس ہجری میں باپ کی شہادت کا سانحہ جھیلا اور سن پچاس ہجری میں اپنے بھائی حضرت امام حسنؑ کی المناک شہادت کا منظر دیکھا۔ شاید ہی کسی بہن نے یہ دیکھا ہو کہ جنازہ گھر سے نکلا ہو اور پھر واپس اس حالت میں آیا ہو کہ اس میں تیر پیوست ہوں۔ قصور صرف یہ تھا کہ نواسہ نانا کے قریب دفن ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ جنازہ سے تیر نکالے گئے اور دوبارہ تکفین کے بعد جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ یہ وہ بہن تھی جو اپنے بھائیوں سے محبت کے باب میں بے نظیر تھی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی۔ اب مرکز نظر حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ اور ان کی اولادیں تھیں۔ حضرت امام حسینؑ کی اولادوں میں جناب علی اکبرؑ سے سب سے زیادہ انس تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ شہزادہ جناب رسالت مآبؐ سے بہت مشابہ تھا۔ چنانچہ اس کو گہوارے سے اپنی تحویل میں رکھا اور اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا۔

اب کربلا کا امتحان درپیش تھا جس کی پیشین گوئی ماں، باپ اور ناناؐ پہلے کر چکے تھے چنانچہ عظیم ماں باپ کی یہ عظیم بیٹی اس سانحہ سے نمٹنے کے لیے ہمہ تن تیار تھی۔ جب حضرت امام حسینؑ نے مدینہ سے رخصت کا ارادہ کیا تو بہن سے بھی مشورہ کیا۔ چاہنے والی بہن

بچپنا سے ہر ہر قدم پر بھائی کے ہمراہ رہی تھی اب کیسے بھائی کا ساتھ چھوڑ دیتی۔ ہادی برحقؐ، باپ اور ماں کی وصیتیں بھی یہی تھیں کہ امام حسینؑ کو کبھی تنہا نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ شوہر کی رضامندی لے کر بھائی کے ساتھ عازم سفر ہوئیں۔ پہلے مکہ اور پھر کوفہ کا رخ کیا۔ مگر حضرت امام حسینؑ پر تو زمین تنگ کی جا رہی تھی۔ کربلا پہنچ کر عجب حال ہوا۔ فرماتی تھیں:

"بھائی! یہ کیسی سرزمین ہے۔ یہاں سے تو مجھے آپ کے خون کی بو آتی ہے۔"

ایک حساس دل ہی اندازہ کرسکتا ہے کہ ایک چاہنے والی بہن نے جب بھائی کو اتنے مصائب میں گھرا ہوا دیکھا ہوگا تو اس پر کیا گزری ہوگی۔ تھیں تو حیدر کرارؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ کی بیٹی۔ بے جگری سے حالات کا مقابلہ کیا۔ بھائی کا بھرپور ساتھ دیا۔ حوصلہ بڑھایا اور ہر ہر امتحان میں برابری سے شریک کار رہیں۔

عصر عاشور جب امام مظلومؑ دشمنوں میں ہر طرف سے گھر گئے اور کثرت اژدہام سے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو شہزادیؑ بے چین ہو کر مقتل میں پہنچ گئیں اور ایک نسبتاً اونچے مقام سے (جسے بعد میں تلّہٴ زینبیہ کہا جانے لگا اور جہاں اب اس کی یادگار بنادی گئی ہے) کہنے لگیں: "کاش آسمان زمین پر گر پڑتا اور پہاڑ صحرا پر آجاتا۔" (لہوف)۔ پھر آپ نے عمر ابن سعد سے للکار کر کہا: ابنِ سعد! حسینؑ قتل ہو رہے ہیں اور تو دیکھ رہا ہے۔ ابنِ سعد کی آنکھوں سے (مگرمچھ کے) آنسو جاری تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور جناب زینبؑ کی طرف سے منہ پھیر لیا (بحار الانوار)۔ شیخ مفید لکھتے ہیں کہ جب ابن سعد نے جواب نہیں دیا تو شہزادی زینبؑ مجمع سے مخاطب ہوئیں: "تم لوگوں پر وائے! کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں ہے؟" اس پر بھی کسی کا کوئی جواب نہ آیا (ارشاد مفید)۔

فاضل حائری کے مطابق اسی دوران جناب زینبؑ افتان وخیزاں قتل گاہ کے نشیب میں پہنچیں۔ بھائی کو سراپا زخمی مقتل کی زمین پر پڑے ہوئے دیکھ کر نالہ وفریاد کرنے لگیں۔

فرمایا: ''کیا تم میرے بھائی حسینؑ ہو؟ کیا تم میرے ماں جائے ہو؟ کیا تم میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو؟ کیا تمہیں ہمارے سرپرست، نگہ بان اور سہارا ہو؟ کیا تم محمد مصطفیٰؐ کے فرزند اور علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے ہو؟'' لاتعداد زخموں کی وجہ سے حضرت امام حسینؑ پر غشی کی سی کیفیت تھی۔ آپؑ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جناب زینبؑ نے گریہ شروع کیا اور فرمایا: ''بھیا! تمہیں نانا رسول اللہؐ، بابا علی مرتضیٰؑ اور اماں فاطمہؑ کا واسطہ، مجھ سے بات کرو۔ امامؑ نے بہن کے اصرار پر بمشکل آنکھیں کھولیں اور فرمایا: ''بہن یہ فراق اور جدائی کا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جس کا وعدہ میرے جد نے مجھ سے کیا تھا۔ اور وہ مجھ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔'' پھر آپؑ پر غشی طاری ہوگئی۔ اس وقت جناب زینبؑ نے آپؑ کی پشت کی طرف بیٹھ کر آپؑ کو اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ سید الشہداء چونکے اور فرمانے لگے: ''بہن تمہاری گریہ و زاری سے میرا دل ٹوٹتا ہے اور اندوہ بڑھتا ہے۔ صبر کرو اور چپ ہو جاؤ۔ جناب زینبؑ نے فرمایا: ''بھیا! میں کیسے صبر کروں اور کیوں کر خاموش رہوں جب کہ آپ کی یہ حالت ہے۔''

ابھی بھائی اور بہن میں باتیں ہو رہی تھیں کہ جناب زینبؑ پر تازیانہ کا وار ہوا۔ آپؑ نے مڑ کر دیکھا تو شمر نے کہا کہ بھائی کو چھوڑ کر ہٹ جاؤ ورنہ تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔ شہزادی نے جلال کے عالم میں فرمایا: ''تو میرے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے تو آ پہلے مجھے قتل کر دے۔ اس نے ظلم و ستم کے ذریعہ آپؑ کو امام حسینؑ سے الگ کیا (معالی السبطین)۔ غالباً یہی وہ وقت ہوگا جب امام حسینؑ نے جناب زینبؑ کو گوشۂ چشم سے واپس جانے کا اشارہ کیا ہوگا۔

قتلِ حسینؑ کے بعد بھی لشکرِ یزید کے سینوں کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی اور انہوں نے اہلِ حرم کے خیموں میں آگ لگا دی۔ اس موقع پر جناب زینبؑ نے جناب سید سجادؑ سے پوچھا کہ اب تمہارا فتویٰ کیا ہے؟ آپؑ نے جواب دیا کہ اب آپ سب کو باہر نکل جانا چاہیے۔ ساری بیبیاں باہر نکل گئیں لیکن جناب زینبؑ سید سجادؑ کے پاس موجود رہیں کیوں

کہ آپؑ اس وقت اٹھنے بیٹھنے سے قاصر تھے۔ راوی کہتا ہے کہ ایک بی بی جلتے ہوئے خیمہ کے دروازے پر آگ میں گھری ہوئی کھڑی تھی اور داہنے بائیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ ساری بی بیاں تو چلی گئیں، آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ اس بی بی نے جواب دیا کہ ہمارا مریض (بھتیجہ) اس جلتے ہوئے خیمہ کے اندر ہے اور اس وقت وہ اٹھنے بیٹھنے سے قاصر ہے (معالی السبطین)۔

ظلم وستم کا یہ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ خیموں کو لوٹنے کے بعد عورتوں، بچوں اور بیمار امامؑ کو قیدی بنالیا گیا اور انہیں مزید اذیت دینے کی غرض سے مقتل سے گزارا گیا۔ اس موقع پر جناب زینبؑ نے غمگین دل سے فریاد کی۔ فرمایا: ''اے محمد مصطفیؐ! آپ پر تو آسمان کے فرشتوں نے نماز پڑھی لیکن آپ کا حسینؑ خون میں تربدن ٹکڑے ٹکڑے زمین گرم پر پڑا ہے اور آپ کی نواسیاں قیدی بن کر جارہی ہیں۔ اے اللہ تیری فریاد ہے۔ حضرت محمد مصطفیؐ اور حضرت علی مرتضیؑ اور حضرت حمزہ سید الشہداء کی دہائی ہے۔ وامحمداہ! آپ کا حسینؑ قتل ہوگیا۔''

شمر اور ابن سعد کے ساتھ ان مکالموں اور ابن زیاد و یزید جیسے فرعون مزاج حاکموں کے سامنے خطبات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جناب زینبؑ ان ظالموں سے کبھی مرعوب نہیں ہوئیں۔ ان کے کلام میں شیر خدا کی سی للکار ہے۔ جو کام جناب سیدہؑ نے اپنے دعوئے میراث سے، حضرت علیؑ نے اپنے خطبات سے اور جناب سجادؑ نے اپنی دعاؤں سے لیا وہ جناب زینب نے اپنے مکالموں اور خطبات سے لیا۔

جناب زینبؑ نے کوفہ، شام کے درباروں کے علاوہ بازاروں میں بھی وہ عظیم الشان خطبے دیے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایک عورت ہونے کے ناطے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ خاتون تاریخ کا رخ اس طرح پلٹ کر رکھ دے گی۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ عورتیں اور بچے اور یہ بیمار امام اب ہمارا کیا بگاڑ پائیں گے۔ انہیں اسیر کر کے اور درباروں،

بازاروں میں تشہیر کر کے ان کی ہمتیں پست کر دی جائیں گی اور دیکھنے والوں پر بھی یہ اثر ہوگا کہ کوئی ہماری غلط روش کو چیلنج نہیں کر سکے گا۔ مگر دشمن کے حربے جس قدر شدید ہوتے گئے، اہلِ حرم کے حوصلے ویسے ویسے بڑھتے گئے۔ انہوں نے ہر ہر مقام پر ایسے ایسے پراثر خطبے ارشاد کیے کہ دشمن کے ایوان لرز کر رہ گئے۔

جنابِ زینبؑ نے دربارِ یزید میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

''تمام تعریفیں اللہ پر زیب دیتی ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے، درود و سلام ہو رسول اللہؐ اور ان کی آلؑ پر۔ اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا انجام جنہوں نے اعمال بدانجام دیے برا ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ اے یزید کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم پر زمین و آسمان تنگ کر کے اور قیدی بنا کر پھرانے سے ہم اللہ کے سامنے رسوا ہو گئے اور تیری عظمت میں اضافہ ہو گیا اور کیا تیرے یہ اعمالِ بد تیری بڑائی کی دلیل ہیں؟ جب تو نے یہ دیکھا کہ تو نے دنیا پالی اور خوش حال ہو گیا تو اس پر گھمنڈ کرنے لگا کہ تیری خواہش کے مطابق ظاہری شان و شوکت تجھے حاصل ہو گئی۔ تو کچھ دن توقف کر۔ کیا تو اللہ کے اس فرمان کو بھول گیا کہ جو اس نے فرمایا ہے، یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جو انہوں نے کفر اختیار کیا ہے اور گناہوں میں مبتلا ہیں اللہ نے جو انہیں چند روز کی مہلت دی ہے یہ ان کی خوش نصیبی ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کو اس لیے مہلت دی ہے کہ وہ زیادہ گناہوں کا ارتکاب کریں، ان کے لیے اللہ کا دردناک عذاب ہے۔

اے یزید کیا یہی تیرا انصاف ہے کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردہ میں رکھا ہے اور دخترانِ رسول کو قید کر کے بے مقنعہ و چادر شہروں اور بازاروں میں پھرایا اور ان کی تشہیر کی۔ ہر ذلیل و شریف کی نظریں ان کے چہروں پر پڑ رہی تھیں جب کہ ان کے مردوں میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا جو ان کی مدد و حمایت کرے۔ اس بے رحم کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی

جس کی پرورش ہی شہیدوں کے خون سے ہوئی ہو اور برگزیدہ لوگوں کے جگر کو چبایا گیا ہو، وہ ہماری دشمنی سے کس طرح باز آسکتے ہیں جو ہم سے کینہ و حسد اور بغض رکھتے ہیں۔ اے یزید! تو دربار میں بیٹھ کر نوجوانان بہشت کے سردار ابا عبداللہ کے دندان اقدس پر چھڑی مار رہا ہے اور کہتا ہے کاش تیرے آباواجداد زندہ ہوتے جو بدر میں مارے گئے وہ تیری تعریف کرتے اور خوش ہو کر کہتے اے یزید تیرے ہاتھ کبھی شل نہ ہوں۔ اے یزید تو نے ذریت محمدؐ اور اولاد عبدالمطلب کا خون بہا کر ہمارے دل کے زخموں کو تازہ کر دیا، تو جو اپنے بزرگوں کو پکارتا ہے تو بہت جلد ان کے جیسے انجام کو پہنچ جائے گا۔ اے اللہ! تو ان ظالموں سے انتقام لے اور انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر جنہوں نے ہمارا خون بہایا اور ہمارے مددگاروں کو قتل کیا۔ اے یزید! اللہ کی قسم تو نے اس اقدام سے کسی کو اذیت نہیں دی بلکہ تو نے اپنا نقصان کیا ہے اور خود کو زخمی کیا ہے اور اپنا ہی گوشت پارہ پارہ کیا ہے، تو نے اپنی عاقبت اپنے ہاتھوں برباد کی ہے، تو بہت جلد رسول اللہؐ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ کیونکہ تو نے ان کی عترت کا خون بہایا ہے اور ان کی بے حرمتی کی ہے۔ اس کا گناہ تیری گردن پر ہوگا۔ اللہ عنقریب اہل بیت اور ان کی جماعت کو ایک جگہ جمع کرے گا اور جو تو نے ان پر ظلم کیا ہے اس کا تجھ سے انتقام لے گا۔ اللہ فرماتا ہے جو لوگ اس کی راہ میں شہید کیے گئے ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی بارگاہ سے رزق پاتے ہیں۔

تیرے لیے یہی بہت ہے کہ جب اللہ تیرا حاکم ہوگا اور فیصلہ کرنے والا ہوگا اور حضرت محمدؐ تیرے خلاف مقدمہ دائر کریں گے، جبرائیل ان کے پشت پناہ ہوں گے، بہت جلد ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جو تیرے مددگار رہے، اور تجھے تخت پر بٹھایا اور مسلمانوں پر مسلط کیا۔ عنقریب تجھے معلوم ہو جائے گا کہ ظالموں کا انجام کیسا بد ہے اور تیری آخرت کتنی بری ہے۔ یہ انقلاب زمانہ ہے کہ میں تجھ جیسے حقیر انسان سے گفتگو پر مجبور ہوں لیکن تیرا مقام

جانتی ہوں اور تجھے حقیر سمجھتی ہوں۔ ہماری آنکھیں گریہ کناں ہیں، ہمارے سینوں میں غم کی آگ بھڑک رہی ہے۔ آہ! یہ بات کس قدر تعجب آمیز ہے کہ شیطانی گروہ کے ہاتھوں اللہ کے طیب و طاہر گروہ کو شہید کیا گیا اور اس شیطانی گروہ کے دہن نے ہمارا گوشت چبایا اور پاکیزہ جسموں پر جو زمین پر پڑے ہیں جنگل کے جانور فریاد کر رہے ہیں اور ان کی زیارت کو آرہے ہیں۔ اے یزید تو نے ہم پر مال غنیمت سمجھ کر قبضہ کیا، عنقریب تجھ سے اس کا بدلہ لیا جائے گا اور تجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ہم اس کی بارگاہ میں شکایت کریں گے۔ وہی ہماری پناہ گاہ ہے۔ تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا۔ تو چاہے جتنی کوشش کیوں نہ کرلے، ہماری شریعت کو نہیں مٹا سکتا۔ تو کبھی ہمارے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ تو نے جو بے شرمی کے داغ اپنے دامن پر لگائے ہیں کبھی نہیں دھو سکتا۔ تیری رائے پست اور تیری حیثیت نہایت گری ہوئی ہے اور تیری زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ اس دن تیری جماعت بکھر جائے گی جب منادی ندا دے گا۔ اللہ کی لعنت ہو ظالمین پر حمد و ثنا ہے پروردگار عالم کی اور اس کا شکر ہے جس نے ہماری ابتدا سعادت و نصرت سے کی اور ہماری انتہا شہادت اور رحمت پر مکمل کی۔ ہم اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ شہیدان راہ حق کو اجر و ثواب عطا فرمائے اور ان شہیدوں کے مراتب کو بلند کرے اور ہمیں اپنے نیک جانشینوں کے ساتھ قائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ وہی ہمارے لیے کافی اور وہی ہمارا بہترین وکیل ہے۔"

شہزادی زینب سلام اللہ علیہا کا یہ خطبہ علم و معرفت سے بھرپور ہے۔ اس خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمرانی، ہادیانِ برحق کی پیغام رسانی اور ان کی جدوجہد کے علاوہ حقوق انسانی کی نشاندہی بے حد تفصیل سے کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطبہ تاریخ کا سنہری حصہ بن گیا ہے۔

۲۶ دسمبر ۲۰۱۳ء روزنامہ "جنگ" کراچی میں جناب مظہر برلاس اپنے کالم "چہرہ"

میں ''زرد پتوں پہ رنگ سارے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔جنگ عظیم دوم میں جب بہت زیادہ قتل و غارت ہو چکی تھی تو دنیا کے طاقت ور ترین ملکوں کے حکمرانوں نے سوچا کہ اب دنیا میں ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو انسانی حقوق کا خیال رکھ سکے تاکہ ہر ایک کے حقوق محفوظ ہو سکیں۔ اسٹالن، روز ویلٹ، ڈیگال اور چرچل کی کوششوں سے اقوام متحدہ بنانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس کے حکمرانوں نے جب ٹھان لیا تو یہ ادارہ بن گیا۔ اقوام متحدہ کے قیام کے بعد ایک مسئلہ درپیش تھا کہ انسانی حقوق کا چارٹر کیسے ترتیب دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے دنیا بھر سے ڈھائی تین سو دانشوروں کو مدعو کیا گیا۔ ان دانشوروں کا تعلق مختلف ممالک اور مختلف مذاہب سے تھا۔ یہ دانشور تین مہینوں تک میٹنگز کرتے رہے۔ پھر ایک دن تمام دانشور متفقہ طور پر ایک چارٹر مرتب کر کے لے آئے۔ انسانی حقوق کا یہ چارٹر بہت پسند آیا تو طاقتور حکمرانوں نے پوچھا کہ یہ کہاں سے اور کیسے مرتب کیا ہے۔ دانشوروں نے جواب دیا کہ آج سے تیرہ سو سال قبل عراق کے صحرا میں مسلمانوں کے نبی محمدؐ کے ایک نواسے حسینؑ کو ان کے اپنے ہی لوگوں نے شہید کر ڈالا تھا۔ اس شہادت کے بعد حسینؑ کی ایک بہن سیدہ زینبؑ کو وقت کے حکمران یزید کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ اس مرحلے پر سیدہ زینبؑ نے جو خطبہ دیا، پوری انسانی تاریخ میں انسانی حقوق پر اس سے بہتر خطبہ نہیں ملا، سو ہم حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک کی پوری تاریخ چھان کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی حقوق کا بہترین چارٹر یہی خطبہ ہے۔ دانشوروں کی یہ تمام گفتگو اقوام متحدہ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، جس کسی کو شک ہو وہ جینوا جا کر دیکھ سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے قیام کے وقت انسانی حقوق کے حوالے سے کیا کچھ ہوا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ آج سب سے زیادہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں مسلمان ملکوں میں ہو رہی ہیں اور ہمارے ہاں تو بہت ہی زیادہ ہیں۔

ہمارے ہاں نہ خواتین کے حقوق محفوظ ہیں، نہ اقلیتیں خود کو محفوظ تصور کرتی ہیں۔ رہے غریب تو انہیں اپنے حقوق کا علم ہی نہیں ہے۔ یہ اس ملک کی کہانی ہے، جہاں ہر شام دانشود اور سیاست داں پانی میں مدھانی ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں، روز مکھن نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کام پچھلے کئی سالوں سے جاری ہے مگر ہنوز کامیابی نہیں مل سکی اور نہ ہی دور دور تک کوئی امکان ہے کہ کامیابی مل سکے۔۔۔۔۔"

جناب زینبؑ کی مصائب سے بھرپور زندگی کا تجزیہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان مخدومہ کی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت کون سی تھی۔ اس موقع پر مولانا سید ابوالحسن نقوی صاحب کا جامع مسجد صاحب الزمانؑ، اسلام پورہ، لاہور میں دیا ہوا ایک خطبہ جمعہ یاد آرہا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ جناب زینبؑ کی شہادت عصرِ عاشور ہو گئی تھی۔ مثال یوں ہے کہ ہر حلال جانور کا ذبیحہ ہوتا ہے۔ مردہ جانور کا گوشت حرام ہے۔ پانی سے الگ ہو کر مر جانے والی مچھلی مردار نہیں کیوں کہ اس کا ذبیحہ یہی ہے کہ اسے پانی سے الگ کر دیا جائے۔ جس وقت جناب زینبؑ کے سر سے چادر چھین لی گئی یقیناً یہ صدمہ ان کے لیے مرگ ناگہانی سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت یہ المیہ رونما ہوا شہزادی اسی وقت شہید ہو گئیں۔

مآخذ

"حدیث کربلا" از علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی۔ "سفینۃ الشہداء فی مقتل الحسینؑ" از مرزا محمد صابر خطیب اور روزنامہ "جنگ" کراچی مورخہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۳)۔

قم کی معصومہ شفاعت کی ضمانت فاطمہؑ

قم کی معصومہ شفاعت کی ضمانت فاطمہؑ

عالمہ، پروردۂ آغوشِ عصمت فاطمہؑ

ایران کے مقامات مقدسہ میں آستانۂ قدس مشہد کے بعد ''قم'' وہ دوسرا اہم مقام ہے جہاں ساتویں امامؑ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی صاجزادی جناب فاطمہؑ جو معصومۂ قم کے نام سے معروف ہیں کا روضۂ مبارک ہے۔ آپ کے برادر معظم امام ہشتم حضرت امام علی رضاؑ کا فرمان ہے کہ میرے روضے کی زیارت کرنے والے مشہدِ مقدس آنے سے پہلے میری ہمشیرہ شہزادی فاطمہ معصومہؑ کی زیارت سے مشرف ہونے کے لیے قم میں حاضری دیں۔

چنانچہ آج بھی ایران زیارتوں پر جانے والے پہلے قم اور اس کے بعد مشہد جاتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت منسوب ہے جسے آپؑ نے اس وقت ارشاد فرمایا جب حضرت معصومہؑ کی ولادت نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ آپؑ کے والد بزرگوار حضرت موسیٰ کاظمؑ بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

امام ششمؑ نے فرمایا: ''جان لو کہ اللہ کا ایک حرم (گھر) ہے وہ مکہ ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا بھی ایک حرم ہے اور وہ مدینہ ہے اور امیر المومنین (علی ابن ابی طالبؑ) کا (بھی) ایک حرم ہے وہ کوفہ ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میرے بعد میرا اور میرے بیٹوں کا حرم ''قم'' ہے۔ جان لو کہ قم ہمارا چھوٹا کوفہ ہے۔ جان لو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ان میں تین دروازے

قم کی طرف (کھلتے) ہیں۔ میرے فرزند موسیٰ کاظمؑ کی ایک بیٹی بنام "فاطمہؑ" قم میں رحلت کرے گی اس (فاطمہ معصومہؑ) کی شفاعت سے ہمارے تمام شیعہ جنت میں داخل ہوں گے۔" (بحارالانوار، جلد ۶۰ صفحہ ۲۱۶)۔

اس حدیث کے خاص نکات:

۱۔ قم ائمہ علیہم السلام کا حرم ہے۔

۲۔ قم اہل بیت علیہم السلام کا چھوٹا کوفہ ہے

امامؑ نے قم کو کوفہ سے اس لئے مماثل قرار دیا ہے کہ امام زمانہؑ جب ظہور فرمائیں گے تو کوفے میں اپنی حکومت قائم کریں گے اور قم دوسری جگہ ہوگی جہاں آپؑ کی حکومت حقہ قائم ہوگی۔ اسی وجہ سے امام عصر عجل اللہ تعالیٰ کے عاشق مسجد سہلہ میں کوفہ کے قریب اور مسجد جمکران میں قم کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں۔

۳۔ جنت کے آٹھ میں سے تین دروازے قم کی طرف کھلتے ہیں۔

امامؑ کا یہ اشارہ قم کے "دینی علوم کا مرکز" قرار پانے کی طرف ہے۔ یعنی یہ شہر دینی علوم کا مرکز بنے گا اور علوم محمدؐ و آل محمدؐ اس کی وجہ سے فروغ پائیں گے۔

شہرِ قم جو مرکز و مصدر علوم دیں کا ہے
بالیقیں ہے آپؑ کے قدموں کی برکت فاطمہؑ
شہرِ قم کی سمت کھلتے ہیں کئی در خلد کے
شہر ہے یہ آپؑ کا یا باب جنت فاطمہؑ

۴۔ میرے خاندان کی ایک خاتون قم میں رحلت کرے گی۔

امامؑ کی یہ بشارت شہزادیؑ کی ولادت سے بہت پہلے دی گئی، بلکہ نام تک بتا دیا۔

۵۔ اس کی شفاعت سے ہمارے تمام شیعہ جنت میں داخل ہوں گے۔

عالمین کی خواتین میں ''حق شفاعت'' صرف جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو حاصل ہے اور جناب فاطمہ معصومہؑ جناب فاطمہ زہراؑ کی عظمت وجلالت سے اس قدر مشابہت رکھتی ہیں کہ یہ اعزاز اور فضیلت آپؑ کو بھی حاصل ہوگئی۔

ائمہ طاہرین کا یہ دستور تھا کہ وہ اکثر بیٹوں کے نام محمد، علی اور بیٹیوں کے نام جناب فاطمہ زہراؑ کے نام نامی پر رکھتے تھے۔ یہ ان شخصیات کے مقامِ عظیم کو جانتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے بھی اپنی چاروں بیٹیوں کے نام اپنی جدہ معظمہ جناب فاطمہ زہراؑ کے نام پر فاطمہؑ رکھے۔ اس طرح آپ کی سب سے بڑی بیٹی فاطمہ کبریٰ کے نام سے موسوم ہوئیں۔ معصومہ کا لقب حضرت امام رضاؑ نے اپنی بہن کو عطا فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا: من زار المعصومہ بقم کمن زارنی۔ (جس نے بھی قم میں حضرت معصومہؑ کی زیارت کی، مثل اس کے ہے جیسے میری زیارت کی ہو)۔

کریمۂ اہلِ بیتؑ:

شہزادیؑ کی معرفت رکھنے والے اور چاہنے والے آپؑ کو کئی صدیوں سے آج تک ایک خاص لقب سے منسوب کرتے ہیں اور وہ ہے ''کریمۂ اہلِ بیتؑ''۔ اس لقب کو وہ ایک محترم بزرگ کے سچے خواب سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس میں یہ لقب معصومین علیہم السلام کی طرف سے بی بیؑ کو عطا کیا گیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ آیت اللہ سید محمود مرعشی نجفی مرحوم (متوفی ۱۳۳۸ھ) ایک عظیم عالم تھے۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ جیسے بھی ہو بی بیؑ فاطمہ زہراؑ کی قبر کا پتا لگائیں۔ یہ جاننے کے لیے آپ نے نہایت مجرب عمل انجام دیا۔ چالیس شب آپ نے مدام وہ عمل انجام دیا تا کہ خدا آپ کو بی بی زہرا سلام اللہ علیہا کی قبر سے آگاہ فرمائے۔ چالیسویں رات جب آپ توسل کے بعد آرام کی غرض سے لیٹ گئے تو خواب میں امام باقر علیہ السلام یا امام جعفر صادق علیہ السلام کی زیارت ہوئی۔

امامؑ نے ان سے فرمایا "کریمہ اہل بیتؑ سے وابستہ ہو جاؤ۔" آیت اللہ مرعشی سوچ کر بولے کہ "یا امامؑ! آپ کے قربان جاؤں میں نے بھی اس وظیفے کو اسی لیے انجام دیا ہے تا کہ بی بی زہراؑ کی قبر کو دریافت کرلوں اور ان کی زیارت سے مشرف ہو جاؤں۔" امامؑ نے فرمایا: "میرا مطلب حضرت معصومہؑ کی قبر شریف ہے جو کہ قم میں ہے۔" پھر مزید فرمایا: "خدا نے کسی مصلحت کی بنا پر حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی قبر کو مخفی رکھا ہے اور اسی لیے قبر حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کو قبر شریف حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی تجلی گاہ قرار دیا ہے۔ اگر طے یہ ہوتا کہ حضرت زہراؑ کی قبرؑ ظاہر ہو تو خداوند عالم جو بھی جلال و عظمت ان کی قبر پر نازل کرتا وہی جلال و عظمت حضرت معصومہ کی قبر پر نازل کیا ہے۔"

مرحوم مرعشی جب خواب سے بیدار ہوئے تو فوراً اپنے گھر والوں کے ہمراہ قم المقدسہ بی بی معصومہؑ کی زیارت کو آئے۔ آپ کے فرزند آیت اللہ سید شہاب الدین مرعشی نجفی نے نجف کو چھوڑ کر قم کو اپنی اقامت گاہ بنایا اور ہمیشہ بی بی کریمہ اہل بیتؑ کے جوار میں زندگی بسر کی، ایک بہت بڑے مدرسے اور کتاب خانے کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں وہیں آپ نے رحلت فرمائی۔

شفیعہ روز جزا:

مسلمانان عالم عام طور سے اور اہل تشیع خاص طور سے شفاعت کے معتقد ہیں۔ قیامت میں شفاعت کے بلند ترین درجے پر رسول اکرمؐ فائز ہوں گے۔ قرآن نے آپؐ کے اس مرتبے کو "مقام محمود" سے تعبیر کیا ہے۔ آپؐ کے بعد دو افراد کی شفاعت اتنی وسیع بیان کی گئی ہے کہ وہ تمام اہل محشر کو اس میں شامل کرلیں گے۔ (۱) خاتون محشر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا۔ (۲) شفیعہ روز جزا فاطمہ معصومہ سلام اللہ علیہا۔ شفاعت کا یہ حق جناب زہراؑ کو اپنے مہر میں ملا تھا۔ شہزادی کونینؑ کے بعد خواتین میں یہ اعزاز بی بی معصومہ قم کو

حاصل ہوا کہ انہیں شفیعہ روز جزا کا لقب ملا۔ جس کے لیے امام جعفر صادقؑ کی مذکورہ حدیث سند ہے۔ آپؑ کی زیارت میں بھی پڑھا جاتا ہے: یا فاطمہ اشفعی لی فی الجنۃ۔ اے فاطمہ معصومہؑ ہماری جنت میں شفاعت فرمایئے گا۔

عالمۂ آلِ عبا:

خاندان عصمت وطہارت میں خواتین مختلف علوم اسلامی میں بے نظیر مہارت رکھتی تھیں۔ سرِ فہرست جناب زہرا مرضیہؑ اور جناب زینبؑ عالمۂ آلِ عبا تھیں۔ آپ کے خطبات اور حیات بخش دروس علوم نے تاریخ اسلام کے صفحات کو مقام افتخار بنایا۔

جناب معصومۂ قم نے بھی اپنی زندگی کے بچپن اور نوجوانی کے ایام دو معصومین علیہم السلام امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ کے زیرِ سایہ گزارے۔ لہٰذا آپؑ نے تمام علوم اسلامی کو حاصل کیا جب کہ آپؑ نے بہت سی احادیث نقل فرمائی ہیں۔

محدثۂ آلِ طٰہٰ:

جن لوگوں کے توسط سے رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی احادیث ہم تک پہنچی ہیں ہمیں ماننا چاہیے کہ امت اسلامی پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ اگر ان کی یہ کاوشیں نہ ہوتیں تو تعلیمات محمدیؐ ہم تک نہ پہنچ پاتیں۔ اس لیے رسول اکرمؐ اپنے اصحابؓ کو احادیث سننے اور انہیں نقل کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ایک جگہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ اس شخص کی نصرت کرے جو ہماری احادیث کو سنے اور انہیں دوسروں تک پہنچائے۔'' (شرف اصحاب الحدیث ص ۱۹)۔ ایسے لوگوں میں مرد حضرات کے ساتھ ساتھ بہت سی خواتین بھی ہیں جو احادیث کی راوی مشہور ہیں۔ خاندان عصمت وطہارت میں جناب فاطمہ زہراؑ، جناب زینبؑ وام کلثوم کے بعد جو نام سب سے زیادہ روایان احادیث میں نظر آتا ہے وہ بی بی معصومہؑ کا ہے۔ آپؑ نے ان احادیث کو شہزادی فاطمہؑ کے سلسلۂ اسناد سے نقل فرمایا ہے

جو شیعہ و سنی دونوں مسلکوں کے محدثین نے نقل کیا ہے۔

چونکہ آپ کا خاندان وہ برگزیدہ، معصوم اور طاہر خاندان ہے جس سے کسی کجی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قم پہنچنے پر وہاں کے علماء کے اصرار پر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ حدیث اپنے پدر بزرگوار حضرت موسیٰ کاظمؑ سے سنی ہے، انہوں نے صادق آل محمدؐ حضرت امام جعفر صادقؑ سے سماعت فرمائی، صادق آل محمدؐ نے باقر العلوم حضرت امام محمد باقرؑ سے، انہوں نے سید الساجدین حضرت امام زین العابدینؑ سے انہوں نے امام عالی مقام حضرت امام حسینؑ سے، انہوں نے حضرت امام حسن مجتبیٰؑ سے، انہوں نے ابوالائمہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے اور امیر المومنینؑ نے بانی اسلام حضرت احمد مجتبیٰؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنی۔ پس اس طرح سے آپ سے بیان کی ہوئی احادیث صحیح اور متواتر ہیں جن میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

شہزادی معصومہ قمؑ سے روایت کی گئی چند احادیث:

۱۔ حضرت فاطمہ معصومہؑ نے جناب فاطمہؑ دختر حضرت امام جعفر صادقؑ سے، انہوں نے فاطمہؑ دختر امام محمد باقرؑ سے انہوں نے فاطمہؑ دختر حضرت امام زین العابدینؑ سے انہوں نے فاطمہؑ دختر حضرت امام حسینؑ سے انہوں نے جناب ام کلثومؑ دختر حضرت فاطمہ زہراؑ سے روایت بیان کی کہ حضرت فاطمہ زہراؑ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم نے رسول اللہؐ کے اس قول کو فراموش کر دیا، جو انہوں نے غدیر خم میں فرمایا تھا'' میں جس کا مولا ہوں، یہ علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔'' اور مذکورہ بالا سلسلوں سے یہ حدیث بھی منقول ہے۔ ''جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: اے علیؑ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔''

۲۔ علامہ محمد تقی مجلسیؒ (علامہ مجلسی اول) نے بحار الانوار کی پندرھویں جلد باب ۱۵ میں فضائل شیعہ کے بیان میں صفحہ نمبر ۱۲۲ پر روایت بیان کی ہے، جو یہ ہے کہ پانچ واسطوں سے

جناب فاطمہ معصومہؑ بنت امام موسیٰ کاظمؑ اپنی جدہ حضرت فاطمہ زہراؑ بنت رسول اللہ سے روایت کرتی ہیں کہ جناب فاطمہ زہراؑ نے فرمایا: میں نے اپنے پدر بزرگوار حضرت محمد مصطفیٰؐ سے سنا ہے کہ جب شب معراج مجھے آسمانوں کی سیر کرائی گئی اور میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے ایک خوب صورت محل دیکھا جو دُر ابیض کا بنا ہوا تھا اور اس کے دروازے دُر یاقوت سے جڑے ہوئے تھے، اس پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا، اس پردے پر لکھا تھا: ''علیؑ کے شیعہ کامیاب اور نجات یافتہ ہیں۔'' (مسلسلات احمد قمی، ص ۱۰۸، مسند الفواطم، ص ۲۹)۔

۳۔ حضرت معصومہؑ نے جناب فاطمہؑ بنت امام جعفر صادقؑ سے، انہوں نے جناب فاطمہؑ دختر حضرت امام محمد باقرؑ سے، انہوں نے جناب فاطمہؑ دختر حضرت امام زین العابدینؑ سے، انہوں نے جناب فاطمہؑ دختر حضرت امام حسینؑ سے، انہوں نے ثانی زہراؑ حضرت زینبؑ دختر امیر المومنینؑ حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے، انہوں نے حضرت فاطمہ زہراؑ دختر جناب رسول خداؐ حضرت محمد مصطفیٰؐ سے روایت نقل کی ہے کہ: ''جو شخص ہم اہل بیت کی محبت میں مرجائے وہ شہید ہے۔'' دوم، محمد غمازی شافعی نے بھی مذکورہ روایت کو بارہ واسطوں سے حضرت فاطمہ زہراؑ بنت رسول خداؐ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا! کہ میرے والد گرامی نے فرمایا: ''جو شخص ہم اہل بیت کی محبت میں اس دنیا سے اٹھ جائے وہ شہید ہے۔'' یہ حدیث جناب ام کلثومؑ بنت حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے مخدومہؑ کونین خاتونِ جنت حضرت فاطمہؑ تک پہنچی ہے۔ وہ ناقل ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: کہ جب شب معراج میں آسمانوں کی بلندیاں طے کرتا ہوا جنت میں داخل ہوا تو وہاں میں نے سفید موتیوں کا ایک قصر دیکھا۔ اس کا دروازہ جو سچے موتیوں اور یاقوت سے آراستہ تھا پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اپنا سر بلند کر کے پردے کی پشت پر دروازے پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھا تو اس پر تحریر تھا: ''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں اور علیؑ

صاحب اختیار ہیں۔'' اور اسی پردے پر لکھا تھا: ''مرحبا مرحبا! شیعیان حیدرؑ کے جیسا خوش قسمت اس دنیا میں کون ہے۔'' جب میں اس قصر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس میں بھی عقیق سرخ کا ایک قصر ہے جس کا دروازہ سبز زبرجد سے مزین ہے اور اس دروازہ پر پردہ پڑا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس پر تحریر تھا: ''محمد اللہ کے رسول اور علیؑ ان کے وصی ہیں۔'' اسی پردے پر یہ بھی تحریر تھا کہ ''علیؑ کے شیعوں کو ان کے حلال زادہ ہونے کی بشارت دے دو۔ اور جب میں اس قصر میں داخل ہوا تو میں نے زبرجد سبز کا ایک قصر دیکھا، جس سے اچھا قصر اب تک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا۔ اس کا دروازہ یاقوت سرخ کا تھا اور اس کی آرائش لولو (موتیوں) سے کی گئی تھی، اس پر جو پردہ آویزاں تھا اس پر یہ تحریر تھا کہ ''علیؑ کے شیعہ ہی رستگار و نجات یافتہ ہیں۔'' پیغمبر اسلام فرماتے ہیں کہ ''میں نے جبرئیل امینؑ سے پوچھا: یہ قصر کس کا ہے؟'' تو جناب جبرئیل نے فرمایا کہ ''آپؐ کے چچازاد بھائی اور جانشین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ تمام انسان میدان حشر میں بے کفن اور برہنہ پا آئیں گے، لیکن علیؑ کے شیعہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔''

مزید فرمایا: ''روز قیامت پروردگار عالم ہر ایک کو ان کی ماں کے نام سے آواز دے گا مگر علیؑ کے شیعہ اپنے باپ کے نام سے بلائے جائیں گے۔'' جناب رسالت مآبؐ نے پوچھا کہ ''جبرائیلؑ ایسا کیوں ہوگا؟'' حضرت جبرائیلؑ نے کہا: ''کیونکہ یہ علیؑ کے چاہنے والے ہیں، اس لیے حلال زادے ہیں۔''

مثالی بہن بھائی:

زینبؑ سے جیسا انس شہِ کربلا کا ہے
ویسا ہی حال مشہد و قُم کی فضا کا ہے

تاریخ میں حضرت امام حسینؑ اور جناب زینبؑ، دو ایسے بہن بھائی ہیں جو بے مثال

ہیں۔ کس قدر سخت حالات میں ان دونوں بہن بھائی نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ واقعات کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس محبت کا دوسرا نمونہ حضرت امام رضاؑ اور بی بی معصومہؑ کے یہاں نظر آتا ہے۔ مامون الرشید نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد امام علی رضاؑ کو جبراً مدینے سے خراسان بلوالیا۔ بظاہر انہیں ولی عہد بنایا مگر اقتدار کی سیاست وسازش کے تحت انہیں خاموشی سے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ جناب معصومہؑ امام رضاؑ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ تقریباً ایک سال اپنے بھائی کی جدائی برداشت کی مگر جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو آپ نے مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ آپ ۲۰۱ھ کے آخر میں مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ چند ماہ بصرہ میں قیام کے بعد ۲۰۳ھ کے قریب ساوہ پہنچیں جہاں بڑی تعداد میں دشمنان اہل بیتؑ تھے۔ ان نام نہاد ''بہادروں'' نے کاروان خاندان رسالتؐ پر حملہ کیا اور آپؑ کے قافلے کے ۲۳ لوگ شہید ہو گئے۔ (آج بھی، جولائی ۲۰۱۳ع میں، یہ ''بہادر مسلمان'' دمشق میں مظلومہ زینبؑ کے روضے پر حملے کر کے اپنی ''بہادری'' دکھا رہے ہیں)۔ شہزادی بھی اس حملے میں زخمی ہو گئیں۔ الغرض جب آپؑ قم کے قریب پہونچیں تو معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ محب اہل بیت ہیں، وہ بڑے ادب واحترام سے انہیں قم لے آئے۔ اسی دوران مامون نے زہر سے امام علی رضاؑ کو شہید کر دیا تھا۔ بھائی کی شہادت کی خبر نے شہزادی کا دل پاش پاش کر دیا۔ اس طرح آپؑ نے صرف سترہ روزہ بیماری کے بعد صبر وایثار ومظلومیت کی ایک داستان رقم کرتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جیسے جناب رسالت مآبؐ کی جدائی اور دنیا کی بے وفائی کے بعد جناب زہراؑ، جیسے جناب امام حسینؑ کی شہادت اور امت کے ظلم وستم کے بعد جناب زینبؑ اور جناب سکینہؑ زندہ نہ رہ سکیں، یہ پیکر علم وایثار بھائی کی شہادت کے چند دن بعد ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

عام مشاہدہ ہے کہ فقیر ہر دروازے پر آواز نہیں لگاتے بلکہ صرف ان دروازوں پر دست سوال دراز کرتے ہیں جہاں سے انہیں کچھ ملنے کی توقع ہو۔ شہزادی معصومۂ قم کے آستانے پر آنے والوں کا ہجوم زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ یہاں یوں ہی نہیں آتے۔ کچھ پاتے ہیں تبھی تو جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ شہزادیؑ کی کرامتوں کی تفصیل بہت زیادہ ہے۔ بیماروں کی شفایابی، بے اولادوں کو نعمت اولاد سے سرفراز فرمانا، حاجت مندوں کی حاجت روائی وغیرہ کے بے شمار واقعات قم میں روزانہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ دلوں کے منقلب ہو جانے کے واقعات بھی یہاں کا معمول ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ قبل برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی خواہر نسبتی بطور صحافی قم آئیں تو وہاں کے روحانی ماحول سے ان کا دل منقلب ہو گیا اور وہیں اسلام قبول کر کے عاقبت کا سامان کر لیا۔

ماخذ

محترمہ سیدہ صالحہ تقوی مرحومہ کی کتاب ''کریمۂ اہل بیت'' شائع کردہ، فروغ ایمان ٹرسٹ، مسجد باب العلم، شمالی ناظم آباد، کراچی)

عشیرہ سے غدیر تک

خطبۂ غدیر میں جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے:

''نیکی کی سب سے بڑی عملی جدوجہد یہ ہوگی کہ اس وقت تم میں سے جو لوگ موجود ہیں وہ غیر موجود افراد تک میرا یہ پیغام پہونچادیں اور کوشش کریں کہ ہر شخص اسے قبول کرلے اور اس کی مخالفت نہ کرنے پائے، اس لئے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے۔ نیز اس حقیقت کو بھی کبھی فراموش نہ کرنا کہ جب تک کوئی امام معصوم نہ ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ پر عمل درآمد نہیں ہوسکتا۔''

حضورؐ کے مندرجہ بالا حکم کی روشنی میں خطبۂ غدیر کے صرف تین پہلوؤں کو اجاگر کرنا اس مضمون کا مقصد ہے:

۱۔ خطبۂ اعلان نبوت یعنی ابتدائے تبلیغ اسلام میں ولایت امیر المومنینؑ کا اعلان۔

۲۔ خطبۂ غدیر یعنی تکمیل دین کے موقعہ پر حضرت علیؑ کی ولایت، وصایت اور خلافت کا اعلان۔

۳۔ ان احکامات الٰہی کی نشان دہی جو حضورؐ نے اپنے ۲۳ سالہ دور تبلیغ رسالت میں غدیر کے حوالے سے آیات قرآنی کی صورت میں امت تک پہونچائے تھے اور اب آپؐ نے خطبۂ غدیر میں ان کی یاددہانی فرمائی۔

ا۔دعوت ذوالعشیرہ:

بعثت کے بعد تین سال تک حضورؐ مخفیہ تبلیغ فرماتے رہے۔ چوتھے سال حکمِ ربانی ہوا:

''اور اے رسول تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈراؤ اور جو مومنین تمھارے پیرو ہو گئے ہیں ان کے سامنے اپنا بازو جھکاؤ۔(شعرا،۲۶۔آیت ۲۱۴،۲۱۵)۔

چنانچہ آپؐ نے حضرت ابوطالبؑ کے گھر میں حضرت علیؑ کی مدد سے اولادِ عبدالمطلب کی دعوتِ طعام کی۔ جنابِ امیرؑ نے کچھ گوشت، تھوڑے دودھ اور کچھ آٹے کی روٹیوں کا اہتمام کیا۔ اگرچہ آنے والے تقریباً چالیس افراد تھے مگر اللہ کی برکت سے سب نے رج کے کھایا۔ کھانے کے بعد آں حضرت نے دعوتِ توحید اور رسالت دی جس پر ابولہب نے بھرپور اعتراض کیا اور انتشار پیدا کیا۔ دوسرے دن پھر دعوت کی گئی اور ابولہب نے پھر وہی وطیرہ اختیار کیا جس پر حضرت ابوطالبؑ نے اسے ڈانٹا اور حضورؐ سے کہا آپ کہیے جو کہنا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''اے فرزندانِ عبدالمطلب! اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ عرب میں کوئی شخص اس چیز سے بہتر چیز لایا ہو جو میں تمھارے لئے لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس بھلائی کی طرف تمھیں بلاؤں۔ تم میں کون شخص ہے جو اس سلسلے میں میرا معاون و مددگار بننے کے لئے تیار ہے؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا''۔

اس دعوت پر سوائے حضرت علیؑ کسی نے لبیک نہ کہا۔ حضورؐ کے تین بار یہی دعوت دینے کے باوجود جب کسی نے جواب نہ دیا تو آپؐ نے حضرت علیؑ کو اپنے قریب بلایا سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

''یقیناً یہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے اور تم سب کو لازم ہے کہ اس کی اطاعت کرو۔'' (تفسیر ابنِ کثیر در تفسیر آیت ھذا و طبری ج ۲ ص ۶۳)۔

یہ تھا تبلیغِ رسالت کا ابتدائی دور جس میں حضورؐ اکرم کے اعلانِ نبوّت کی حضرت علیؑ، حضرت ابو طالبؑ اور جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا نے بھرپور تائید و نصرت کی۔ آخر الذکر ہستیوں کا ہجرت سے قبل ہی انتقال ہو گیا البتہ حضرت علیؑ نے پوری استقامت کے ساتھ ۲۳ برس تک حضورؐ کی ہر ہر قدم پر بھرپور معاونت فرمائی۔

دعوتِ ذوالعشیرہ کا واقعہ تاریخ اسلام میں بہت اہم ہے۔ آیئے اس واقعہ سے متعلق امور پر ایک نظر ڈالی جائے:

الف۔ یہ اعلانِ رسالت کا سب سے پہلا موقع تھا۔ یہیں سے اعلانِ وزارت کا آغاز ہوا۔ اب یہ کہنا عبث ہے کہ حضورؐ بغیر کسی کو اپنا خلیفہ بنائے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ کام اتنا اہم تھا کہ بالکل ابتداء ہی میں اس کا تعین کر دیا گیا۔

ب۔ یہ واقعہ تمام تفاسیر میں سورۂ شعراء کی مندرجہ بالا آیات کی تفسیر کی ضمن میں اور تقریباً تمام کتبِ احادیث اور کتبِ تاریخ میں بیان ہوا ہے۔

ج۔ اس واقعہ میں اعجازِ رسالت کی ایک جھلک بھی نظر آتی ہے یعنی ایک آدمی کا کھانا چالیس آدمیوں کے لئے بن جانا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اس برکت سے حضرت علیؑ کے ایمان کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اشارۃً بھی رسالت پر شک نہ کیا کہ ایک آدمی کے کھانے پر اتنے آدمیوں کی کیوں دعوت کی جا رہی ہے، انہیں شانِ رسالت کا اندازہ تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی اہم ہے کہ حضورؐ جانتے تھے کہ یہ کام معصوم کے ہاتھوں ہو رہا ہے تو اس میں کوئی شک و شبہ والی بات ہی نہیں ہے۔

د۔ حضرت علیؑ گو کمسن تھے مگر آگاہ تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ورنہ وہ کہہ سکتے تھے کہ اس وقت کون سا تخت و تاج ہے جس کی جانشینی کی ضرورت ہے۔

حضورؐ نے دونوں دن حجت ختم کرنے کے لئے سب کے سامنے یہ پیشکش کی کہ جو آج میری نصرت کا دم بھرے کل وہ میرا وصی میرا وزیر اور میرا خلیفہ ہوگا۔ حضرت علیؑ کے ہر بار حامی بھرنے کے باوجود انہیں بٹھا دیا اور جب کسی نے حامی نہ بھری تو سب کے سامنے حضرت علیؑ کی وصایت، وزارت اور خلافت کا اعلان فرما دیا۔ اسے کہتے ہیں "دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست۔ در پریشاں حالی و درماندگی" انگریزی میں کہتے ہیں A friend in need is a friend in deed. اس واقعہ کے بعد اور حضرت علیؑ کی عملی معاونت جو وہ تاحیات حضورؐ کی فرماتے رہے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ حضورؐ خلافت جیسے اہم معاملے کو بغیر وضاحت کے امت کے سپرد کر کے دنیا سے تشریف لے جاتے۔

چنانچہ آپؐ نے یہ کام ڈنکے کی چوٹ پر لاکھوں کی موجودگی میں دن کی روشنی میں کسی کونے کھدرے میں نہیں ایک بڑے میدان میں اکابر صحابہ کی موجودگی میں کیا۔

۲۔ غدیر:

سن ۱۰ ہجری میں حکمِ الٰہی ہوا:

"اے رسول تمھارے رب کی طرف سے جو حکم تمھیں دیا گیا ہے اسے پہونچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے کوئی پیغام پہونچایا ہی نہیں اور اللہ تمھیں ہر حال میں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

حج آخر کے بعد جب لوگ شاداں و فرحاں گھروں کو لوٹ رہے تھے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ کے مقام پر مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں حضورؐ نے حکمِ الٰہی کے تحت آگے جانے والوں کو واپس بلایا اور پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کیا اور پالان کے منبر سے ایک

طویل خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ایک جملہ ہر خاص و عام کو معلوم ہے:

"..... اللہ کی قسم اس دنیا میں اور کوئی ایسا نہیں جو ان آیتوں کی توضیح و تشریح کر سکے جو برائیوں کی روک تھام اور اچھائیوں کی اشاعت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں سوائے اس ایک شخص کے جس کے بازو تھام کر میں بلند کر رہا ہوں اور جس کے بارے میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے یہ علیؑ بھی مولیٰ ہیں۔ یہ علیؑ ابن ابی طالب میرے بھائی اور میرے جا نشین ہیں نیز جن کی پیروی کرنے کا فرمان پہونچانے کے لئے اللہ نے مجھے مامور کیا ہے۔ لوگو! علیؑ اور میری پاک ذریت ہی ثقلِ اصغر ہیں اور قرآن ثقلِ اکبر ہے، یہ ایک دوسرے کی خبر دینے والے بھی ہیں نیز ایک دوسرے سے موافقت کلی بھی رکھتے ہیں، اس کے علاوہ یہ ایک دوسرے سے اس وقت تک الگ نہیں ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہونچ جائیں....."

خطبۂ غدیر بہت طویل اور جامع ہے۔ اختصار کے پیش نظر ایک مختصر سا حصہ یہاں درج کیا گیا۔ یقیناً پورا خطبہ اللہ کی ہدایت کے مطابق ہے کیوں کہ رسول کا ہر فرمان، ہر قول، ہر کلام، ہر عمل تابع وحی ہوتا ہے۔ تاہم چوں کہ اس خطبہ میں حضورؐ نے چند آیات قرآنی جو کہ غدیر سے متعلق ہیں کی یاد دہانی کرائی ہے اس لئے مناسب ہے کہ ہم ان میں سے کم از کم چند کا بغور مطالعہ کر لیں:

۳۔ قرآن اور غدیر:

آپؐ نے فرمایا:

ا۔..... بے شک اس کی ذات امن و عافیت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بعد امینِ وحی نے مجھ سے کہا کہ میں اس مجمع عام میں کھڑے ہو کر ہر سفید و سیاہ کو یہ بتا دوں کہ علیؑ ابن ابی

طالب میرے بھائی، میرے وصی، میرے خلیفہ اور میرے بعد ساری خلقت کے امام ہیں۔ میری سرکار میں انہیں وہی مقام حاصل ہے جو ہارون کو موسےٰ کے اقتدار میں حاصل تھا مگر یہ کہ...... میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے بعد بس وہی تمھارے مولیٰ ہیں! اس سلسلے میں اللہ نے مجھ پر قرآن کی یہ آیت نازل فرمائی:

"......یقیناً تمھارا آقا صرف اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔ نیز وہ لوگ جنہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (مائدہ آیت ۵۵)۔

۲۔......میں جانتا ہوں کہ جب تک اللہ کے اس پیغام کو نہیں پہونچاؤں گا جو مجھ پر نازل ہوا ہے اس وقت تک مجھے اپنے معبود برحق سے خوشنودی کا پروانہ نہیں مل سکتا۔ اللہ کا ارشاد ہے: "اے نبی تمھارے پالنے والے کی طرف سے (علیؑ کے متعلق) تمھیں جو حکم ملا ہے اسے لوگوں تک پہونچادو۔ اور اگر یہ نہیں کیا تو جانو تم نے رسالت کا فریضہ ہی انجام نہیں دیا۔ نیز اللہ تمھیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ (مائدہ۔ ۶۷)۔

۳۔......لوگو! علیؑ "جنب اللہ" (وسیلۂ قرب الٰہی) ہیں جس کی مخالفت کرنے والوں کے بارے میں اللہ فرماتا ہے "یہ لوگ قیامت کے دن کہیں گے کہ واحسرتا و دردا! ہماری اس کوتاہی پر جو ہم نے "جنب اللہ" کے بارے میں روا رکھی۔ (سورۂ زمر۔ آیت ۵۶)۔

۴۔......سورۂ ھل اتیٰ (یا سورۂ دہر یا سورۂ انسان) میں بہشت کے مستحق ہونے کی گواہی ان ہی (علیؑ) سے مخصوص ہے۔ یہ سورہ پورے کا پورا ان ہی کی شان میں اترا اور اس میں ان کے علاوہ کسی کی مدح سرائی نہیں کی گئی۔ اسی طرح قرآن مجید کا ۱۰۳ واں سورہ والعصر علیؑ ہی کے لئے نازل ہوا۔

۵۔......لوگو! قرآن تمھیں بتارہا ہے کہ علیؑ کے بعد ان کے فرزند امامِ برحق ہیں اور یہ

میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ یہ میری ذرّیت ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ "اس نے سلسلۂ امامت کو ابراہیم کی نسل میں باقی رکھا ہے" (سورۂ زخرف۔ آیت ۲۸)۔

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ اور بہت سی آیاتِ قرآنی حضورؐ نے خطبۂ غدیر میں امت کو علیؑ کی ولایت، وصایت اور امامت کے سلسلے میں یاد دلائیں۔

واقعۂ غدیر کا تذکرہ صحیح مسلم، صحیح ترمذی اور مستدرک حاکم کے علاوہ تمام مفسّرین قرآن، محدّثین کرام اور دانشوران عظام نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ اس واقعہ کے راوی ۱۱۰ اصحابِ کرام و ازواج مطہرات کے علاوہ ۸۴ تابعین ہیں۔

ذوالعشیرہ سے تبلیغِ دین کا آغاز ہوا تھا اور رسولؐ کی وصایت اور خلافت کا وعدہ اسی دن ہو گیا تھا۔ غدیر میں وہ وعدہ پورا کر دیا گیا اور اللہ نے تکمیلِ دین کا اعلان فرما دیا۔

ذوالعشیرہ	کا	بیاں	آغازِ کار
دین	کی	تکمیل	تقریرِ غدیر

حدیثِ غدیر

واقعہ غدیر، تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے مقام غدیر پر ایک طویل اور پر معنی خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے مطابق آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بعد امامت کے لیے منصوب فرمایا۔

ہجرت کے دسویں سال آنحضرتؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ یہ ایک طرح سے اطراف کے تمام مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی دعوت تھی۔ اس پیغام پر مسلمانوں کے تمام قبیلے حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے مدینہ میں یکجا ہو گئے۔ یہ پیغمبر اکرمؐ کا واحد حج تھا جو آپؐ نے ہجرت کرنے کے بعد انجام دیا۔ اس حج کو حجۃ اللہ، حجۃ الاسلام، حجۃ البلاغ، حجۃ الکمال اور حجۃ التمام کے نام سے یاد کیا گیا۔

جناب رسالت مآبؐ نے غسل فرمایا اور احرام کے لیے دو سادہ کپڑے لیے۔ ایک کو کمر سے باندھا اور دوسرے کو اپنے شانوں پر ڈال لیا اور ۲۴ یا ۲۵ ذی قعدہ بروز ہفتہ حج کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ تمام اہلِ خانہ اور ازواج مطہرات کو عماریوں میں بٹھایا اور تمام اہلِ بیت، مہاجرین و انصار اور دیگر تمام قبائل کے ساتھ روانہ ہوئے۔ (طبقات ابن سعد، مقریزی، الامتاع، ارشاد الساری)۔ بہت سے لوگ پیروں پر چھالے پڑنے کے خوف سے اس سفر سے محروم رہ گئے۔ پھر بھی ایک کثیر مجمع آپؐ کے ہمراہ تھا۔ اس سفر میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار، ایک لاکھ بیس ہزار یا ایک لاکھ چوبیس ہزار یا

اس سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ مکہ سے، کچھ یمن سے شریک حج ہو گئے۔ اس طرح یہ تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

اعمال حج انجام دینے کے بعد پیغمبر اکرمؐ حاجیوں کے ہمراہ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جب یہ قافلہ غدیر خُم کے مقام پر پہنچا تو جبرئیل امینؑ اللہ کی طرف سے سورۂ مائدہ کی ساتویں آیت لے کر نازل ہوئے: یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک...... ''اے پیغمبرؐ! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے......'' جحفہ وہ جگہ ہے جہاں سے مختلف راستے نکلتے ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ اپنے اصحاب کے ساتھ اٹھارہ ذی الحجہ بروز جمعرات مقام جحفہ پر پہنچے۔

جناب جبرئیل امینؑ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور اکرمؐ کو حکم دیا کہ اصحاب کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت اور امامت کا اعلان فرمائیں اور انہیں تاکید کر دیں کہ ان کی اطاعت تمام مخلوق پر واجب ہے۔

جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ پہنچ گئے اور جو اس مقام سے آگے بڑھ گئے تھے انہیں واپس بلایا گیا۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ کانٹوں کو ہٹا دیا جائے۔ گرمی بہت تھی۔ لوگوں نے اپنی عبا کا ایک حصہ اپنے سر پر اور ایک سرا پیروں کے نیچے ڈالا ہوا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کے آرام کے لیے ایک خیمہ بنا دیا گیا تھا۔ ظہر کی اذان ہوئی اور سب نے آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد پالان شتر کے ذریعہ ایک بلند منبر بنایا گیا۔ حضور اکرمؐ نے بلند آواز سے خطبہ کا آغاز کیا:

''تمام تعریفیں اللہ سے مخصوص ہیں۔ میں اسی سے مدد طلب کرتا ہوں اور اسی پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ برے کاموں اور برائیوں سے اس کی پناہ مانگتا ہوں، گمراہوں کے لیے صرف اسی کی پناہ ہے۔ جس کی وہ رہنمائی کردے وہ گمراہ کرنے والا نہیں

ہو سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی وحدانیت کی گواہی کے بعد فرمایا:

''اے لوگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ میری عمر ختم ہونے والی ہے اور عنقریب میں اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آخرت کی طرف روانہ ہونے والا ہوں۔ میں اور تم اپنے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارا نظریہ کیا ہے اور تم لوگ کیا کہتے ہو؟''

لوگوں نے کہا:

''یارسول اللہؐ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پیغام الٰہی پہنچا دیا ہے اور ہم کو نصیحت کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اللہ رب العزت آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے۔''

آپؐ نے پوچھا:

''کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دیتے ہو؟ اور کیا یہ گواہی دیتے ہو کہ جنت ودوزخ اور قیامت کے دن میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے؟ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو دوبارا زندہ کرے گا؟ کیا تم ان تمام چیزوں پر عقیدہ رکھتے ہو؟''

سب نے کہا: ''ہاں (یارسول اللہؐ)! ان تمام حقائق کی گواہی دیتے ہیں۔''

اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! تو گواہ رہنا'' پھر بہت تاکید کے ساتھ فرمایا:

''بے شک میں آخرت میں جانے اور حوضِ پر پہنچنے میں تم سے پہل کرنے والا ہوں اور تم لوگ حوضِ کوثر پر مجھ سے آکر ملو گے۔ میری حوضِ کوثر کی وسعت

''صنعا'' اور ''بصریٰ'' کے درمیان فاصلہ کی طرح ہے، وہاں پر ستاروں کے برابر ساغر اور چاندی کے جام ہیں۔ غور وفکر کرو اور ہوشیار رہو کہ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ دیکھوں، تم لوگ ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو؟''

اس پر لوگوں نے آواز بلند کی: ''یارسول اللہ! وہ دو گرانقدر چیزیں کون سی ہیں؟''

نبی برحقؐ نے فرمایا:

''ان میں ایک گراں قدر چیز اللہ کی کتاب قرآنِ مجید ہے، جس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا اس کو مضبوطی سے پکڑے رہنا تاکہ گمراہ نہ ہو۔ دوسری گراں قدر چیز میری عترت ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس وارد ہوں۔ میں نے اللہ ربّ العزت سے اس بارے میں دعا کی ہے۔ لہٰذا ان دونوں سے آگے نہ بڑھنا اور ان کی پیروی سے انکار نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔''

اس موقع پر آپؐ نے حضرت علیؑ کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کیا، یہاں تک کہ آپؑ کی سفیدی بغل نمودار ہو گئی۔ تمام لوگ آپ کو دیکھ رہے تھے اور پہچان رہے تھے۔ پھر حضور اکرمؐ نے اس طرح فرمایا: ''اے لوگو! مومنین پر خود ان کے نفسوں سے زیادہ کون اولیٰ ہے؟''

سب لوگوں نے کہا: ''اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔''

آنحضرتؐ نے فرمایا: بے شک، اللہ تبارک وتعالیٰ میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور ان پر خود ان کے نفسوں سے زیادہ اولیٰ ہوں اور جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ بھی مولا ہیں۔''

جناب احمد ابن حنبل کے بقول حضورؐ نے اس جملہ کو چار مرتبہ تکرار کیا۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: "پالنے والے! تو اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی رکھے، اس کے ناصروں کی مدد فرما اور ان کو ذلیل کرنے والوں کو ذلیل وخوار فرما اور ان کو حق وصداقت کا معیار اور مرکز قرار دے۔"

پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: "حاضرین مجلس اس واقعہ کی خبر غائب لوگوں تک پہنچائیں۔"

مجمع چھٹنے سے پہلے جناب جبرئیل امینؑ پیغمبر اسلامؐ پر یہ آیہ شریفہ لے کر نازل ہوئے:

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"

"آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے اس دین اسلام کو پسند کیا۔" (سورۂ مائدہ، آیت ۳)

اس موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "اللہ اکبر، دین کے کامل ہونے، نعمت کے مکمل ہونے اور میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر اللہ کے راضی وخوشنود ہونے پر۔"

حاضرین مجلس نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ کر اس طرح مبارک باد پیش کی: "مبارک ہو مبارک! یا علیؑ ابن ابی طالبؑ کہ آج سے آپ میرے اور ہر مومن ومومنہ کے مولا وآقا بن گئے۔"

جناب ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم حضرت علیؑ کی ولایت سب پر واجب ہو گئی۔"

حسان بن ثابتؓ نے کہا: "یا رسول اللہؐ! کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی شان میں قصیدہ پڑھوں؟" حضور اکرمؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی میمنت اور اس کی برکت

سے پڑھو" اس موقع پر جناب حسانؓ کھڑے ہوئے اور اس طرح عرض کیا: "اے قریش کے بزرگو! پیغمبر اکرم کے حضور میں ولایت (جو مسلم طور پر ثابت ہو چکی ہے) کے بارے میں اشعار پیش کرتا ہوں۔" اور اس طرح اشعار پڑھے:

ینادیھم یوم الغدیر نبیّھم
بخم واسمع بالرسول منادیاً

"(غدیر کے دن نبی لوگوں کو ندا دے رہے تھے اور نبی کی یہ ندا میں بھی سن رہا تھا)"

اسی قصیدے میں جناب حسانؓ بن ثابت فرماتے ہیں:

فقال لہ قم یا علیؑ! فاننی
رضیتک من بعدی اماما و ھادیا

"(پھر رسولِ مقبولؐ نے فرمایا اے علیؑ اٹھو میں نے اپنے بعد کے زمانے کے لیے تمہیں امت کا امام اور ملت کا رہنما بنایا ہے)"

فمن کنت مولاہ فھٰذا ولیہ
فکونوا لہ انصار صدقٍ موالیا

"(لہٰذا جس کا میں حاکم ہوں یہ بھی فرماں روا ہے۔ لوگو! تم سب علیؑ کے سچے حامی اور تابعدار بنو)"

اور اس طرح پورا قصیدہ سب کے سامنے پیش کیا۔

علیؑ کی ولایت کے انکار کا نتیجہ:

اعلانِ ولایت کے فوراً بعد حارث بن نعمانِ فہری پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: "اے محمدؐ! تم نے اللہ کی طرف سے ہمیں حکم دیا کہ اللہ کی وحدانیت اور تمہاری رسالت کی گواہی دیں، تو ہم نے قبول کیا۔ تم نے ہمیں پانچ وقت کی نماز پڑھنے کا حکم دیا، ہم

نے اس کو بھی قبول کیا۔تم نے روزہ، زکوۃ، حج کے احکامات دیے، ہم نے مان لیے۔تم نے اس پر بس نہیں کیا اور اب اپنے چچازاد بھائی کو ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور اس کو ہم سب پر فضیلت دی اور کہا: ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' یہ حکم اپنی طرف سے تھا یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟'' حضورؐ نے فرمایا: ''قسم اس اللہ کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میں نے اس حکم کو (بھی) اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پہنچایا ہے۔'' اس موقع پر حارث بن نعمان منھ موڑ کر اپنی سواری کی طرف یہ کہتا ہوا چلا: ''پالنے والے! اگر جو کچھ محمدؐ کہہ رہے ہیں حق ہے تو مجھ پر آسمان سے پتھر بھیج دے یا مجھے دردناک عذاب میں مبتلا کردے۔'' وہ ابھی اپنی سواری تک پہنچ نہیں پایا تھا کہ اللہ نے آسمان سے اس پر ایک پتھر نازل فرمایا جو اس کے سر پر آ کر لگا اور اس کی پشت سے باہر نکل گیا اور وہ وہیں واصلِ جہنم ہوگیا۔اس موقع پر سورۂ معارج کی آیات ایک تا دو (ترجمہ: ایک مانگنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کا سوال کیا)۔اس واقعہ کو ثعلبی نے اپنی تفسیر میں مذکورہ آیت کے ذیل میں اور دیگر علماء نے بھی نقل کیا ہے۔

اگر حدیث غدیر صرف حضرت علی علیہ السلام کی محبت اور آپؑ کی نصرت کی خبر تھی تو حارث کو اللہ سے عذاب مانگنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو صرف سرپرستی کی صورت میں ممکن ہے۔جس کو بعض لوگ قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔

یہاں واقعۂ غدیر کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جس پر تمام امت مسلمہ اتفاق رکھتی ہے۔قابلِ ذکر ہے کہ دنیا کا کوئی بھی واقعہ یا داستان اس شان وشوکت اور خصوصیات کے ساتھ ذکر نہیں ہوا ہے۔(الغدیر، طبقات ابن سعد، الامتاع مقریزی، ارشاد الساری، سیرہ حلبی، سیرۂ زینی دحلان، تذکرۃ الخواص، خصائص نسائی، دائرۃ المعارف۔فرید وجدی)۔

واقعہ غدیر کی اہمیت:

غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کو مقام ولایت کے لیے منصوب کرنا، تاریخ اسلام کے اہم

قعات میں سے ہے۔ شاید اس واقعہ سے زیادہ اہم کوئی واقعہ ہمیں نہ مل سکے۔ یہ واقعہ حضرت علی علیہ السلام کی شکل میں پیغمبر اسلام کی رسالت اور الٰہی سلسلہ کے باقی رہنے کو بیان کرتا ہے۔

غدیر، اتحاد کی نشانی اور رسالت و امامت کے اتصال کا نام ہے۔ ان دونوں کی اصل یک ہی ہے، مخفی حقائق کے ظاہر ہونے، پوشیدہ اسرار کے ظاہر ہونے اور لوگوں کی ہدایت اسی غدیر کی راہ میں ممکن ہے۔

غدیر حق سے بیعت کرنے ہر تسلیم خم کرنے لشکرِ رحمان سے لشکرِ شیطان کی شکست کا دن ہے۔

ہر یر، خورشید عالمتاب کے تاریک بادلوں کے بعد چمکنے کا دن ہے۔

مآخذ

''غدیر کی معرفت اور اعتراضات کے جوابات'' تالیف علی اصغر رضوانی، ترجمہ: اقبال حیدر حیدری۔

غدیر کی اہمیت

حیدرؑ کو مصطفیؐ نے بڑی چاہتوں کے ساتھ
ہجرت کی شب سُلایا ، اٹھایا غدیر میں
(قیصر جعفری)

حضرت پیغمبر اکرمؐ جب اپنا پہلا اور آخری حج ادا کرنے کے بعد مکہ مکرمہ واپس تشریف لا رہے تھے تو ایک نشیبی میدان جسے غدیر خم کہا جاتا تھا، میں قافلہ کو روک دیا گیا۔ سب مہاجرین اور انصار جمع ہو گئے۔ حکم ہوا جو لوگ آگے نکل گئے ہیں انہیں واپس بلا لو اور جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کا انتظار کرو۔ جب تمام حجاج اکرام جمع ہو گئے تو نماز کے لیے ندا دی گئی۔ نماز کے بعد حکم ہوا کہ اونٹوں پر ڈالے جانے والے پالان کا بلند منبر تیار کیا جائے۔ منبر پر جا کر حضور اکرمؐ نے پوچھا: ''اے لوگو! تمھارا سرپرست کون ہے؟'' کہا: ''اللہ اور اس کے رسولؐ ہمارے سرپرست ہیں۔'' ان جملوں کی تین بار تکرار کی گئی۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو بلایا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اتنا بلند کیا کہ بغل کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر ارشاد ہوا: ''بس! جس کا میں مولا ہوں یہ علیؑ اس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! لوگوں میں سے جو علیؑ کو دوست رکھتا ہے اسے دوست رکھ اور دشمن رکھ اسے جو علیؑ کو دشمن رکھے اور مدد کر اس کی جو ان کی مدد کرے اور چھوڑ دے اسے جو ان کی مدد نہ کرے۔ اللہ اکبر! شکر ہے اس رب کا جس نے میری رسالت اور علیؑ کی ولایت کے ذریعہ دین کو کامل

فرمایا اور لوگوں پر اپنی نعمت کو پورا فرما دیا اور اس عمل سے خوش ہو گیا۔''

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے والد محترم سے اور انہوں نے اپنے اجداد سے نقل فرمایا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''غدیر کا دن میری امت کے لیے سب سے بڑی عید کا دن ہے۔ یہ وہی دن ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے بھائی علی ابن ابی طالبؑ کو اپنی امت کا امام بناؤں، جن سے میرے بعد وہ راہنمائی اور ہدایت حاصل کریں۔ یہ وہ دن ہے کہ اس دن اللہ نے دین کو مکمل کیا اور میری امت پر نعمت کو پورا کیا اور اسلام کو ان کے دین ہونے پر پسند کیا۔'' اس کے بعد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور وہ میری مٹی سے خلق کیے گئے ہیں اور وہ میرے بعد لوگوں کے امام ہیں اور میری جن سنتوں پر لوگوں کے درمیان اختلاف ہے، ان کے لیے بیان کریں گے۔ وہ سفید اور نورانی چہروں کے امیر المومنین اور بہترین اوصیاء اور مومنین کے پیشوا اور خاتون جنت کے شوہر اور ہدایت یافتہ ائمہ علیہم السلام کے باپ ہیں۔ اے لوگو! جو بھی علیؑ سے محبت کرے گا میں بھی اس سے محبت کروں گا اور جو علیؑ سے کینہ اور دشمنی رکھے گا میں بھی اس سے دشمنی رکھوں گا اور جو علیؑ سے رابطہ رکھے گا میں بھی اس سے رابطہ رکھوں گا اور جو علیؑ سے دور رہے گا، میں بھی اس سے دور رہوں گا۔ جو علیؑ کو چھوڑ دے گا میں اسے چھوڑ دوں گا اور جو علیؑ سے دوستی رکھے گا میں اسے دوست رکھوں گا اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے گا میں اس سے دشمنی رکھوں گا۔''

قاسم بن یحییٰ نے اپنے جد حسن بن راشد سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا میں نے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کی: ''میں آپ پر قربان ہو جاؤں کیا دو عیدوں کے علاوہ بھی مسلمانوں کی کوئی عید ہے؟'' فرمایا: ''ہاں! اے حسن اور وہ ان دونوں سے عظیم اور افضل ہے۔'' میں نے پوچھا ''وہ کون سا دن ہے؟'' فرمایا: ''یہ وہ دن ہے جس دن علیؑ کو لوگوں کا

امام مقرر کیا گیا۔" میں نے پوچھا" میں آپ پر قربان ہو جاؤں، وہ کون سا دن ہے؟" فرمایا: "دن گردش میں ہیں وہ دن اٹھارہ ذی الحجہ کا دن ہے۔" میں نے پوچھا: "میں آپ پر قربان ہو جاؤں، اس دن ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" فرمایا: "اے حسن! روزہ رکھو۔ محمدؐ و آل محمدؐ پر کثرت سے درود بھیجو، اور جنہوں نے ان پر ظلم کیا ہے اور ان کے حق سے انکار کیا ہے ان سے برائت اور نفرت کا اظہار کرو، اس لیے کہ انبیاء کرام جس دن کسی کو اپنا جانشین اور وصی بناتے تھے تو اپنے اوصیاء کو حکم دیتے تھے کہ جس دن وہ وصی منصوب ہوئے ہیں اس دن عید منائیں۔" میں نے پوچھا: "جو اس دن روزہ رکھے اس کا ثواب کیا ہے؟" فرمایا: "ساٹھ مہینوں کے روزوں کا ثواب ہے۔"

مفضل سے نقل ہوا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "غدیر کے دن روزہ رکھنا ساٹھ سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔"

علی بن حسین عبدی کہتے ہیں "میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، انہوں نے فرمایا: "ہر سال عید غدیر کے دن روزہ رکھنا اللہ کے نزدیک ایک سو حج اور عمرہ مقبول کے برابر ہے اور اس دن اللہ کی بہت بڑی عید ہے۔"

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "عید غدیر کا روزہ اگر کوئی قیامت تک زندہ رہے تو پوری عمر کے برابر ہے اور اس دن کا روزہ اللہ کے نزدیک ایک سو حج اور عمرہ مقبول کے برابر ہے اور یہ وہی دن ہے جو عظیم عید شمار ہوتا ہے۔

خطبۂ غدیر:

جیسا کہ مضمون کے شروع میں عرض کیا گیا کہ غدیر خم میں حضورؐ کے حکم پر اونٹوں کے کجاووں کا ایک منبر تیار کیا گیا جس پر آپ تشریف لے گئے اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو اپنی وحدانیت میں تمام چیزوں سے

برتر ہے۔ اس کی وحدانیت سب چیزوں کے نزدیک ہے۔ وہ اللہ جو اپنی حاکمیت میں صاحب جلالت اور اپنے برہان اور دلیل میں صاحب عظمت ہے اور ہمیشہ قابل تعظیم و تعریف ہے وہ آسمانوں کا خالق اور زمین کو بچھانے والا اور ان پر حاکم ہے۔ وہ روح الامین اور ملائکہ کا پروردگار ہے۔ سب مخلوقات پر مہربان ہے۔ اس کا لطف و کرم ہے کہ اس نے مخلوق کو اپنے قریب کیا۔ وہ ہر آنکھ کو دیکھتا ہے لیکن کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ کریم، علیم اور صاحب وقار ہے۔ ہر چیز پر اس کی رحمت ہے۔ اس نے اپنی نعمت کے ذریعہ لوگوں پر لطف کیا ہے۔ وہ ان پر کہ جو عذاب کے مستحق ہیں، عذاب میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے، وہ ارادوں سے واقف ہے۔ اس کے لیے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ چھپی ہوئی چیزیں اس کے نزدیک چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ وہ با اختیار ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ ہر نہ ہونے والی شے کو وجود میں لاتا ہے۔ وہ ہمیشہ بے نیاز ہے۔ وہ عزت والا اور حکیم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے سورۂ مائدہ کی آیت کی تلاوت فرمائی۔" (ترجمہ)۔۔۔ اے رسولؐ جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

پھر فرمایا: "اے لوگو یہ آیت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا سرپرست اور پیشوا بنایا ہے۔ ان کی اطاعت مہاجرین و انصار پر، ان پر جو ان کی اچھے انداز سے پیروی کرتے ہیں، ہر شہری اور دیہاتی، عرب و عجم، آزاد و غلام، چھوٹے بڑے، گورے کالے اور ہر وہ انسان جو اللہ کو معبود مانتا ہے پر واجب کی گئی ہے۔

ان کا فرمان کامل، گفتار صحیح اور حکم نافذ ہے۔ جو ان کی مخالفت کرے گا وہ ملعون ہے اور جو ان کی اطاعت کرے گا وہ اجر پائے گا۔ جو ان کی تائید اور حمایت کرے گا اللہ اس کو اور

ان کو جوان کے کلام کو غور سے سنتے ہیں، معاف فرمائے گا۔

اے لوگو! یہ آخری جگہ ہے کہ میں تمہارے درمیان ہوں۔ بس غور سے سنو، اللہ کی اطاعت کرو کہ وہی تمہارا مالک اور سرپرست ہے۔ میں جو اس وقت تم سے ہم کلام ہے کے بعد علیؑ تمہارے سرپرست اور امام ہوں گے۔ ان کے بعد امامت ان کی نسل سے میرے بیٹوں میں قیامت تک رہے گی۔ جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا وہ قیامت تک حلال ہے اور حرام وہ ہے جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ حرام کریں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حلال اور حرام کا حکم دیا ہے اور میں نے اس حکم کو علیؑ تک منتقل کیا ہے۔

اے لوگو! راہ علیؑ سے گم راہ نہ ہونا۔ نہ ہی اس سے منہ موڑنا۔ اس کی ولایت سے سرکشی نہ کرنا اس لیے کہ وہ حق کی ہدایت کرتا ہے اور خود بھی اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ باطل کا خاتمہ کرے گا اور لوگوں کو اس سے روکے گا۔ اللہ کی راہ میں کوئی بھی اس کے اقدام کو ملامت نہیں کرے گا۔ وہ ایمان میں سب سے پہلے سبقت لے جانے والے ہیں۔ تم سب میں سب سے پہلے انہوں نے میرے ساتھ اللہ کی عبادت کی، نماز ادا کی۔ میں نے اللہ کی طرف سے انہیں حکم دیا کہ شب ہجرت وہ میرے بستر پر سو جائیں، وہ سو گئے۔ اپنی جان کو میری جان پر فدا کر دیا۔ بس ان کو دوسروں پر فضیلت دیں۔ میرے اس کلام میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ اے اللہ! دوست رکھ اسے جو انہیں دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو انہیں دشمن رکھے اور لعنت بھیج اس پر جو ان کا انکار کرے، غضب نازل فرما اس پر جو ان کے حق کا منکر ہے۔

اے اللہ! تو نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے کہ امامت علیؑ کا حق ہے اور جب میں نے ان کی خلافت کا اعلان کیا اور علیؑ کو امام منصوب کیا تو اس وقت تو نے لوگوں کے لیے دین کو کامل کیا، ان پر اپنی نعمت کو تمام کیا اور ان کے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا۔ اب جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت

میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ اے اللہ میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ جو کچھ میرے ذمہ تھا میں نے پہنچا دیا۔"

"اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے ان کی امامت کے ذریعہ تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ بس جو علیؑ اور ان کی صلب سے پیدا ہونے والے فرزندوں کو قیامت تک امام نہ مانے، ان کی اقتدا نہ کرے تو دنیا اور آخرت میں اس کے اعمال تباہ ہو جائیں گے اور وہ تا ابد دوزخ میں رہے گا۔ اس کے عذاب میں کمی نہیں آئے گی اور کوئی بھی اس کی مدد نہیں کرے گا۔

اے لوگو! عنقریب میرے بعد ایسے افراد آئیں گے جو لوگوں کو دوزخ کی طرف بلائیں گے لیکن قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اللہ اور میں دونوں ان سے بے زار ہیں اور یہ سب دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔ واقعاً متکبرین کا ٹھکانا کتنا برا ہے۔

اے لوگو! میں ہوں وہ صراط مستقیم جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ جس سے تم اس کے لیے ہدایت چاہتے ہو۔ میرے بعد علیؑ صراط مستقیم ہوں گے۔ (اس وقت جناب رسالت مآبؐ نے سورۂ حمد کی تلاوت فرمائی اور فرمایا) یہ آیتیں ان کی شان میں نازل ہوئی ہیں، ان کے بارے میں ذکر ہوئی ہیں اور ان سب کو اپنے دائرہ میں شامل کرتی ہیں۔ یہ اللہ کے اولیاء ہیں اور انہیں کوئی خوف و غم نہیں۔ جان لیں کہ فقط اللہ کا لشکر کامیاب ہے، جان لو کہ ان کے دشمن بے عقل اور گمراہ ہیں، وہ فریب کے لحاظ سے شیاطین کے بھائی شمار ہوتے ہیں اور یہ ظاہری طور پر ایک دوسرے کے کانوں میں سنوار کر گفتگو کرتے ہیں۔

جان لو! ان کے دوست وہی لوگ ہیں جن کا تذکرہ اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے:
"جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے" جان لو کہ ان کے دوست وہ لوگ ہیں جن کی تعریف اللہ نے اس طرح کی ہے: "جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ

نہیں کیا، ان ہی لوگوں کے لیے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

اے لوگو! جس چیز کی میں نے تمہیں تعلیم دی ہے، بیان کرو۔ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، کہہ دو۔ اپنے حکمرانوں کو سلام کرو اور کہو: "ہم نے سنا ہے اور اطاعت کی ہے۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلب گار ہیں اور ہمیں تیری طرف پلٹ کر آنا ہے اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں اس راستے کی ہدایت کی اور اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ کی ہوتی تو ہم اس راستے سے بھٹک جاتے۔

اے لوگو! اللہ نے علیؑ کے فضائل جو قرآن میں ذکر کیے ہیں وہ میرے ایک جلسہ میں بیان کرنے سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے جو بھی ان کے فضائل میں سے چند فضائل تمہارے لیے بیان کرے اس کی تصدیق کرو، جس نے اللہ اور رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کی، بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

آگے بڑھ جانے والے وہ لوگ ہیں جو بیعت کرنے میں اور انہیں بطور امیرالمومنین سلام کرنے میں دوسروں سے سبقت لیں، یہی لوگ مقرب ہیں۔ آرام و آسائش کے باغوں میں بس ایسے کلمات زبان پر جاری کیا کرو کہ جو اللہ کو تم سے راضی کرے۔ اگر تم اور زمین پر رہنے والے کافر ایک ہو جاؤ تو اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ اے اللہ! مومنین کو میرے فرمان اور جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، ان کی وجہ سے معاف فرما اور اپنے غضب کو منکرین اور کافروں پر نازل فرما۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔"

ماخذ

"فضائل امیرالمومنینؑ" تالیف: حجۃ الاسلام والمسلمین علی رضا صابری یزدی، مترجم: حجۃ الاسلام والمسلمین سید اشتیاق حسین کاظمی۔

یادگار سجدے

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

علامہ اقبالؔ

نماز:

سورۂ بقرہ (۲) آیت ۴۵: (ترجمہ) صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگو۔ نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کے لیے (نہیں) جو خشوع اور خضوع والے ہیں۔

سورۂ مدثر (۷۴) آیت ۴۲، ۴۳: (ترجمہ) آخر تمہیں کس چیز نے جہنم میں پہنچا دیا۔ وہ کہیں گے کہ ہم نماز گزار نہیں تھے۔

سورۂ نساء (۴) آیت ۱۰۳: (ترجمہ) جب اطمینان حاصل ہو جائے تو باقاعدہ نماز قائم کرو۔

حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

نماز شیطان کے حملوں سے بچنے کے لیے ایک قلعہ ہے۔
نماز رحمت الٰہی کو کھینچتی ہے۔

اگر نمازی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت اس پر کتنی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں تو وہ سجدے سے کبھی سر نہ اٹھائے۔

جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اس کو یہ سمجھ کر نماز پڑھنی چاہیے کہ یہ میری آخری نماز ہے۔

(تشریح) جس کے ذہن میں نماز کا فلسفہ لقائے الٰہی ہے اور اجر و ثواب کا یقین ہے اس کے صبح، دوپہر، شام کوئی وقت مشکل نہیں ہے اور خدا ذہن سے نکل جائے تو پھر ہر وقت مشکل ہے۔ نماز ایک فریضہ ہے اور وقتِ معین کے ساتھ فریضہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز پابندی وقت کے ساتھ ادا کرنی چاہیے، وقت نماز میں کوتاہی کرنا اصلِ نماز میں کوتاہی کرنے کے مترادف ہے اور اسی لیے علمائے اسلام نے بلا عذر نماز قضا کر دینے کو حرام قرار دیا ہے۔ عذر کی تفصیل بھی احکام شریعت سے دریافت کرنی چاہیے، خود ساختہ خیالات کا نام عذر شرعی نہیں ہے۔ انسان کو یقین ہو جائے کہ رات کو دیر تک جاگنا نماز صبح کے قضا ہو جانے کا باعث ہوگا تو سو جانا ضروری ہے اور جاگنا حرام ہے۔ اس کے لیے کار خیر کا عذر بھی کارگر نہیں ہو سکتا۔

نماز پڑھنے سے رزق میں برکت، پریشانیاں دور اور اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

جس نے نماز کو سبک (کم) سمجھا وہ ہماری شفاعت سے محروم رہے گا۔

نماز عبادات میں سب سے افضل ہے۔ نماز میں سجدہ سب سے افضل رکن ہے۔

چنانچہ سورۂ مریم (۱۹)، آیت ۵۸ میں ارشاد باری ہے کہ "یہ انبیاء وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی نعمت دی، آدمؑ کی اولاد سے ہیں اور ان کی نسل سے جنہیں ہم نے (طوفان کے وقت) نوحؑ کے ساتھ (کشتی پر) سوار کر لیا تھا اور ابراہیمؑ و یعقوبؑ کی اولاد سے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کی ہم نے ہدایت کی اور منتخب کیا۔ جب ان کے سامنے اللہ کی نازل

کی ہوئی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو سجدہ میں زار و قطار روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ سجدہ شعارِ انبیاء علیہم السلام ہے۔ سجدہ عروجِ بندگی ہے۔ سجدہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے ہے۔ سابقہ امتوں میں سجدۂ تعظیمی مروج تھا مگر حضورؐ کی امت میں سجدۂ تعظیمی بھی جائز نہیں۔ سجدے سے انکار یا انحراف سراسر کفر اور شیطان کی پیروی ہے۔ (سجدے کی دلکشا اور روح پرور تفصیل و تعریف کے لیے علامہ رشید ترابی اعلی اللہ مقامہٗ کی مجلس شام غریباں بعنوان ''سجدہ'' ملاحظہ فرمائیں جو انٹرنیٹ، آڈیو وڈیوی ڈیز اور کیسٹس وغیرہ میں دستیاب ہے)۔

آیئے چند یادگار سجدوں کو یاد کرتے ہیں:

ایک یادگار سجدہ مدینے میں:

مسجد نبوی میں نماز باجماعت جاری تھی۔ امامت اللہ کے نبیؐ خود فرما رہے تھے۔ قیام و رکوع کے بعد حضورؐ سجدے میں تشریف لے گئے۔ جب رسول اکرمؐ نے خلاف معمول سجدے کو طول دیا تو نمازیوں کو محسوس ہوا کہ سجدہ کا دورانیہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ تشویش ہونا فطری امر تھا۔ لیکن سب حکمِ خداوندی سن چکے تھے کہ جب تک امامِ جماعت سجدے سے خود سر نہ اٹھائے ہر مقتدی اس وقت تک سجدے میں رہے۔ جب طوالت کچھ اور بڑھی تو نمازیوں نے آہستہ سے تھوڑا سا سر اٹھا کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کی لیکن دیکھا کہ رسولؐ بدستور سجدے میں مصروف ہیں۔ البتہ یہ محسوس ہوا کہ نبیؐ کی پشت پر کوئی سوار ہے۔ اس سے زیادہ دیکھنے کا موقعہ تھا نہ محل۔ کچھ نمازی ذکر تسبیح (سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہٖ) گن رہے تھے جو ساٹھ پینسٹھ سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔ الغرض ستر بار کی تسبیح حمد کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے سجدے سے سر اٹھایا۔ تشہد سلام کے بعد تسبیح فاطمہؑ کا ورد کیا۔ دعا فرمائی۔ اس کے بعد تشویش میں مبتلا نمازیوں نے حضور اکرمؐ پر استفسارات کی بوچھار کر دی۔ حضورؐ نے حسب عادت مسکراتے ہوئے سب کو بتایا۔ ''کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی۔ جب میں سجدے میں گیا

تو میرا یہ لاڈلا نواسہ میری پشت پر آ گیا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسے تکلیف نہ ہو اشارے سے بھی ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انتظار میں رہا کہ حسینؑ خود پشت سے اتر جائیں یا اللہ کا حکم آ جائے۔ ایسے میں (سجدے ہی کی حالت میں) جبریل امینؑ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان پہنچایا کہ اے رسول سجدے سے اس وقت تک سر نہ اٹھانا جب تک حسینؑ خود اپنی مرضی سے آپ کی پیٹھ پر سے نہ اتر جائے۔ چنانچہ میں تسبیح حمد کی تکرار کرتا رہا اور جب یہ میرا لختِ جگر اپنی مرضی سے میری پشت سے جدا ہو گیا تو میں نے سجدے سے سر اٹھا لیا۔ اے لوگو اور رہنا یہ بچہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے اور اس کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ جو اس کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے، جو اس کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے اور جو میرا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اے لوگو! میرے بعد اس کا خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچنے دینا۔ یہ اور اس کا بھائی حسنؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ اس کی ماں میری بیٹی خاتونِ جنت ہے اور اس کے بابا علی مرتضیٰؑ قسیم نار و جنت ہیں، ساقیِ کوثر ہیں۔ ان لوگوں کی مودت اللہ نے فرض کی ہے۔ ان سے مودت کے بغیر کوئی جنت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔

یاد رکھنا! یہ رسول کوئی کلام، کوئی عمل اپنی ذاتی مرضی سے نہیں کرتا۔ اس کا ہر عمل، ہر قول اللہ کی ہدایت مطابق ہوتا ہے۔

(یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے کہ حالتِ نماز میں حسینؑ کا خیال ذہن میں رکھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی بلکہ یہ سنتِ رسولؐ ہے)

ایک بے مثال سجدہ کوفہ میں:

مولائے متقیان حضرت علی مرتضیٰؑ نماز فجر کے لیے گھر سے نکلنا چاہتے ہیں کہ دروازے پر گھر کی پلی ہوئی مرغابیوں نے دامن پکڑ لیا۔ آپؑ نے آہستہ سے دامن کو چھڑایا اور گھر والوں سے فرمایا: ”ان کا خیال رکھنا، ان کے دانے پانی کا انتظام کرتے رہنا۔ اگر نہ کر سکو تو

انہیں آزاد کر دینا۔" مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک شخص مسجد کے گوشے میں محوِ خواب ہے۔ آپ اسے جگا دیتے ہیں۔ فریضہ کی یاددہانی کراتے ہیں۔ وہ شخص پہلی صف میں آ جاتا ہے۔ نماز شروع ہوتی ہے۔ پہلی رکعت کے دوسرے سجدے میں جاتے ہیں اور ذکر تسبیح بجالاتے ہیں۔ وہ شخص جسے مسجد میں آ کر آپ نے نماز کے لیے بیدار کیا تھا، تلوار لے کر بڑھتا ہے اور آپ پر سجدے کی حالت میں اتنا شدید وار کرتا ہے کہ آپ کا سر شگافتہ ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ آپ اس وقت یادِ الٰہی میں مستغرق تھے، فرماتے ہیں: "فزت برب الکعبہ" "ربِّ کعبہ کی قسم آج علی کامیاب ہو گیا۔ حضرت امام حسنؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: "نماز کی تکمیل کرو" یعنی اب تم امامت کر کے نماز کو پورا کرو۔ قاتل موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ کوفے کے در و دیوار لرز اٹھتے ہیں۔ شور بلند ہونے پر کوفے کے لوگ مسجد کا رخ کرتے ہیں اور قاتل کو پکڑ کر امام کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ کریم رسولؐ کا کریم وصی قاتل کے لیے شربت منگوا کر پیش کرتا ہے اور اس سے صرف ایک سوال کرتا ہے: "کیا میں تیرا اچھا امام نہیں تھا؟"

حالت نماز میں سر پر وار ہونے پر عام آدمی کے اوسان قائم نہیں رہتے۔ اس موقع پر حضرت علیؑ کا یہ فرمانا کہ "ربِّ کعبہ کی قسم آج علی کامیاب ہو گیا۔" بہت پر معنی ہے۔ آپ نے درجنوں جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ حضورؐ کی ہمراہی میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ دورانِ جنگ شہادت کی شدید آرزو رکھتے تھے۔ مگر شجاعت مانع تھی۔ تمام عرب و عجم میں کوئی مائی کا لال علیؑ کو سامنے سے آ کر قتل کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ آج جب علیؑ کو حالت سجدہ میں اپنی شہادت کی تمنا پوری ہوتی دکھائی دی تو اپنی زندگی کی کامیابی پر ربِّ کریم کے لیے زبان پر شکر کے الفاظ آ گئے۔ مقامِ فکر ہے کہ یہ الفاظ بھی "سبحان ربّی الاعلیٰ وبحمدہٖ" کے ہم پلہ ہیں۔

ایک عظیم الشان سجدہ میدانِ کربلا میں:

عصرِ عاشور جب اعوان و انصار حسینی اپنی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تو امام مظلوم

مقتل میں تشریف لائے۔ مختصر خطاب کے بعد بھرپور جنگ کی۔ بالآخر جب زخموں سے چور چور ہو گئے تو سواری سے زمین پر تشریف لائے۔ ایسے میں جب قاتل قریب پہنچا تو آپؑ نے اس سے کہا: ''اتنی دیر رک جا کہ میں نماز ادا کرلوں۔'' مگر ظالموں نے اتنی مہلت دینا گوارا نہ کی۔ ابھی فرزندِ رسولؐ نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا تھا کہ گلوئے مبارک قطع کر دیا گیا۔

حضرت امام حسینؑ مصائب کی حدوں کے ختم ہونے پر بھی صبر و استقلال کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں سر بسجود رہے۔ جناب رسالت مآبؐ نے امت کو جو نماز تعلیم فرمائی تھی وہ ملائکہ کی جملہ عبادات کا مجموعہ تھی۔ بعض فرشتے حالت قیام میں ہیں۔ بعض حالت رکوع میں، بعض حالت سجدہ میں اور بعض تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ ان تمام ملائکہ کی عبادت قابل تحسین ہے۔ اس کے ساتھ ہی جو عبادت انبیاء علیہم السلام نے کی وہ قابل فخر ہے۔ لیکن حضرت امام حسینؑ نے جو نماز اس وقت ادا فرمائی وہ قیامت تک ادا کی جانے والی نمازوں میں سب سے افضل ہے کیوں کہ یہ نماز آپ نے اس وقت ادا کی جب دشمن آپؑ پر ہجوم کیے ہوئے آمادۂ قتل تھا۔ جسم مبارک زخموں سے اٹا پڑا تھا۔ آپؑ نے اس حالت میں جو نماز ادا فرمائی وہ دورِ آدمؑ سے قیامِ قیامت تک بے مثال ہے۔ اس نماز پر انبیاء و ملائکہ کو ناز ہے۔

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہیں
سجدہ وہ اک تیغ تلے کا، ان سے ہو تو سلام کریں
میر تقی میر

ماخذ

جناب مرزا محمد صابر شکیب کی تالیف ''سفینۃ الشہداء فی مقتل الحسینؑ''۔ مولانا سید علی افضل زیدی قمی کی تالیف ''پچاس موضوعات پر سو واقعات'' اور علامہ رشید ترابی اعلی اللہ مقامہٗ کی مجلس شام غریباں بعنوان ''سجدہ'')۔

ایمان ویقین کی منزلیں اور کربلا والے

سورۂ ابراہیم، آیت ۲۷ میں ارشاد باری ہے: ''جو لوگ ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی گفتار اور اعتقاد کی ثبات کی وجہ سے ثابت قدم رکھے گا، اس جہان میں بھی اور آخرت میں بھی، نیز اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے اپنا لطف و کرم بھی چھین لیتا ہے اور اللہ جو کام بھی چاہے (اور قرین مصلحت سمجھے) انجام دیتا ہے۔'' یہی بات کم وبیش الفاظ میں اسی مفہوم کے ساتھ سورۂ محمدؐ کی آیت ۱۷، سورۂ التغابن، آیت ۱۱، سورۂ یونس، آیت ۹، سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹ اور سورۂ انعام، آیت ۱۲۵ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

ایمان:

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ بنیادی اسلامی عقائد بالخصوص توحید پر ایمان میں کمال حاصل کرے۔ اس لیے کہ دنیوی اور اخروی سعادت اسی میں مضمر ہے۔ اس کو یقین ہونا چاہیے کہ حیات عطا کرنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ زندگی کو روانی عطا کرنے والا اور منقطع کرنے والا صرف اور صرف وہی ہے۔

واللہ یحیی و یمیت یعنی اللہ ہی حیات بھی عطا کرتا ہے اور موت بھی۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۶)۔ جس طرح تخلیق اللہ کے امور میں سے ہے، اسی طرح رزق اور اس میں کمی بیشی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر یعنی جس کے اللہ چاہتا ہے روزی فراخ

کردیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے روزی تنگ کردیتا ہے۔ (سورۂ رعد، آیت ۲۶)۔

اسی طرح سربلندی اور پستی بھی من جانب اللہ ہے۔

وتعز من تشآءُ و تذل من تشآءُ بیدک الخیر. یعنی اے اللہ تو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے۔ اور تو ہی ہر شے پر قادر ہے۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۲۶)۔

وانہ ھو اغنیٰ و اقنیٰ یعنی وہی مال دار بناتا ہے اور وہی سرمایہ عطا کرتا ہے۔ (سورۂ النجم، آیت ۴۸)

بیٹا یا بیٹی عطا کرنا یا اولاد سے محروم رکھنا بھی اللہ کی صفت ہے:

ترجمہ: اللہ جسے چاہتا ہے صرف بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے صرف بیٹے عطا کرتا ہے یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں انہیں عطا کرتا ہے اور جس کو چاہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ یقیناً وہ صاحب علم بھی ہے اور صاحب قدرت واختیار بھی ہے۔ (سورۂ شوریٰ، آیت ۴۹۔ ۵۰)۔

ایک اور جگہ فرمایا: (ترجمہ): (جناب ابراہیمؑ نے فرمایا): وہی کھانا دیتا ہے اور وہی پانی پلاتا ہے۔ اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی شفا بھی دیتا ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور پھر وہی زندہ کرتا ہے۔ (سورۂ شعراء، آیت ۷۹ تا ۸۱)۔

مزید ارشاد رب العزت ہے: (ترجمہ): اور اگر اللہ نقصان پہنچانا چاہے تو اس کے علاوہ کوئی بچانے والا نہیں ہے اور اگر وہ بھلائی کا ارادہ کرلے تو اس کے فضل وکرم کا کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں بھلائی عطا کرتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (سورۂ یونس، آیت ۱۰۷)۔

مختصر یہ کہ جو بھی چیز انسان کو عطا ہوتی ہے اس میں اللہ کی رضا شامل حال ہوتی ہے۔

خوش نصیبی بھی وہی عطا فرماتا ہے اور سختیاں بھی وہی دیتا ہے۔

"اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔" (سورۂ فاطر، آیت ۸)۔

اسی طرح انسان کی جذباتی کیفیات مثلاً رنج والم اور خوشی پر بھی اللہ کا اختیار ہے:

"بے شک وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے۔" (سورۂ نجم، آیت ۴۳)۔

الغرض اس وسیع سلطنت الٰہی میں کوئی بھی امر ایسا نہیں جس میں اس کی رضا، آگہی، اجازت یا استثنا نہ ہو۔ اللہ کی سلطنت میں درخت پر اگنے والا پتہ، صحرا میں نشو ونما پانے والا گھاس کا تنکا یا کہیں درخت سے پتے کا ٹوٹ کر گرنا، یہ سب امور اللہ کے علم واختیار میں ہوتے ہیں:

"کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے۔" (سورۂ انعام، آیت ۵۹)۔

ایمان کے درجات اور اہل یقین کے مقامات کے متعلق اور ان کی فضیلت کے متعلق بہت سی روایات موجود ہیں۔ جو لوگ مائل ہوں، وہ اصول کافی کا ایمان وکفر والا حصہ ملاحظہ کریں۔ ہمارا مقصد اس بات سے آگاہ کرانا ہے کہ ایمان کسی بھی درجہ کا ہو مومن کو اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے تینوں درجات میں سے عظیم مرتبے اور درجے کو حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

کائنات کا ہر ہر کام اللہ کی مشیت کا تابع ہے۔ بندۂ مومن جو ایمان کا دعوے دار ہے اسے اللہ تعالیٰ کی ہر عطا کو چاہے وہ اس کے لیے خوش گوار ہو یا ناگوار ہو، من وعن تسلیم کر لینا چاہیے۔

ایمان کے بعد دوسری منزل ہے "یقین":

یقین کی علامات:

اگر کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم ہو تو وہ یقین کا نور اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ یہ نور بڑھ کر پورے دل کو منور کر سکتا ہے۔ اس صورت میں اس شخص کی تمام خامیاں

اور برائیاں رفع ہو جاتی ہیں اور ہر برائی کے بدلے اسے ایک اچھی صفت عطا ہوتی ہے۔

"۔۔۔ جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل بھی کرے تو اللہ اس کی برائیوں کو خوبیوں سے بدل دے گا۔" (سورۂ فرقان، آیت ۷۰)۔

امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے: "یقین آدمی کو ہر اعلیٰ درجے اور حیرت انگیز مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ یقین کی شان اور عظمت رسول اللہؐ نے یہ کہہ کر بتائی کہ جب مجھ سے کہا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ پانی پر چلا کرتے تھے، تو میں نے کہا: اگر ان کا یقین مزید کمال کو پہنچا ہوتا تو وہ ہوا میں چلتے۔" (سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۵۳۴)۔

حضرت امام رضاؑ نے فرمایا: "یقین کے آثار، توکل، تسلیم و رضا اور اپنے کاموں کے نتائج اللہ پر چھوڑ دینے کے ہیں۔"

حضرت امیر المومنینؑ کا فرمان ہے: "خلوص عمل اور دنیا میں زہد و تقویٰ یقین پر دلالت کرتے ہیں۔" ایک روایت یہ بھی ہے کہ صبر و زہد اور صدق و رضا، یقین کا ثمر ہے۔ جب دل کی زمین پر یقین کا پاکیزہ درخت اُگتا ہے تو اس کا پھل اچھے اخلاق اور اچھے صفات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ: "و افوض امری الی اللہ ط ان اللہ بصیر" با لعباد" یعنی اے اللہ میں نے اپنا عمل تیرے سپرد کر دیا، کہ تو اپنے بندوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ (المومن ۴۰، آیت ۴۴)۔

یقین کی راحت اور شک کی افسردگی:

اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل و انصاف کی رو سے خوشی اور راحت کو یقین و رضا میں رکھا ہے اور غم و افسردگی کو شک اور ناراضگی میں قرار دیا ہے۔"

صاحب یقین شخص دلی خوشی، سکون اور راحت محسوس کرتا ہے اور تمام امور کے نتائج کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کام کرنا میرا فرض تھا میں نے وہ کر دیا۔ اب اللہ کی مرضی کہ میرا مقصود پورا کرے یا نہ کرے۔ وہ مصلحتوں کو جانتا ہے۔ اگر کام کا نتیجہ صاحب یقین مومن کی امید کے برخلاف بھی نکلتا ہے تو وہ اس پر افسردہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اللہ سے ناراض ہوتا ہے۔ وہ مشیت الٰہی کے خلاف ''کاش!'' بھی نہیں کہتا۔ ایسا مومن اپنے کام کے اچھے نتیجہ پر مغرور بھی نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''جتنی مصیبتیں روئے زمین پر اور خود تم لوگوں پر نازل ہوتی ہیں وہ سب اس سے پہلے کہ ہم انہیں پیدا کریں کتاب (لوح محفوظ) میں تحریر ہیں۔ بے شک یہ کام اللہ کے لیے بہت آسان ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی نعمت تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے تو تم اس کا رنج نہ کیا کرو اور جب کوئی نعمت اللہ تم کو عطا کرے تو اس پر غرور نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا۔ (سورۂ حدید، آیت ۲۲۔۲۳)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل یقین کو اگر مطلوبہ چیز نہیں مل پاتی یا پھر کوئی چیز ان سے چھن جاتی ہے تو وہ افسردہ نہیں ہوتے۔ اس طرح کسی چیز کے حصول میں اگر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ غرور و تکبر بھی نہیں کرتے۔ وہ خود کو اللہ کا بندہ اور مملوک تصور کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا سب کچھ اللہ کی ملکیت میں ہے اور کسی بھی چیز میں خود کو اللہ سے الگ نہیں سمجھتے۔

اہل یقین کے لیے راحت و سکون:

اہل ایمان ناگوار واقعات، سخت حادثات اور سانحات پر بھی وحشت و اضطراب میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ کبھی خود کو اکیلا نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے تمام امور کو اللہ سے مربوط سمجھتے ہیں۔ پریشان ہونے کی بجائے وہ انتہائی اطمینان، سکون اور راحت کے ساتھ اللہ بزرگ و برتر

سے لو لگائے رکھتے ہیں۔ حکم الٰہی کے مطابق سعی تو کرتے ہیں مگر نتائج اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ جو چاہے سرانجام دے۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیت یا اجازت کے بغیر کوئی کام بھی سرانجام نہیں پاتا۔ اللہ کی مرضی، رحمت ہو یا عدل، اس میں ہر حالت میں خیر پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر اللہ امتحان بھی لیتا ہے تو وہ اس میں بندے کی بھلائی چاہتا ہے۔ پس مرض و شفا، عزت و ذلت، امیری و غریبی، برتری و پستی حتیٰ کہ موت و حیات ان تمام حالات میں لوگ مومن کی تعریف کریں یا اسے برا بھلا کہیں، سب اس کے لیے برابر ہیں۔ اسے علم ہوتا ہے کہ ان حالات میں جو بھی ہوگا وہ اللہ کی طرف سے خیر ہوگا۔ واقعی دنیا آخرت دونوں جہانوں میں قلبی سکون و قرار اہل یقین کو میسر ہوتا ہے۔

"انہی لوگوں کے لیے امن و سکون ہے، یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔" (سورۂ انعام، آیت ۸۲)۔

"(اللہ) وہی ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا تاکہ وہ اپنے موجودہ ایمان کے ساتھ مزید ایمان بڑھائیں۔" (سورۂ فتح، آیت ۴)۔

خلاصہ یہ کہ راحت و سکون اور امن و اطمینان، یقین کی علامات ہیں۔ اس کے برعکس وحشت و اضطراب قلبی، ملال، شک کا نتیجہ ہیں۔

ایمان کا ایک اور بہت اہم جز ہے "وفا"، وفا اپنے رب سے، اس کے احکامات سے یا اس سے جس سے اس کے رب نے وفا کرنے کی تاکید کی ہے۔ عظیم شاعر مرزا غالبؔ تو وفا کو اصل ایمان قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ع: وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے۔

شک:

آیۂ تطہیر میں لفظ "رجس" آیا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، "رجس سے مراد شک ہے۔ اللہ کی قسم ہمیں اپنے رب کے بارے میں کبھی بھی

شک نہیں ہوتا۔" (معانی الاخبار، ج ا، ص ۱۸۲ و اصول کافی، ج ا، ص ۲۸۸)۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "ہمیں اپنے دین کے بارے میں کبھی شک نہیں ہوتا۔" (نور الثقلین، ج ۴، ص ۲۷۷)۔

شک کا مطلب ہے کسی شے یا کسی بات کے بارے میں ابہام یا وسوسہ ہونا کہ نہ جانے یہ چیز ہے یا نہیں ہے۔ اسی طرح کسی مسئلہ کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں ہے۔ شک کی تیسری صورت یہ ہے کہ ہر شے کا دل میں برابر کا امکان ہو۔ مثال کے طور پر اگر ہم کسی شے کے ہونے یا نہ ہونے کو ترازو کے پلڑوں میں رکھیں تو اس کی تین صورتیں ہوں گی۔ یا تو ہم پلہ اور برابر ہوں گے، یا پھر ایک پلڑا نسبتاً بھاری ہوگا دوسرا ہلکا، یا پھر ایک بہت وزنی اور دوسرا پلڑا بالکل خالی ہوگا۔

اگر دونوں پلڑے ہم پلہ اور برابر ہوں تو ایسے امکان کو شک یا تذبذب کہتے ہیں، اگر ایک پلڑا نسبتاً بھاری ہو تو امکان کو ظن یا گمان کہتے ہیں اور خالی پلڑے کے امکان کو احتمال یا وہم کہا جاتا ہے۔ وزنی اور خالی پلڑے میں سے وزنی پلڑے والے امکان کو علم یا یقین کہتے ہیں۔

پس شک تعجب، تذبذب، تردد یا سرگردانی کا نام ہے۔

قلب انسانی کے صحیح سالم ہونے کی نشانی یہ ہے کہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل تصور کرنے کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہو اور علم و یقین کے عالم میں ہو اور عارضۂ قلب کی نشانی یہ ہے کہ وہ حق و باطل کی پہچان کے سلسلہ میں حق کی حقانیت اور باطل کے بطلان میں تذبذب اور شک رکھتا ہو۔

"شک" ایک بہت بڑا مرض:

قرآن کریم میں ارشاد باری ہے: "جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے، آیات الٰہی نے ان کی خباثت پر ایک اور خباثت (شرک کی بیماری) بڑھادی ہے۔ ایسے لوگ کفر کے

عالم میں ہی دم توڑیں گے۔" (سورۂ توبہ، آیت ۱۲۵)۔

اس آیت کی توضیح میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "شکاالی شکہم" یعنی ان کے شک میں ایک مزید شک کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں رجس سے مراد شک ہے۔

قلب سلیم میں صرف اللہ کی یاد ہی ہوتی ہے:

اصول کافی کے باب اخلاص میں یہ حدیث مذکور ہے:

"جو شخص اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا وہ فائدہ میں رہے گا۔" حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا گیا تو امامؑ نے فرمایا، یہ حدیث قرآن کی اس آیت کی مصداق ہے: "مگر وہ جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو۔" (سورۂ شعراء، آیت ۸۹)۔

امامؑ نے پھر آگے فرمایا: "اور ہر وہ قلب جو شک اور شرک کے عارضہ میں مبتلا ہو، ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔"

دنیا اور آخرت کا خسارہ:

سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: "لوگوں میں سے ایک شخص ایسا بھی ہے جو ایک کنارے پر کھڑا ہو کر عبادت کرتا ہے۔ اگر اس کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر وہ منہ پھیر کر (کفر و شرک کی طرف) لوٹ جاتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ اٹھایا، یہی کھلم کھلا خسارہ ہے۔" (آیت ۱۱)۔

بعض مسلمانوں کا اللہ، رسول اور معاد پر قلبی ایمان و ایقان نہیں ہوتا۔ وہ شک کی حالت میں تصدیق کرتے ہیں، ایسے مسلمان بھی مادی اغراض و مقاصد کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کو مال، سلامتی اور مادی خواہشات کا صلہ ملتا رہے تو خوش رہتے ہیں اور معاملہ اگر اس کے برعکس ہو تو وہ دین سے دست بردار اور منحرف ہو جاتے ہیں اور پستی کی طرف چل

نکلتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں پستی اور عذاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ مول لیتے ہیں۔

تفسیر منہج الصادقین میں مذکور ہے کہ:

لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو ایمان کے کنارے کھڑا ہو کر عبادت الٰہی کرتا ہے تا کہ عبادت کرتے ہوئے اگر اسے خسارے کا احساس ہو تو وہ جلدی سے اپنے ایمان کو ترک کر سکے۔ اگر وہ شخص نور ایمان کے ہالے میں ہوتا تو اسے کنارہ تک رسائی یا ترک کرنے میں دیر لگ جاتی۔

وہ لشکر کے عقبی سرے میں رہنے والے کی مانند ہوتا ہے۔ جب مال غنیمت لوٹا ہو تو پیش پیش رہتا ہے اور اگر شکست کا خطرہ ہو تو بھاگنے میں بھی پیش پیش رہتا ہے۔

شک کا ایمان پر غلبہ:

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی اکثریت اللہ کے متعلق شک کا شکار ہے۔ ایمان و ایقان والے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ قیامت اور قرآن میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

وان الساعة اٰتية لا ريب فيها یعنی مسلمانوں کے علاوہ کوئی بھی قرآن کو نہیں مانتا۔ غیر مسلموں کی اکثریت کو قیامت پر شک ہے۔

اندھے کو سورج خاک نظر آئے!

اللہ، قیامت یا معاد اور قرآن یہ سب برحق ہیں۔ سلجھی ہوئی فطرت اور عقل سلیم کے مالک افراد شک کے ارتکاب کو مناسب نہیں سمجھتے۔ صاحب بصارت شخص کبھی بھی سورج پر شک نہیں کرے گا۔ جو لوگ ان تینوں حقیقتوں میں شک کے مرتکب ہیں دراصل وہ روحانی عوارض میں مبتلا ہیں۔ ان کی اصل انسانی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ شہوتوں، حرص وہوس اور

باطل کی اندھی تقلید میں وہ اتنے مبتلا ہو چکے ہیں کہ ان کا دل اندھا ہو گیا ہے، اس لیے وہ حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے۔ اندھا سورج کے نظارے سے قاصر ہوتا ہے۔ زندان کی کال کوٹھری میں بند شخص کو یہ علم نہیں ہوتا کہ سورج طلوع ہو چکا ہے یا نہیں۔

خلاصہ یہ کہ شک وریب، تردد واضطراب اور بے اطمینانی وبے سکونی کا علم کہ جسے افراد اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں، اس سے حق کی نمائش پر کوئی حرف نہیں آتا۔

کربلا والے:

ایمان، یقین اور شک ایسے وسیع موضوعات ہیں کہ ان کی جب بھی شرح کی کوشش کی جائے گی، نئی نئی جہتیں سامنے آتی جائیں گی۔

تاریخ انسانیت میں واقعہ کربلا ایک ایسا سنگ میل ہے جو اسلامی زندگی کے عملی پہلو کا بھرپور آئینہ ہے۔ اس جاں گداز واقعے کے تمام کرداروں نے صفحۂ انسانی پر وہ انمول نقش ثبت کیے ہیں جو بے نظیر ہیں۔

ہر چند کہ واقعہ کربلا کی پیش گوئی جناب رسالت مآبؐ اور جناب امیر المومنینؑ فرما گئے تھے لیکن اس واقعے کا بظاہر آغاز اس وقت ہوا جب مدینۂ منورہ میں امام وقت حضرت امام حسین علیہ السلام سے اواخر رجب سن ساٹھ ہجری میں حاکم وقت یزید کے لیے بیعت طلب کی گئی۔ جس کا جواب امامؑ نے دوٹوک انداز میں ان الفاظ کے ساتھ دیا کہ ''مجھ جیسا یزید جیسے سے کبھی بیعت نہیں کر سکتا۔'' یہ جملہ توحید، عدل، رسالت، امامت اور معاد پر ایمان کی ایک شان دار تعریف تھی۔ بلکہ دریائے معرفت کو کوزے میں سمونے کی مصداق تھی۔ اس جملے نے یہ طے کر دیا کہ اب قیامت تک حسینؑ جیسا شخص یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد امامؑ نے مدینہ کو خیر باد کہا۔ اپنے مختصر کنبہ کو ہمراہ لیا اور عازمِ حج ہوئے۔ اس کے بعد مکہ سے کوفہ کا قصد کیا مگر حالات نے انہیں کربلا پہنچا دیا جہاں محصور کر کے انہیں

اوران کے رفقائے کار کو انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ امامؑ، ان کے اہلِ خانہ اور انصار واحباب نے اس موقع پر جس عظیم الشان جذبۂ ایمانی کو پیش کیا وہ یادگار بن گیا جسے صاحبانِ دل اور اہلِ نظر تا قیامت دلوں میں سجائے رکھیں گے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے کہ دیکھو زندگی اسے کہتے ہیں اور موت کی یہ حقیقت ہے، جو پیغمبرِ اسلامؐ نے تعلیم دی تھی اور جو منشائے الٰہی کے عین مطابق تھی۔

ایمان کی مثال:

امامؑ جب راستے میں تھے تو ایک جگہ آرام کی غرض سے سو گئے۔ خواب میں نہ جانے کیا دیکھا کہ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ قریب موجود جناب علی اکبرؑ (یا جناب قاسمؑ) نے پوچھا کہ یا امامؑ اس آیت کی اس وقت تلاوت کا کیا سبب ہے۔ آپؑ کے جواب پر شہزادے نے فرمایا: ''بابا! کیا ہم حق پر نہیں؟'' امامؑ نے فرمایا: ''بے شک! ہم حق پر ہیں۔'' اس پر شہزادے نے کہا: ''پھر ہمیں موت سے کیا خطرہ، ہم اس پر جا گریں یا وہ ہم پر!''

یہ مکالمہ ''ایمان کامل'' کا اعلان ہے۔ فلسفۂ کربلا کی روح ہے۔

جیسا کہ ایمان کے باب میں اوپر عرض کیا گیا، ''وفا'' ایمان کا ایک اہم جز ہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ انصارِ حسینؑ ایمان کی کس منزل پر تھے۔ یہ سب اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف اور صرف رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی محبت اور ان پر ایمان کے سبب امامِ مظلوم پر جان نچھاور کرنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کے سامنے ایک بہت بڑا لشکر ان کے خون کا پیاسا نظر آ رہا تھا اور موت بالکل یقینی دکھائی دے رہی تھی لیکن ان کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ چراغ بجھا دیئے اور امامؑ کے بیعت اٹھا لینے کی پیشکش پر بھی کوئی ایک قدم پیچھے نہ ہٹا۔ ان ہی میں پیکرِ وفا حضرت عباسؑ ابنِ علیؑ بھی ہیں جن کی وفاداری ضرب المثل بن

گئی۔اس ضمن میں اس دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر اہلبیت جناب شاداںؔ دہلوی نے فرمایا:

غلام کیا کہیں عباسؑ کو کہ نام ان کا
لغت نے مانگ لیے معنی وفا کے لیے

یقین اور شک:

یقین اور شک کے قرآنی نقطۂ نظر کی عملی تشریح واقعۂ کربلا کے دو کرداروں سے حاصل کی جا سکتی ہے:

جناب حُرؑ شب عاشور تک لشکرِ یزید میں تھے۔امامؑ کے خیموں سے بچوں کی آواز العطش نے ان کی روح کو جھنجوڑ دیا جو کئی دن سے مضطرب تھی۔انہوں نے سوچا اگر میں لشکرِ یزید میں رہتا ہوں تو کل یقیناً سردار جوانان جنت جناب امامِ حسینؑ کا خون میرے دامن پر ہوگا۔میں جو کلمہ گوئے توحید و رسالت ہوں کس منہ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے سامنے پیش ہوں گا۔کون سی چیز مجھے واصلِ جہنم ہونے سے روک سکے گی۔یزید کا عطا کردہ انعام و اکرام میرے کب تک کام آسکے گا،زیادہ سے زیادہ چند روز۔دوسری صورت میں میں اگر امام مظلومؑ کی خدمت میں پیش ہو کر معافی طلب کر لوں تو وہ یقیناً مجھے معاف کر دیں گے، پھر نصرت امامؑ میں شہید ہو کر ابدالآباد تک جنت میرا ٹھکانہ ہوگی۔

جناب حرؑ کا جذبۂ ایمانی، شمع یقین کی روشنی میں انہیں اندھیروں سے اجالوں کی طرف لے گیا جس کا وعدہ اللہ نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں فرمایا ہے۔(اس آیت کا ترجمہ: اللہ ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے آئے،وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے)۔

دوسری طرف لشکرِ یزید کا سپہ سالار عمر ابن سعد متذبذب تھا۔ابن زیاد کا پیغام آیا تھا کہ فوراً حسینؑ کا کام تمام کر دو تو "رے" کی حکمرانی تمہیں عطا کی جائے گی،دوسری صورت

میں لشکر کو شمر کے حوالے کردو اور خود کو دربار کوفہ میں پیش کردو۔ اس نے سوچا کہ اگر حسینؑ کو قتل کرتا ہوں تو "رے" کی حکمرانی میرا مقدر ہوگی اور یہ اسی دنیا میں اسی زندگی میں مجھے مل جائے گی۔ یہ سودا بالکل نقد ہے۔ دوسری صورت میں قتل حسینؑ سے دست بردار ہو کر ابن زیاد کے پاس گیا تو وہ مجھے قتل کروا دے گا یا قید میں ڈال دے گا، جو بھی ہو میں قتل حسینؑ کے الزام سے بری ہو جاؤں گا اور جنت کا حق دار ہو جاؤں گا۔ مگر یہ سودا ادھار کا ہے۔ جانے مرنے کے بعد کیا ہو۔ کچھ ہو کہ نہ ہو۔ جنت ملے نہ ملے۔

ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال جناب حرؑ جنت کے حق دار ہو گئے اور شک اور بے یقینی کا شکار ہو کر عمر سعد جہنم کا ایندھن بن گیا۔

مآخذ

"قلب سلیم" از شہید محراب آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب شیرازیؒ)

صبر اور صلوٰۃ

سورۃ البقرہ، آیت ۴۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) "صبر اور صلاۃ کے ذریعے مدد طلب کرو، اگرچہ ایسا کرنا بوجھ ہے مگر ان لوگوں کے لیے نہیں جو خضوع و خشوع کرنے والے ہیں۔"

"اور تم صبر اور نماز کے ذریعہ استعانت کرو"

استعانت کے معنی مدد طلب کرنا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان تنہا اپنی قوتوں کے سہارے اہم اور نہایت ضروری کام انجام دینے یا مشکلات پر قابو پانے میں قاصر ہو، اور چونکہ حقیقی معنی میں اللہ کے سوا کوئی معین و مددگار نہیں اس لیے مشکلات و مسائل میں مدد سے مراد یہ ہے کہ انسان ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرے، صرف اللہ کی طرف توجہ رکھتے ہوئے اسی سے وابستہ ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کی بارگاہ عظمت میں پیش کر دے۔ یہی صبر اور یہی صلوٰۃ......نماز...... ہے اور یہ دونوں ہی حقیقی معنے میں کامیابی کے بہترین اسباب ہیں، کیونکہ صبر ہر بڑی سے بڑی مشکل اور مصیبت کو چھوٹا کر دیتا ہے اور نماز جو کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جانا اور اس کا سہارا لینا ہے، اس سے روح ایمان بیدار ہوتی ہے اور انسان اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس نے جس چیز کا سہارا لیا ہے وہ نہایت مضبوط و پائیدار اور ناقابلِ شکست و ریخت ہے۔

"اور یہ بوجھ ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو خشوع کرنے والے ہیں۔"

یہاں "یہ" کی ضمیر کی بازگشت "صلاۃ" کی طرف ہے اسے "استعینوا" کے الفاظ کی وجہ سے "استعانت" کی طرف لوٹانا درست نہیں کیونکہ اس سے جملہ "الا علی الخاشعین" سے منافات لازم آتی ہے کیونکہ "خشوع" کا "صبر" سے کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ خشوع اور خضوع اگرچہ دونوں میں تواضع وانکساری کا معنی پایا جاتا ہے لیکن خضوع کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے جب کہ خشوع کا تعلق دل سے ہے۔ (یعنی اعضاء و جوارح سے کی جانے والی انکساری کو خضوع کہتے ہیں اور دل سے کی جانے والی انکساری کو خشوع کہا جاتا ہے)۔

روایات پر ایک نظر:

کتاب کافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا کہ جب بھی حضرت علیؑ کو کوئی مشکل اور خوف ناک امر درپیش ہوتا تو فوراً کھڑے ہو جاتے اور نماز پڑھتے اور یہ آیت تلاوت کرتے تھے "واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ" (اللہ سے مدد مانگو صبر اور نماز کے ذریعے)۔

اسی طرح کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک اور روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے آیت شریف "واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ صبر سے مراد روزہ ہے اور آپؑ نے فرمایا کہ جب کسی شخص پر کوئی سخت مصیبت آپڑے تو وہ اس سے نجات پانے کے لیے روزہ رکھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "واستعینوا بالصبر" صبر کے ذریعہ مدد طلب کرو تو صبر سے مراد روزہ ہے۔

مولف: مذکورہ بالا دو روایتوں میں ذکر کیے گئے مطالب تفسیر العیاشی میں بھی بیان کیے گئے ہیں تاہم یہ بات یاد رہے کہ صبر سے روزہ مراد لینا صبر کے معنی و مفہوم کو اس کے واضح مصداق پر منطبق کرنے کے باب سے ہے (جسے علمی اصطلاح میں "جری" کہتے ہیں)۔

تفسیر العیاشی میں حضرت ابوالحسنؑ سے منقول ہے، آپؑ نے ارشاد فرمایا: آیت

"واستعینو ابالصبر والصلوٰۃ" میں صبر سے مراد روزہ ہے، لہٰذا جب کسی شخص کو کوئی مشکل درپیش ہو یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے، "واستعینو ابالصبر والصلوٰۃ وانھا لکبیرۃ الاعلی الخٰشعین" اور "خاشع" (خشوع کرنے والا) اسے کہتے ہیں جو نماز کی حالت میں نہایت کسرتی وانکساری کا اظہار کرے اور اس آیت میں "خاشعین" سے مراد حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔

مولف: امامؑ نے اس آیت "واستعینو ابالصبر والصلوٰۃ" کے حوالے سے مصیبت و مشکلات میں روزہ اور نماز کے استحباب کو بیان فرمایا ہے اور اسی طرح شدائد و مشکلات میں رسول اللہؐ اور ولی اللہ کو وسیلہ قرار دینے کے استحباب کو ذکر کیا ہے تو ایسا کرنا درحقیقت "صوم و صلوٰۃ" کے الفاظ سے تاویلاً رسول اللہؐ اور امیر المومنینؑ مراد لینے سے عبارت ہے۔

مضمون کی ابتدا میں جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں تین الفاظ کی اہمیت زیادہ ہے: (۱) استعانت (۲) صبر اور (۳) صلوٰۃ۔

استعانت:

استعینو کے لغوی معنی ہیں "تم مدد طلب کرو۔" (قرآن مجید کا عربی اردو لغت۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)۔

اللہ رب العزت کا صریح حکم ہے کہ اس کے تفویض کردہ وسیلہ سے مدد حاصل کرو۔ صبر اور صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وسیلے ہیں۔ لہٰذا ان کے ذریعہ سے مدد حاصل کرنا افضل ترین فریضہ ہے۔

قرآن مجید کے پہلے سورہ الحمد کی پانچویں آیت میں کہا گیا ہے: ایاک نعبد وایاک نستعین۔ نستعین کے لغوی معنی ہیں "ہم مدد چاہتے ہیں" چنانچہ پوری آیت کا ترجمہ ہوگا "ہم

تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔" یہ مدد صراط مستقیم (سیدھا راستہ) کی ہدایت کے لیے درکار ہے۔

اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کی عبادت صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی کی جاتی ہے اور ہر قسم کی مدد اس سے ہی چاہی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نظروں سے اوجھل ہے لہٰذا اس کی مدد اس طرح نہیں ہوتی جو براہ راست ہو۔ مدد وہی کرتا ہے مگر کسی ذریعہ سے، کسی کی وساطت سے۔ مثلاً اگر کوئی شخص دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے آواز لگا رہا ہو تو بے شک اللہ ہی اس کی جان بچائے گا مگر کوئی اسباب پیدا کر دے گا۔ کسی نہ کسی کو اس کی مدد کے لیے آمادہ کر دے گا۔

حدیث ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ سورہ حمد میں ہے۔ یعنی جملہ اصول وفروع دین، احکامات وغیرہ اجمالاً سورۂ حمد میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا ایاک نعبد وایاک نستعین کے معنی یہ ہوں گے کہ عبادت صرف اور صرف اللہ کی ہوتی ہے اور ہر مدد بھی اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کی مدد کسی نہ کسی مادی وسیلہ سے جڑی ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کی مثال میں کہا گیا ہے اللہ ڈوبتے ہوئے شخص کا ہاتھ خود پکڑ کر اس کی جان نہیں بچائے گا بلکہ کوئی ذریعہ ایسا پیدا کر دے گا کہ اس کی جان بچ جائے۔ دنیا کے تمام کام اسی طرح انجام پاتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہر کام کا محرک اللہ کی ذات ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔

آیت زیرِ بحث میں خود اللہ حکم دے رہا ہے کہ تم مدد طلب کرو صبر اور صلوٰۃ سے۔ اب ذات باری تعالیٰ نہ صبر ہے نہ صلوٰۃ، تو کیا یہاں یہ کہا جائے کہ سورۂ حمد میں تو صرف اللہ سے مدد مانگی جا رہی ہے اور یہاں اللہ کا حکم ہے کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد طلب کرو۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ یہ احکامات الٰہی ہیں ان میں تضاد ہو ہی نہیں سکتا چنانچہ ماننا پڑے گا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد مانگنا اللہ سے ہی مدد مانگنا ہے، بس ذریعہ صبر اور صلوٰۃ کو بنایا گیا ہے۔

صبر:

صبر کے لغوی معنی ہیں تحمل، جمے رہنا، تنگی میں رو کے رکھنا۔ صبر ایک مثبت اور لطیف صفت ہے جس کی قرآن مجید میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ یہ پیغمبرانہ صفت ہے۔ جب جناب ابراہیمؑ نے جناب اسماعیلؑ کو اپنا خواب سنایا کہ انہوں نے دیکھا کہ وہ انہیں ذبح کر رہے ہیں تو جناب اسماعیلؑ نے فرمایا کہ وہ اپنے خواب کو سچ ثابت کر دیں یعنی انہیں ذبح کر دیں اور وہ انہیں (جناب اسماعیلؑ کو) صابرین میں پائیں گے۔ قرآن ہی میں یہ بھی ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

فروع دین میں نماز کے بعد روزہ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ روزہ میں چونکہ صبر، ضبط اور تحمل کی حسین تشریح موجود ہے اس لیے اس آیت کی تفسیر میں بیشتر مترجمین اور مفسّرین نے صبر سے مراد روزہ لیا ہے۔ یعنی روزہ کے ذریعہ اللہ کی مدد حاصل کرو۔ قرآن میں جہاں روزہ کا حکم دیا گیا ہے وہاں روزہ کی غرض و غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ تم متقی بن جاؤ گے۔ یعنی روزہ رکھنے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے جو کہ ایک اعلیٰ صفت ہے اور تقرب الٰہی کا موجب ہے۔

روزہ کے بارے میں ہم اپنے مضمون "روزے ہوں تو ایسے" ("چراغاں" حصہ اوّل "قندیل") میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔ سورۂ دہر کی آیات ۷، ۸ اور ۹ میں حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ، جناب حسنینؑ اور جناب فضہؓ کے نذر کے روزوں اور ان کے اجر کا تفصیلی بیان موجود ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے لاتعداد موقعوں پر صبر کے نمونے پیش کیے۔ مکہ میں حضور اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے یا ایذا پہنچانے والوں کی حضرت علیؑ سرزنش کیا کرتے تھے جب کہ اپنے گستاخ کو سزا نہیں دیتے تھے۔ یہی صبر ہے۔ ایک

جنگ میں جب آپؑ دشمن کے سینے پر سوار تھے اور اس کا سر اتارنا چاہتے تھے۔ اس نے آپؑ کے چہرے پر لعاب دہن پھینک دیا۔ آپؑ فوراً اس کے سینے سے یہ سوچ کر اتر آئے کہ اس حالت میں اسے قتل کرنا اپنی ذاتی توہین کا بدلہ ہو جائے گا، جب کہ میرا قتال میرے اپنے لیے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہے۔ بعد میں اسی دشمن کو حالت جنگ میں واصلِ جہنم کیا۔ یہ صبر ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے جنگ صفین، جنگ نہروان اور جنگ جمل میں بھی بے مثال صبر کیا۔ ایک موقعہ پر آپؑ نے فرمایا: "صبر و استقامت کی ایمان کے مقابلے میں وہی حیثیت ہے جو سر کی بدن کے مقابلے میں ہے۔"

صلوٰۃ:

صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں نماز، دعا، رحمت۔

فروعِ دین میں اولین حکم عبادت نماز ہے۔ شرعی اصطلاح میں قیام رکوع و سجود اور دیگر مخصوص افعال کو صلوٰۃ کہتے ہیں، جو مخصوص اوقات میں جملہ شرائط اور صفات اور اقسام کے ساتھ بجالائی جاتی ہے۔

نماز کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں کہ "نماز دین کا ستون ہے۔" (تہذیب الاحکام)۔ نماز یومیہ (بشمول نماز جمعہ)، نماز طواف خانۂ کعبہ، نماز میت اور نماز آیات ہر بالغ مرد و عورت پر واجب ہیں۔ نماز جنازہ یا نماز میت واجب کفائی ہے۔ اسی طرح وفات کے بعد باپ کی قضا نمازیں بڑے بیٹے پر واجب ہیں۔ ان نمازوں میں نماز جمعہ غیبتِ امامؑ کے دوران شرائط کے ساتھ ہے۔ ان کے علاوہ وہ نماز جو اجارہ، منت، نذر، قسم اور عہد کی وجہ سے واجب ہوگئی ہو۔

نماز میں نیت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جتنے خلوص، توجہ اور دلجمعی سے نماز ادا کی جائے گی اتنی ہی پر اثر اور مقبول بارگاہِ ایزدی ہوگی۔ نماز فحاشی اور منکرات سے بچاتی

ہے۔نماز کے توسط سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

امام محمد باقرؑ روایت فرماتے ہیں کہ "بندہ سے سب سے پہلے جس چیز کا سوال کیا جائے گا وہ نماز ہے۔اگر یہ قبول ہو جائے گی تو بقیہ تمام اعمال بھی قبول ہو جائیں گے۔"

امام المتقین حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ فرزند آدمؑ کے اعمال میں سے پہلا عمل جس پر توجہ دی جائے گی وہ نماز ہوگی۔اگر یہ صحیح نکلی تو پھر اس کے دوسرے اعمال پر بھی نظر کی جائے گی اور اگر نماز ہی درست نہ نکلی تو پھر دوسرے اعمال کو بھی نہیں دیکھا جائے گا۔" (وسائل الشیعہ، جلد۳)۔

جو لوگ نماز کو اہمیت نہیں دیتے یا نماز پڑھنے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ امام محمد باقرؑ کی بیان کردہ حدیث پر غور کریں، "جس میں پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی جو اپنی نماز کو خفیف سمجھے گا اور بخدا وہ شخص حوض کوثر پر میری بارگاہ میں حاضر نہ ہو سکے گا۔" (وسائل الشیعہ جلد۳)۔

نماز ہر نبی کی اپنی امت کو آخری وصیت تھی۔نماز کی اہمیت کا اندازہ اس چیز سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سات سو مقامات پر نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

حضور اکرمؐ کی کثرت ادائیگی نماز پر اللہ نے سورۂ مزمل میں ارشاد فرمایا: "اے میرے چادر لپیٹنے والے، رات کو اٹھیے مگر ذرا کم، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر دیجیے۔"

حضرت علیؑ نے صفین میں، مدائن میں حضرت امام حسنؑ نے اور شب عاشور کربلا میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ نے تمام رات نماز میں بسر فرمائی۔ جناب امام زین العابدینؑ نے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام، ہر جگہ انتہائی تکلیف دہ حالات میں، ہتھکڑی اور بیڑیوں کے ساتھ نماز ادا کی۔ جنابِ زینبؑ و امِ کلثومؑ اور تمام اسیرانِ شام نے سنگین حالات میں بھی نماز کی ادائیگی فرمائی۔ یہ تھی عملی صورت نماز سے مدد حاصل کرنے کی۔

مآخذ

(۱) تفسیر المیزان فی تفسیر القرآن، علامہ محمد حسین طباطبائی ترجمہ مولانا حسن رضا غدیری، ناشر المعراج کمپنی لاہور۔

(۲) ''نماز پیغمبرؐ احادیث کی روشنی میں'' تالیف: حسین الامینی۔

(۳) ''حی علی الصلوٰۃ الرسول'' تالیف: مسعود نوازش۔

(۴) ''توضیح المسائل'' آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ خمینی الموسویؒ و مرجع جہان تشیع آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ الوارف۔

سَبْعًامِنَ الْمَثَانِیْ

""ہم نے تمہیں سبع مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے""

قرآنِ مجید کے پندرہویں سورے الحجر کی آیت ۸۷ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(ترجمہ) اور یقیناً ہم نے تمہیں سات دہرائی جانی والی (آیتیں) (سورۂ فاتحہ) اور بڑی عظمت والا قرآن دیا ہے۔

تفسیر صافی میں بحوالہ عیون اخبار الرضا، جناب امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور اس سورے کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ملا کر سات آیتیں ہیں اور میں نے خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے خطاب کر کے یہ فرمایا تھا: "یا محمد و لقد اٰتینک سبعاً من المثانی والقراٰن العظیم" پس سورۂ فاتحہ کے عطا کرنے سے مجھ پر احسان خاص کیا اور اس کو قرآن عظیم کے برابر (مساوی) قرار دیا۔

تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ سورۂ حمد ہے جس کی سات آیتیں ہیں اور مثانی اس کا نام اس لیے ہوا کہ یہ نماز کی پہلی دو رکعتوں میں پڑھی جاتی ہے۔

تفسیر قمی اور تفسیر عیاشی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ مثانی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عطا فرمائی وہ ہم ہیں۔

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے امام علیہ السلام کے اس قول کا یہ مطلب لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں قرآن مجید کے ساتھ ملایا ہے اور امت کو دونوں یعنی قرآن مجید اور ہمارے ساتھ تمسک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ خبر بھی دے دی کہ حوض کوثر پر پہنچنے تک ہم دونوں جدا نہ ہوں گے۔

صاحب تفسیر صافی نے اس میں ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو سات فرمایا، غالباً اس اعتبار سے کہ چہاردہ معصومینؑ کے اسمائے مبارک سات ہی ہیں (یعنی محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ، جعفرؑ اور موسیٰؑ علیہم السلام)۔ اصل اسمائے مبارک یہی ہیں۔ باقی تین محمدؐ ہیں اور تین علیؑ اور ایک حسنؑ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مثانی، ثنا سے مشتق ہو جس کے معنی تعریف کے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ ان سات ناموں کے حامل سب ممدوح و معروف ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مثانی تثنیہ سے مشتق ہو تو اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کا ثانی قرار دیا اور ایک یہ کہ سبعاً من المثانی یعنی سات سے دو چند۔ گویا تعداد چہاردہ معصومین بتا دی۔

یہ آیت جس میں سورۂ حمد اور سبع مثانی کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ سورۂ حجر کی ہے اور وہ ان سورتوں میں سے ہے جو بلا شبہ مکہ میں نازل ہوئیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سورۂ حمد بھی مکہ میں نازل ہوئی ہو۔

سورۂ حمد کے مکی ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ نماز کا حکم مکہ میں آیا ہے اور تمام مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں کبھی کوئی ایسی نماز ادا نہیں کی گئی جس میں سورۂ حمد شامل نہ رہی ہو۔ رسول اکرمؐ نے بھی اس بارے میں بالصراحہ فرمایا ہے کہ سورۂ حمد کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے اور یہ حدیث شیعہ اور سنی دونوں مکاتب کے محدثین نے نقل کی ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے اور ابتدا ہی سے مسلمان اس سورہ کی تلاوت کے

ساتھ نماز ادا کرتے رہے ہیں۔

تاہم بعض مفسرین نے ایک تیسرا نظریہ اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ حمد اپنی عظمت اور اہمیت کی بنا پر دو مرتبہ نازل ہوا ہے، ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں۔

یہ نظریہ بھی بجائے خود صحت اور امکان سے خالی نہیں لیکن کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو اسے ثابت کر سکے یا اس کی تائید کرے۔ شاید دو مرتبہ نازل ہونے کی بنا پر ہی اس سورۃ کو سبع مثانی کہا گیا ہے اور ممکن ہے کہ یہ سورۃ ہر نماز میں دو بار (یعنی پہلی اور دوسری رکعت میں) پڑھا جاتا ہے اس لیے اسے سبع مثانی کا نام دیا گیا ہو۔

اس ضمن میں مولانا سید مقبول احمد دہلوی اعلی اللہ مقامہٗ نے اس آیت کے ترجمہ اور حاشیہ میں درج شدہ وضاحت کم و بیش وہی کی ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ مولانا سید مقبول احمد دہلوی مرحوم مزید فرماتے ہیں:

''اگر کسی کو یہ اعتراض سوجھے کہ چودہ معصومین میں تو خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہیں اور آیت کے معنی سے جو کچھ دیا گیا وہ الگ مفہوم ہوتا ہے اور جس کو دیا گیا وہ علیحدہ، تو وہ یہ سمجھ لیں کہ اصل مخاطب نور ہے جس کے سب اجزاء ہیں۔ پس معطی جو کچھ دیا گیا اور معطے لہٗ جس کے لیے دیا گیا، کی مغائرت (یعنی ان کا الگ الگ ہونا) اعتباری ہے۔''

یہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ کہ اس آیۂ وافیہ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم کو دو چیزیں مرحمت فرمانے کا اعلان کیا ہے، ایک ''سبع مثانی'' اور دوسری ''الکتاب''۔ اب اگر سبع مثانی سے مراد سورہ حمد ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا سورۂ فاتحہ قرآن سے علیحدہ ہے۔ اگر سورۂ حمد کتاب (قرآن مجید) میں شامل ہے تو اتنا کہنا کافی تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب عطا کی۔ مگر یہاں سبع مثانی پہلے ہے اور کتاب بعد میں۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ سبع مثانی سے مراد چہاردہ معصومین ہیں جنہوں نے جناب رسالت مآبؐ کے وصال کے بعد اپنی جانوں پر کھیل کر اس کتاب کی حفاظت کی۔ مثال کے طور پر چہاردہ معصومین علیہم السلام کے پہلے فرد یعنی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کتاب کو انسانوں تک پہنچانے میں کس قدر مشقت فرمائی۔ ان کے بعد مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے کتنے جتن کیے۔ ان کے بعد جناب امام حسنؑ نے ناساعد حالات میں کبھی جنگ سے اور کبھی حلم وتدبر سے کام لیتے ہوئے صلح کی اور اس طرح مسلمانوں میں دو گروہوں کو خوں ریزی سے بچایا۔ اس کے بعد سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام نے تو کمال قربانی سے اسلام کی آبیاری فرمائی۔

مآخذ

۱۔ "القرآن المبین" تفسیر الثقلین۔ حضرت مولانا مولوی سید امداد حسین صاحب قبلہ کاظمی المشہدی۔

۲۔ "البیان" تفسیر سورۃ الحمد۔ الامام الخوئی۔

۳۔ ترجمہ وتفسیر قرآن مجید مولانا سید مقبول احمد دہلوی اعلی اللہ مقامہٗ۔

شفاعت

حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اپنی کتاب "۱۱۰ سوال و جواب" کے باب "فلسفۂ شفاعت کیا ہے؟ اور کیا شفاعت کی امید، گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی؟" میں فرماتے ہیں:

الف: امید کی کرن اور مایوسی سے مقابلہ: بعض اوقات انسان پر ہوائے نفس کا غلبہ ہو جاتا ہے اور بہت سے، ہم گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے، جس سے گنہگار انسان مایوسی اور نا امیدی کا شکار ہو جاتا ہے، جس سے اسے مزید گناہ انجام دینے میں مدد ملتی ہے کیونکہ ایسے موقع پر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب تو پانی سر سے گزر گیا ہے، چاہے ایک بالشت ہو یا سو بالشت؟!

لیکن شفاعتِ اولیاء اللہ ان کو بشارت دیتی ہے کہ بس یہیں رک جاؤ اور اپنی اصلاح کی کوشش کرو۔ ممکن ہے ان کے گزشتہ گناہ شافعین کی شفاعت پر بخش دیے جائیں۔ لہٰذا شفاعت کی امید انسان کو مزید گناہ سے روکتی ہے اور تقویٰ و اصلاح نفس میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ب۔ اولیاء اللہ سے معنوی تعلق پیدا ہونا: شفاعت کے معنی کے پیش نظر یہ نتیجہ حاصل کرنا آسان ہے کہ شفاعت اسی وقت ممکن ہے جب "شفیع" اور "شفاعت ہونے والے شخص" کے درمیان ایک قسم کا رابطہ ہو، لہٰذا شفاعت کے لیے ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ معنوی رابطہ ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کی شفاعت کی امید رکھتا ہو تو اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ شفاعت

کرنے والے سے بہترین تعلقات قائم رکھے اور ایسے اعمال انجام دے، جن سے وہ خوش رہے، برے کاموں سے اجتناب کرے، اس کی محبت ودوستی کو بالکل ختم نہ کرڈالے۔

یہ تمام چیزیں انسانی تربیت کے لیے بہترین اسباب ہیں، جن کے ذریعہ انسان آہستہ آہستہ گناہوں کی گندگی سے باہر نکل آتا ہے، یا کم از کم بعض برائیوں کے ساتھ ساتھ نیک کام بھی انجام دیتا ہے اور شیطان کے جال میں مزید پھنسنے سے بچ جاتا ہے۔

ج۔ شفاعت کے شرائط حاصل کرنا: قرآن مجید کی متعدد آیات میں شفاعت کے لیے بہت سے شرائط ذکر ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن و اجازت ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ جو شخص شفاعت کا امیدوار ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضایت حاصل کرنی ہوگی۔ یعنی اسے ایسے اعمال انجام دینے ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ راضی وخوشنود ہوجائے۔

بعض آیات میں بیان ہوا ہے کہ روز قیامت صرف ان ہی لوگوں کے بارے میں شفاعت قبول کی جائے گی جن کے بارے میں اللہ نے اجازت دی ہو اور ان کی باتوں سے راضی ہوگیا ہے۔ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۰۹) اور (سورۂ بقرہ، آیت الکرسی)۔

سورۂ انبیاء، آیت ۲۸ میں بیان ہوا ہے کہ شفاعت کے ذریعہ صرف انہیں لوگوں کی بخشش ہوگی جو "مقام ارتضاء" (یعنی اللہ کی خوشنودی) تک پہنچ چکے ہوں گے اور سورۂ مریم، آیت ۸۷ کے مطابق جن لوگوں نے اللہ سے عہد کرلیا ہو۔ یہ تمام مقامات اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان اللہ تعالیٰ اور اس کی عدالت پر ایمان رکھتا ہو، نیکیوں اور برائیوں میں حکم الٰہی کو قبول کرتا ہو، اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ تمام قوانین کے صحیح ہونے پر گواہی دے۔

اس کے علاوہ بعض آیات میں بیان ہوا ہے کہ ظالمین کو شفاعت نصیب نہ ہوگی، لہٰذا شفاعت کی امید رکھنے والے کو ظالمین کی صف سے باہر نکل آنا ضروری ہے۔ (چاہے وہ کسی

بھی طرح کا ظلم ہو، دوسروں پر ظلم ہو یا اپنے نفس پر ظلم ہو)۔

یہ تمام چیزیں باعث بنتی ہیں کہ شفاعت کی امید رکھنے والا شخص اپنے گزشتہ اعمال پر تجدید نظر کرے اور آئندہ کے لیے بہتر طور پر منصوبہ بندی کرے، یہ خود انسان کی تربیت کے لیے بہترین اور مثبت پہلو ہے۔

د۔ **شافعین پر توجہ:** قرآن کریم میں شافعین کے سلسلے میں بیان شدہ مطالب پر توجہ، اسی طرح احادیث معصومین علیہم السلام میں بیان شدہ وضاحت پر توجہ کرنا مسئلہ شفاعت کا ایک دوسرا تربیتی پہلو ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا:

''روز قیامت شفاعت کرنے والے پانچ ہیں: قرآن، صلۂ رحم، امانت، تمہارے پیغمبرؐ اور اہل بیت پیغمبرؐ (علیہم السلام)۔ (میزان الحکمہ، جلد۵، ص۱۲۲)۔

ایک دوسری حدیث جو مسند احمد میں نقل ہوئی ہے، پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''قرآن کی تعلیم حاصل کرو کیونکہ وہ روز قیامت تمہاری شفاعت کرنے والا ہے۔'' (مسند احمد، جلد۵، ص۲۵۱، (طبع بیروت دار صادر)۔

یہی معنی نہج البلاغہ میں امام المتقین حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے بیان ہوئے ہیں: ''قرآن کریم ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت بارگاہ الٰہی میں مقبول ہے۔'' (نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶)۔

متعدد روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شفاعت کرنے والوں میں سب سے بہترین شفاعت کرنے والی چیز ''توبہ'' ہے۔ ''توبہ سے زیادہ کامیاب کوئی شفیع نہیں ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۷۱)۔

بعض احادیث میں انبیاء، اوصیاء، مومنین اور ملائکہ کی شفاعت کی تصریح کی گئی ہے،

جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ کی حدیث ہے: ''انبیاء، اوصیاء، مومنین اور فرشتے شفاعت کرنے والے ہیں اور مومنین کے درمیان شفاعت کرنے والے ایسے بھی ہوں گے جو قبیلہ ''ربیعہ'' اور ''مضر'' کے برابر شفاعت کریں گے اور سب سے کم شفاعت کرنے والے مومنین (بھی) تیس افراد کی شفاعت کریں گے۔''

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت ''عابد'' اور ''عالم'' کو مبعوث کرے گا اور جس وقت یہ دونوں عدل الٰہی کے مقابل کھڑے ہوں ''عابد سے کہا جائے گا کہ تم جنت میں چلے جاؤ اور عالم کو روک دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ تم ان لوگوں کی شفاعت کرو جن کی تم نے نیک تربیت کی ہے۔'' (بحار الانوار، جلد۸، ۵۶، حدیث ۶۶)۔

گزشتہ روایات خصوصاً آخری روایات میں ایسے الفاظ بیان ہوئے ہیں جن سے صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کی امید رکھنے والے کے لیے نیک افراد، مومنین اور علماء سے ایک معنوی رابطہ ہونا ضروری ہے۔

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے بارے میں بھی پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''شہداء میں سے ہر شہید اپنے خاندان اور پڑوسیوں میں سے ستر ہزار افراد کی شفاعت کرے گا۔'' (مجمع البیان، جلد۲، ص۵۳۸، (سورۂ آل عمران آیت ۱۷۱ کے ذیل میں)۔

یہاں تک بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شفیع انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عمل حق ہے۔'' (غرر الحکم)۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اسلامی معتبر کتابوں میں بیان شدہ ان تمام روایات کے پیش نظر صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شفاعت اسلام کے اہم ترین تربیتی مسائل میں ہے، جس کی شفاعت کرنے والوں کی قسموں کے اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت ہے، اور تمام مسلمانوں کو

شفاعت کی اس عظیم منزلت کی طرف اور شفاعت کرنے والوں سے معنوی رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور مسئلہ شفاعت کے غلط اور تحریف شدہ شفاعت کے معنی کو الگ کر دیتی ہے۔ (تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ شفاعت کے معنی 'مسببات میں اسباب کی تاثیر'' کرتے ہوئے شافعین کی دو قسم بیان کرتے ہیں: ''عالم تکوین'' اور ''عالم تشریع'' اور تشریعی شافعین میں توبہ، ایمان، عمل صالح، قرآن، انبیاء، ملائکہ اور مومنین کا شمار کرتے ہیں۔ پھر اس سلسلے میں دلالت کرنے والی ان آیات کو بیان کرتے ہیں جو گناہوں کی بخشش میں مذکورہ چیزوں یا ان حضرات کی تاثیر کو بیان کرتی ہیں (اگرچہ ان آیات میں شفاعت کا لفظ نہیں ہے)، جیسے سورۂ زمر، آیت ۵۴، سورۂ حدید، آیت ۲۸، سورۂ مائدہ، آیت ۹ اور آیت ۱۶، سورۂ نساء، آیت ۶۴، سورۂ مومن (غافر)، آیت ۷، اور سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۶)۔ (یہی تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، ص ۵۲۳ میں بھی ہے)۔

شفاعت کے سلسلے میں کچھ باتیں شہید محراب آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب شیرازیؒ کی کتاب ''قلب سلیم'' جلد اول سے:

اگر یہ کہا جائے کہ ''خدا اپنی مخلوقات میں سے سب سے زیادہ شفیق انسانوں پر ہے اور ان کے زیادہ نزدیک ہے۔ لہٰذا کسی کی شفاعت کی کیا ضرورت ہے؟'' تو ایسی غلط فہمی کے ازالے کے لیے بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں (جن کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے)۔ ہم صرف دو آیات پر غور کریں گے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے: ''اے رسولؐ! جب ان لوگوں نے نافرمانی کے ذریعہ اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر تمہارے پاس چلے آتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور اے رسولؐ! (تم) بھی ان کی مغفرت چاہتے تو بے شک وہ اللہ کو توبہ کا بڑا قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔ (سورۂ نساء، آیت ۶۴)۔ سورۂ نساء کی آیۂ شریفہ سے جناب رسالت مآبؐ کا منصب شفاعت بخوبی ثابت ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد:

تفسیر منہج الصادقین میں امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ اس دنیا سے رحلت فرما گئے تو ہم نے آپ کو دفن کر دیا۔ تدفین کے تین دن بعد ایک اعرابی آنحضرتؐ کی قبر کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا۔ قبر کی خاک پر سر رکھا اور کہنے لگا "یا رسول اللہؐ! آپ نے جو کچھ کہا ہم نے سنا۔ ہم نے مانا، لیکن افسوس کہ جو کچھ آپؐ ہمارے لیے لائے تھے، کماحقہٗ ہم نے اس پر عمل نہیں کیا، جو کتاب آپ لائے تھے اس میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اے رسولؐ! جب ان لوگوں نے (نافرمانی کے ذریعہ) اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر وہ آپؐ کے پاس چلے آتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور اے رسولؐ! آپ بھی ان کی مغفرت چاہتے تو وہ لوگ اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔" یا رسول اللہؐ! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اب میں آپؐ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپؐ میرے لیے اللہ سے مغفرت طلب فرمائیں۔"

آنحضرتؐ کی قبر مبارک سے آواز آئی: "قد غفر اللہ لک۔" اللہ نے تجھے معاف کر دیا!

ایک روایت میں ہے کہ اس آواز کو مسجد میں موجود افراد نے سنا اور زار و قطار رونے لگے۔

پسران یعقوبؑ کی شفاعت:

جب حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی خیانت آشکار ہوئی تو انہوں نے حضرت یعقوبؑ کے پاؤں پکڑ لیے اور عرض کی کہ اے والد بزرگوار! اللہ کے حضور ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیے گا۔ بے شک ہم خطا کار ہیں۔ جناب یعقوبؑ نے فرمایا: میں بہت جلد اپنے پروردگار سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا مانگوں گا۔ بے شک وہ بہت بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے۔ (سورۂ یوسف، آیت ۹۷۔۹۸)۔

تفسیر منہج الصادقین میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ان کی مغفرت کے لیے شب جمعہ کی سحر کا وقت مقرر کیا تھا۔ منقول ہے کہ بیس برس سے زیادہ حضرت یعقوبؑ ہر شب جمعہ کی

سحر کو اپنے بیٹوں کو ایک صف بنانے کا حکم دیتے تھے۔ ان کے لیے دعا و مغفرت کرتے تھے اور تمام بیٹے آمین کہتے تھے۔ آخر بیس سال بعد ان کی توبہ قبول ہوئی۔

اس آیت سے بھی بخوبی علم ہوتا ہے کہ موضوع شفاعت اللہ کی تمام شریعتوں میں موجود رہا ہے۔

شفاعت میں پوشیدہ مصلحتیں:

شفاعت میں کئی طرح کی مصلحتیں پوشیدہ ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک بزرگان دین کا شرف و مقام ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح لوگ ان کی بات مانتے ہیں اور ان کی عزت و احترام کرتے ہیں۔ ان کی روحانیت اور نورانیت سے روحانی اور نورانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ اپنی حاجات اور امیدوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اللہ کے اوامر و نواہی جن کی وہ تشکیل کرتے ہیں، ان میں اطاعت بھی کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص حضرتِ رسولؐ اور ان کے اوصیاء سے شفاعت کی امید رکھتا ہو وہ یقیناً صدقِ دل سے ان کی اطاعت بھی کرے گا۔ اگر کہیں وہ ان کے احکام کے برخلاف بھی چلے گا تو اس کا موجب لاپرواہی اور ڈھیٹ پن نہیں ہوگا، بلکہ اس کے پیچھے نفسانی خواہشات ہوں گی۔ ایسے شخص کو آخرکار توبہ کی ہدایت نصیب ہوگی اور ان حضرات کی شفاعت کے طفیل بخشا جائے گا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ عادل ہے اور ہر ایک کو گناہ کی نوعیت کے مطابق سزا دے گا۔ البتہ اپنے فضل و کرم سے اللہ بندے کو نواز سکتا ہے اور محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی شفاعت کے وسیلے سے اسے بخش سکتا ہے۔

معنوی حج

حج سوچ سمجھ کر بجالائیں:۔

حج فروع دین میں شامل ایک ایسی عبادت ہے جو انسان کی زندگی کو ایک مثبت سمت میں گامزن کرنے کا ایک بہترین ذریعہ بن سکتی ہے۔ استطاعت ہونے پر ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ حج بجالائے۔ چونکہ حج بجالانے کے لئے خطیر رقم درکار ہوتی ہے، اسے ایک خاص تاریخ اور وقت پر انجام دینا ہوتا ہے اور اس کے لئے کئی مقامات پر ٹھہرنا اور کئی اعمال انجام دینے ہوتے ہیں اس لئے اللہ نے اس عبادت کو زندگی میں صرف ایک بار لازمآ اور ثواب کی غرض سے بار بار ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بہت مشہور حدیث ہے کہ استطاعت کے باوجود اگر کسی نے حج نہیں کیا اور اس کی موت واقع ہو گئی تو وہ نصرانی یا یہودی کی موت مرا۔ کم علمی کے باعث بہت سے لوگوں نے کچھ ایسے مفروضے گڑھ رکھے ہیں کہ وہ استطاعت کے باوجود حج کو ٹالتے رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے ابھی حج نہیں کیا لہٰذا وہ ابھی حج نہیں کر سکتا، یا چونکہ اسے ابھی بچوں یا بچیوں کی شادی کرنی ہے لہٰذا اس پر ابھی حج واجب نہیں۔ یہ سب شیطانی عذر ہیں۔ ماں باپ کا حج ان کی استطاعت سے مشروط ہے، اولاد پر اس کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں، ہاں اگر اولاد ماں باپ کو حج کرادے تو اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یہ بھی حدیث ہے کہ حج ادا کرنے والے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ حج ادا کرنے کے بعد وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے کہ ابھی ابھی

پیدا ہوا ہو۔

حج کے سلسلے میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ ان باتوں کی نشاندہی کرنا اس مضمون کا مقصد ہے اور اس کے لئے ہم نے جناب مولانا صادق حسن صاحب کی تقاریر اور ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب "حج" سے استفادہ کی سعادت حاصل کی ہے۔

حج ان اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جن میں انضباط ہو۔ وہ وقت سے وابستہ ہوں اور اجتماعی صورت کی حامل ہوں۔ اس طرح مقرر کردہ فقہی احکامات کی روشنی میں تمام حجاج کرام حج بجالاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر حج کو اس کی روح کے ساتھ کیا جائے یعنی ہر حاجی کی تطہیر نفسی بھی ہو جائے تو یہ زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ حج تمام عبادات میں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، جہاد وغیرہ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں کہ اس ایک رکن عبادت میں تمام عبادات کا خلاصہ نظر آتا ہے۔ حج کی مثال قرآن کی آیات متشابہات جیسی ہے۔ آیات محکمات تو صاف اور واضح ہوتی ہیں لیکن متشابہ آیات اپنے اندر معانی اور رموز کا ایک سمندر رکھتی ہیں۔ جو ہر دور میں اسرار و انکشافات کی موجیں ابھارتی رہتی ہیں۔ حج اللہ کی سمت بندے کا ایسا سفر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانوں سے شخصی یا ذاتی بالیدگی کے ذریعہ کیسے ایک اعلیٰ و ارفع اور مثالی معاشرے کا قیام چاہتا ہے۔

جو بھی شخص حج کرتا ہے وہ اللہ کے حضور حاضری (جو وطن میں بھی بعید نہیں) اور اللہ کے ایک حکم کی پیروی کے لئے ذہنی، جسمانی اور مالی ہر طرح کی قربانی دے کر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے میقات کے تعین کا مسئلہ آتا ہے، جو خدا نے اپنے گھر آنے والوں کے لئے زمین کے مختلف حصوں میں معین کر دیئے ہیں۔ یہاں پہونچ کر احرام لینا یعنی تمام

رنگوں، لباس کے تمام تفاخر سے مبرّا ہو کر کفن پہن لینا، اپنی "میں" کے خول سے باہر آ کر تمام حاجیوں کی طرح ایک سفید یونیفارم جو ہر سطح کے افراد کے لئے ایک ہی ہے، اختیار کر لینا۔

احرام پہننا حج کی پہلی نیت ہے۔ کام میں نیت کا خاص دخل ہوتا ہے۔ کوئی بھی کام کرنے والا جب تک اپنے ہدف کا تعین نہیں کرے گا وہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ احرام کی نیت کے ساتھ ہی کتنے امور کی پابندی کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ مثلاً آئینہ نہ دیکھنا یعنی خود اپنے آپ پر نظر نہ پڑنے دینا۔ خوشبو نہ سونگھنا یعنی زندگی کی مادی لذات سے کنارہ کش ہو جانا۔ فخر و مباہات نہ کرنا یعنی کسی دوسرے کو اپنے سے کمتر نہ جاننا۔ کسی کو گزند نہ پہونچانا حتیٰ کہ چیونٹی مچھر یا جوں تک نہ مارنا۔ حرم کی زمین سے گھاس، تنکا یا کسی پیڑ کا پتہ بھی نہ توڑنا۔ شکار نہ کرنا۔ تخریب و جارحیت کے جذبوں کو کچل دینا۔ مقاربت اور سامان ازدواج یعنی نکاح نہ خود انجام دینا نہ کسی میں شرکت کرنا۔ ہر طرح کے بناؤ سنگھار سے دور رہنا۔ جھوٹ، غیبت، بدزبانی، بدکلامی اب اور زیادہ ممنوع۔ اسلحہ ساتھ نہ رکھنا۔ سر پر سایہ نہ کرنا۔ پاؤں کے اوپری حصے کو موزے یا جوتے سے نہ چھپانا۔ بال نہ مونڈنا، ناخن نہ کاٹنا وغیرہ۔ غرض یہ کہ بہت سے کام جو عام زندگی میں جائز ہیں انہیں اپنے اوپر حرام کر لینا اور جو پہلے ہی حرام ہیں ان سے اور زیادہ اجتناب کرنا اور تلبیہ پڑھتے ہوئے اللہ سے رجوع کرنا۔

میقات و احرام سے ہو کر حاجی کعبۃ اللہ تک پہونچتا ہے۔ مجازی طور پر اللہ کا گھر جو پتھر اور چونے سے بنی ایک مکعب نما سادہ سی عمارت ہے اس کے گرد انسانوں کا سمندر چکر کاٹ رہا ہے۔ ایک مرکز اور اس کے گرد دائرہ در دائرہ افراد نظم و ضبط سے حرکت پذیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مکان و زمان سے بے نیاز ہے لیکن اس مقام کو اللہ کا گھر قرار دیا گیا ہے۔ اسی تصور سے کائنات کا ذرہ ذرہ اس قادر مطلق کی اتباع میں حرکت پذیر ہے۔ یہ انسان بھی اسی مرکز کے گرد حلقہ کیئے ہوئے نظم و ضبط اور خلوص کے ساتھ اس کے احکامات کی پیروی کا

ارادہ کئے ہوئے گھوم رہے ہیں۔ اس طواف کی ابتداء حجر اسود کو چوم کر یا کم از کم سیدھے ہاتھ کے اشارے سے استیلام کر کے کرنی ہے جو کہ علامت ہے بیعت کی۔ کسی اہم شخصیت کی بیعت کا مطلب ہوتا ہے تمام دوسرے معاہدوں کی نفی اور اس نئی بیعت کے تحت جس کی بیعت کی جائے اس کی مکمل پیروی۔ اب حاجی نے دنیا کی دیگر بیعتوں سے ہاتھ اٹھا لیا اور اللہ کی بیعت کا ارادہ کر کے طواف کا قصد کر لیا۔ سات کا عدد "دنیا کی خلقت" کی یاد دلاتا ہے۔ "ہم نے کائنات کو سات دنوں میں خلق کیا"۔

طواف کے بعد مقامِ ابراہیمؑ کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کرنا گویا حضرت ابراہیمؑ کی قربت حاصل کرنا ہے۔ تاریخ کے عظیم بت شکن، خانہ کعبہ کے بنیاد رکھنے والے، آزادی کے گھر کے معمار، نظریہ توحید کے بانی مبانی، مشغول عاشق، آگاہ، رائدہ قبیلہ، جہل و شرک سے نبرد آزما، تن تنہا عشق الٰہی میں شعلوں میں کود پڑنے والے، خدا کی راہ میں بیٹے جیسی نعمت کی قربانی پیش کرنے والے کے نقشِ قدم کے پیچھے شکرانہ طواف کی نماز ادا کرنے کا سرور ہی کچھ اور ہے۔

اس کے بعد سعی کا مرحلہ ہے۔ سعی ایک ایسا خوب صورت اور عشق و محبت سے بھرا ہوا عمل ہے جس کے تصور سے جھرجھری آجاتی ہے۔ یا اللہ دنیا میں ماںتا کی کیسی کیسی مثالیں ہیں۔ کتنی ماؤں نے اپنی اولادوں کے لئے کیا کیا کوششیں (سعی) نہ کی ہوں گی، کیسی کیسی زحمتیں نہ اٹھائی ہوں گی۔ مگر اس ایک کنیزِ خاص جناب حاجرہ، جو اللہ کے حکم کے تحت اپنے شیر خوار بیٹے کے ہمراہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں نہ دانہ تھا نہ پانی، صرف اپنے مجازی آقا اور حقیقی آقا کے حکم کے تحت ٹھہر گئی تھیں۔ اللہ اللہ! ان کے ایمان و استقامت کا کیا کہنا۔ ایسے میں جب بچہ پیاس سے بے چین ہوا تو وہ اسے زمین پر لٹا کر صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر پانی تلاش کرنے کی سعی فرمانے لگیں۔ اللہ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس نے

اس عمل کو اپنے آخری نبیؐ کے ذریعہ قیامت تک کے صاحبانِ ایمان کے لئے واجب العمل قرار دے دیا۔ وہ نشیبی جگہ جہاں سے حضرت اسماعیلؑ ماں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے، جناب حاجرہ تیز قدم چلیں، چنانچہ آج بھی حاجی اس جگہ پر تیز قدم سے چلتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب رزق کا وعدہ اللہ کی طرف سے ہے اور جناب حاجرہ کامل الایمان تھیں تو اس سعی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی ہر عنایت کا دارومدار انسان کی سعی پر ہے۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ انسان وہی کچھ حاصل کرتا ہے جتنی وہ سعی کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ایمان کے ساتھ ساتھ سعی کامل بھی لازمی ہے۔ دنیاوی کاموں میں ہم جتنا ہاتھ پاؤں چلائیں گے اس کے مطابق پائیں گے۔ یہ سعی ایک انسان کی اس سے وابستہ دوسرے انسان (یا انسانوں) کے لئے ہے۔ جب وہ سات سیدھے چکروں کے بعد مایوس بچے کی طرف آتی ہیں تو حیران رہ جاتی ہیں کہ بچے کی سعی (پیروں کو زمین پر مارنے) سے خشک زمین سے پانی نمودار ہو گیا۔ ماں کی سعی اس کے مطابق اور بچے کی سعی اس کے وجود کے مطابق ہے۔ ایمان کے ساتھ سعی کا انعام........سب جانتے ہیں کہ اس سرزمین کو اللہ نے کیسے کیسے انعامات و اکرامات سے نوازا، اور اسے دنیا بھر کے انسانوں کا مرکزِ نظر اور مرکزِ انعام بنا دیا۔

سعی میں مروہ پر آخری چکر کے اختتام پر احرام سے باہر آؤ۔ حجامت کرو، زندگی کا جامہ پہنو، تھوڑی دیر کے لئے جن نعمتوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے پھر سے بہرہ مند ہو جاؤ۔ طواف، نماز طواف، سعی اور تقصیر کے بعد حاجی کو محسوس کرنا چاہیے کہ اس کے اندر کا جمود ٹوٹ گیا ہے اور اس کے اندر سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ لطف کے دریا میں غوطہ لگانے کا محبت و محنت کا، انسان کا انسان کے لئے قربانی دینے کا، سعی کرنے کے احساس کا جو اس کی آئندہ زندگی کا عظیم انعام بن سکتا ہے۔

احرام سے آزادی اور عام زندگی مگر زیادہ دیر تک نہیں صرف نو ذی الحجہ تک۔ اس کے بعد پھر نکلنا ہے کعبہ سے دوسری طرف یعنی منیٰ، عرفات اور پھر مشعر الحرام (مزدلفہ) اور آخر میں پھر منیٰ۔ جہاں قربانی کرنی ہے اور رمی جمرات کرنا ہے۔

عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں بنیادی عمل "وقوف" ہے۔ سکونت یا اقامت نہیں۔ اس مختصر سے سفر میں یا تو "جہت" ہے یا "حرکت"۔ کعبہ سے جانا، عرفات پہونچنا پھر مرحلہ وار کعبہ کو واپس لوٹ جانا۔ انا اللہ............

ان تینوں مقامات کے ناموں میں جو رموز ہیں وہ اس طرح ہیں:

عرفات: یعنی پہچان۔ تعارف یعنی علم۔

مشعر: یعنی شعور۔ عقل یعنی فہم۔

اور منیٰ: یعنی عشق۔ ایک دوسرے میں کھو جانا۔

عرفات پہچان ہے۔ کہتے ہیں، زمین پر پہلی بار آدم وحوا نے ایک دوسرے کو از سر نو اسی سرزمین پر پہچانا۔ عرفات میں وقوف سے انسان اپنے آغاز سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ پہلے جوڑے کی پہلی بار شناخت یا پہچان یہیں پر ہوئی۔ شناخت کے بعد شعور سے ہمکنار ہوا۔ شعور کا خاصہ علم ہے اور شعور نے عقل وفہم کو افزودہ کیا اور آگہی نے خود آگہی پیدا کی۔

اس جگہ پر دعاؤں کی اتنی فضیلت ہے جو تحریر میں نہیں آسکتی۔ ایک بے آب وگیاہ میدان میں سادہ چادروں میں لپٹا ہوا انسان اللہ سے کتنا قرب حاصل کرسکتا ہے، یہ اس کی توفیق پر منحصر ہے۔

سورج کے ڈھلتے ہی عرفات سے نکلنے کا ارادہ کرنا اور مشعر میں پہونچنا جہاں فجر تک کا وقوف ہے۔ نہ کوئی خیمہ، نہ نشان، نہ دیوار، صرف اور صرف رات بھر کا وقوف اور شعور کی بالیدگی کا احساس۔ مشعر الحرام میں ٹھہرنا یعنی حرام سے اجتناب کے شعور کو اجاگر کرنا۔ آج

کی رات اپنے آپ کو سنوارنے، سدھارنے اور اللہ کے حضور آمادہ کرکے "خود آگاہی" سے لیس ہونے کا سنہری موقع ہے۔

مشعر کے وقوف میں بس ایک ہی کام ہے وہ ہے رمی جمرات کے لئے سنگریزے، پتھر یا اسلحہ مخصوص سائز کے "کارتوس" جمع کرنا اور نماز فجر کے بعد یہاں سے منیٰ کے لئے کوچ کرنا۔

دس ذی الحجہ کو منیٰ پہونچ کر پہلا کام بڑے شیطان کی سرکوبی کرنی ہے۔ سات کنکریاں ٹھیک ٹھیک یقین کے ساتھ مارنی ہیں، اس شیطان کو جو ہمیں اللہ کے احکامات سے روگردانی پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ کام ہم جتنے وثوق سے، جتنے خلوص سے اور اپنے روزمرہ اعمال میں شیطانی کاموں کو یعنی الٰہی احکامات کی نفی کے جذبہ کو کچلنے کی نیت سے کریں گے اتنے ہی کامیاب ہوں گے۔ اس طرح حج ہماری زندگی کو سدھارنے کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔

رمی کے بعد قربانی کا مرحلہ ہے۔ سنت ابراہیمی کا اجراء مگر بہت آسان طریقے سے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جگر گوشے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے لٹا دیا اور اس کی گردن پر چھری پھیرنے کی نیت کی۔ اللہ نے اس قربانی کو قبول فرما کر بیٹے کو بچا لیا اور دنبہ کو ذبح کرا دیا۔ حج کے آخری مراحل میں اللہ ہم سے بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے حکم پر اس کی خوشنودی کے لئے اپنے مال کو مویشی کی شکل میں قربان کرکے اللہ کی قربت حاصل کریں۔ قرآنی حکم ہے کہ "بے شک تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں۔" اس کو اللہ کی راہ میں پیش کر دینے کا حکم ایک اولوالعزم پیغمبر کے لئے اور عام جانور کی قربانی پیش کرنے کا حکم عامۃ الناس کے لئے۔ شیطان نے اپنی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے جناب ابراہیمؑ کو بھی اللہ کے حکم سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ جناب حاجرہ کو بھی ورغلایا اور جناب اسماعیلؑ کو بھی اس امر سے باز رہنے کی ترغیب دی۔ حج ان باتوں کو یاد دلا کر، شیطان کی سرکوبی کرا کے اور قربانی کو پیش کروا کے حاجی کو نیک بن جانے اور اللہ کا مطیع و فرمانبردار بن جانے

کا کیسا پر حکمت اور روح پرور طریقہ پیش کرتا ہے۔

قربانی کے بعد حلق یعنی سر منڈوانے کی تاکید بھی اس مقصد کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اپنے ذاتی بناؤ سنگھار اور خوبصورت نظر آنے کے جذبے سے باہر نکل کر عام آدمی کی سادہ روش اختیار کریں اور کم اہم معاملات سے توجہ ہٹا کر اہم امور پر غور وفکر کریں۔

بقیہ دو دنوں یعنی ۱۱ اور ۱۲ ذی الحجہ کو تینوں شیطانوں کو رمی کرنے کا مقصد تین خاص الٰہی صفات یعنی رب الناس (انسانوں کو پالنے والا) ملک الناس (انسانوں کا بادشاہ یا حکمراں) اور الٰہ الناس (انسانوں کا معبود) ان تین قوتوں کی نفی کرنے والے بتوں کی سرکوبی ہے۔ یعنی اللہ کی قوت کے خلاف وسوسہ ڈالنے والے۔ کے شر سے محفوظ رہنے کا قرینہ ہے۔

مختصر یہ کہ حج ایک ایسی عبادت ہے۔ جس میں اللہ مسلطیع لوگوں سے ایک بہتر انسان اور ایک بہتر معاشرے کا قیام چاہتا ہے۔ حج دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو درپیش ہر قسم کے معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کو سمجھیں اور ان کا حل اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے فرامین کی روشنی میں تلاش کریں۔ کاش مسلمانانِ عالم اس حقیقت کو محسوس کریں کہ اجتماع حج اللہ کی طرف سے مہیا کردہ ایسا زبردست پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعہ ہر ملک وقوم نہ صرف اپنے بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو درپیش مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت افغانستان، عراق، کشمیر، فلسطین وغیرہ، غیر مسلموں کی سازشوں سے نبرد آزما ہیں، حج کا اجتماع ان کے لئے بہترین معاون و مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

جس طرح آیات قرآنی میں غور وخوض کرنے سے انسان پر رموز وآگہی کے در کھلتے ہیں اسی طرح تمام عبادات کے ایک ایک رکن پر غور کرنے سے فکر وشعور کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اللہ سب کو ان رموز سے آگہی کی توفیق عطا فرمائے۔

تاریخی مغالطے

محبت رسولؐ ایمان کا بنیادی جز ہے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے کیلئے مسلمان سیرت اور آپ کی زندگی کے حالات سے مزین تاریخ کی کتابوں سے رجوع کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے ان میں سے بعض کتابوں میں آپؐ کے اجداد، پیدائش کے حالات اور اعلانِ نبوت سے پہلے حضور کی زندگی کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھی گئیں کہ اگر انہیں غیر مسلموں کے سامنے بیان کیا جائے تو شرم سے گردن جھک جائے۔

چنانچہ اس مضمون کا ذریعہ ارادہ کیا کہ آپؐ کے والدین، اجداد، رضاعت اور اعلانِ نبوت سے قبل زندگی کے بارے میں قرآن اور سیرت کی معتدل کتابوں سے اخذ کر کے کچھ لکھا جائے جس سے ہماری نوجوان نسل ایک طرف تو حقیقت سے آشنا ہوں دوسری طرف حضور اکرمؐ کی ذاتِ مبارکہ سے محبت و عقیدت میں اضافہ ہو۔

قرآن مجید کے ۲۶ ویں سورہ ''الشعراء'' آیت ۲۱۹،۲۱۸ میں ارشاد ربّ العزت ہے:

ترجمہ: وہی جو تمہیں اس وقت دیکھتا ہے جب (عبادت کیلئے) کھڑے ہوتے ہو اور سجدہ گزاروں میں نقل و حرکت کو دیکھتا ہے۔

تفسیرِ نمونہ (جسے آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی نے جید علماء کی ایک جماعت کی معاونت سے مکمل فرمایا ہے) میں مندرجہ بالا آیات کے سلسلے میں درج ہے کہ: ''مجمع البیان'' میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس

جملہ کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی:

انبیاء کے صلبوں میں رکھا۔ ایک پیغمبر سے دوسرے پیغمبر کے صلب میں، یہاں تک کے اللہ نے آپ کو آپ کے باپ کی صلب سے باہر نکالا پاکیزہ نکاح کے ساتھ اور ہر چیز کی ناپاکی اور آلائشوں سے دور رکھا۔

مولانا سید ظفر حسن امروہوی اپنی "تفسیر القرآن" میں لکھتے ہیں: **تقلبک فی الساجدین** کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اے رسول تمہارے نور کو ہم سجدہ کرنے والے مخلصین میں گردش دیتے رہے، یعنی آپ کا نور اصلابِ طاہرہ سے ارحامِ طاہرہ کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

امام ماوردی اور امام فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ بہ تحقیق حضرت نبی کریمؐ کے آباؤ اجداد حضرت آدم علیہ السلام تک سب کے سب مسلکِ توحید پر گامزن تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مشرک نہیں تھا۔ اس حقیقت کی دلیل میں موصوف مندرجہ بالا آیات پیش کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول پاک کا نور مبارک ایک سجدہ گزار کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ نور صلبِ عبداللہ تک پہنچا۔ لہٰذا یہ آیۂ کریمہ اس امر کے دلالت کرتی ہے کہ جنابِ رسالت مآب کے جملہ آباءِ کرام واجدادِ عظام دینِ حق پر قائم تھے۔

جناب عبداللہ کے حوالے سے حضور کو ابن ذبیحین (دو ذبیح کے فرزند) کہنے کے پس منظر میں واقعہ یہ ہے کہ دورانِ سرداری مکہ حضرت عبدالمطلب نے چاہِ زمزم کو جو کہ خشک ہو گیا تھا کھودنا چاہا۔ اس وقت ان کے ایک بیٹے کے علاوہ کوئی مددگار نہ تھا۔ آپ نے منت مانی کے اللہ انہیں دس بیٹے عطا کرے جو جوان ہو کر ان کے دست و بازو بنیں تو وہ ایک بیٹا اللہ کے نام پر قربان کر دیں گے۔ اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ جب آپ نے اپنے بیٹوں سے یہ بات بتائی تو ہر ایک قربانی کیلئے تیار ہو گیا۔ بالآخر قرعہ میں جناب عبداللہ

کا نام آیا۔ چونکہ جناب عبداللہ سب سے چھوٹے تھے اور عادات واخلاق کے لحاظ سے سب میں بے حد مقبول تھے چنانچہ بہنوں، بھائی ابوطالب اور دیگر مکہ والوں کی رائے کے پیش نظر جناب عبداللہ اور دس اونٹوں میں قرعہ ڈالا گیا۔ بار بار قرعہ جناب عبداللہ کا نام آنے پر اونٹوں کی تعداد سو کر دی گئی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکل آیا۔ حضرت عبدالمطلب نے نذر پوری کرنے کے لئے سو اونٹ قربان کر دیئے۔ اس کے بعد سے جناب عبداللہ ذبیح کے لقب سے موسوم ہوئے۔

جناب آمنہ بنت وہب (مادر گرامی جناب رسالت مآبؐ) کے بارے میں جناب ارتضٰی بن رضا نواز پوری اپنی کتاب "دین آباؤ اجداد رسولؐ" میں لکھتے ہیں۔

والدہ ماجدہ حضرت محمد مصطفیٰ اپنے عہد کی نہایت باعزت خاتون تھیں۔ شرافت نسب کے اعتبار سے کلاب بن مرہ پہنچ کر آپ کا اور جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کا سلسلہ ایک ہو جاتا ہے۔ آپ کا نسبی سلسلہ اس طرح ہے۔ بی بی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر۔ آپ کے والد وہب بن عبد مناف کا انتقال آپ کی شادی سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور آپ اپنے چچا وہیب بن عبد مناف کی زیرِ سرپرستی پرورش پا رہی تھیں۔ انہوں نے آپ کی شادی کی تھی۔ وہیب قریش کی شاخ بنو زہرہ کے رئیس وسردار تھے۔

اس سلسلے میں استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی کتاب "سیرت نبویؐ" کے ضمیمے میں جو کہ ان کی ایک تقریر اور پیغمبر اکرمؐ کے سوکلمات کے ترجمے پر مشتمل ہے میں یوں درج ہے:

اپنے دورِ جوانی میں حضرت عبداللہ پورے مکہ میں منفرد اور ممتاز تھے۔ انتہائی خوبصورت، انتہائی سمجھدار، انتہائی مہذب، انتہائی عقل مند کہ مکہ کی دوشیزائیں ان کی رفیقِ حیات بننے کی آرزو کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے جناب آمنہ بنت وہب سے شادی کی جوان

کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھیں۔

جناب آمنہ سے نکاح کے بعد حضرت عبداللہ نے رواج کے مطابق تین دن تک اپنے سسرال میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد آپ تجارت کی غرض سے شام چلے گئے اور واپسی پر مدینہ میں ٹھہرے تاکہ اپنے والد کے حکم کے مطابق کھجوروں کا سودا کریں کہ قیام مدینہ کے دوران آپ بیمار ہو گئے۔ آپ کی بیماری کی خبر جب مکہ میں پہنچی تو حضرت عبدالمطلب نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو حضرت عبداللہ کی خبر گیری کے لئے مدینہ روانہ کیا۔ جب حارث مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا ایک ماہ بیمار رہنے کے بعد حضرت عبداللہ انتقال فرما گئے اور وہ نابغہ کے مکان میں مدفون ہیں۔ آپ کا انتقال ۲۵ سال کی عمر میں اپنے پیغمبر بیٹے کی ولادت سے چند ماہ پہلے ہی ہو گیا۔ گویا حضور اکرمؐ شکم مادر سے ہی یتیمی کا داغ لے کر آئے تھے۔

کتابوں میں حضورؐ کے بچپن کے واقعات میں حلیمہ سعدیہ کا ذکر ملتا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے گئیں اور دو سال تک دودھ پلایا۔ اس کے بعد چھ سال کی عمر میں جناب آمنہ کے پاس واپس مکہ لائیں۔ لیکن محققین کا کہنا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے اور اس کی بہت مضبوط دلیلیں ہیں۔ کسی تاریخ میں یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو اس کی ماں کے علاوہ کسی اور نے دودھ پلایا ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے حالات میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ جس سے حضور کو حلیمہ سعدیہ یا ثوبیہ وغیرہ کے دودھ پلانے کی تائید ہوتی ہے۔ انبیاء کی پرورش کے سلسلے میں تو ایسا لگتا ہے کہ قدرت کا یہ امر شدید تھا کہ وہ اپنے نبی کو اس کی ماں کا ہی دودھ پلوائے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کو کتنے ناساز گار حالات میں ماؤں کو دودھ پلانے کیلئے ان تک پہنچایا گیا اور جب ایسا دیکھا کہ ماں کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکی تو خود جناب ابراہیمؑ کے انگوٹھے سے دودھ پیدا کر دیا۔ غرض یہ تھی کہ کسی وجہ سے ماں کا دودھ میسر نہ ہو تو کسی اور طرح سے شکم سیری کا بندوبست

ہو جائے۔ تسلیم شدہ اصول ہے کہ "دودھ سے جو گوشت پیدا ہوتا ہے وہ نسب کے گوشت پوست کی مانند ہوتا ہے اور دودھ پینے سے وہ رشتہ ناجائز ہو جاتا ہے جو نسب سے جائز ہوتا ہے۔ پھر حضورؐ کے معاملے میں تو والدہ ماجدہ موجود تھیں اور عہدِ رضاعت کے بعد تک زندہ رہیں۔

مزید براں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کے لئے ارشاد فرماتا ہے کہ: "ہم نے دودھ پلائے جانے سوال سے پہلے ہی تمام دائیوں کے دودھ کو موسیٰ کیلئے حرام کر دیا تھا" (القصص ۲۸، آیت ۱۲)۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ حضرت موسیٰؑ کو ماں کے علاوہ کسی کے بھی دودھ پینے سے بچانے کا اہتمام کرے اور ختمی مرتبت کو نظر انداز کر دے۔

آنحضرتؐ کا ایک بہت بڑا واضح ماضی یہ ہے کہ آپ اُمی تھے یعنی آپ کسی مدرسہ میں نہیں گئے تھے اور نہ کسی سے کچھ بڑھا تھا۔ قرآن مجید اس پر گواہ ہے۔ آپ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بعثت سے قبل چالیس برس تک ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود جہاں صرف بت پرستی کا ماحول تھا۔ آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ اگر آپ نے کبھی ایسا کیا ہوتا تو یقیناً لوگ آپ سے کہتے کہ کل تک تو آپ خود انہیں (بتوں کو) سجدہ کیا کرتے تھے اور اب ہمیں اس سے منع کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کے اعلانِ رسالت سے پہلے ہی آپ کو تائیدات الٰہی حاصل رہیں آپؐ نے فرمایا کہ: میں ان کے کاموں میں شریک نہیں ہوا کرتا تھا اور اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی غیبی طاقت میری تائید کر رہی ہے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ: "بچپن ہی سے خدا کہ بعض فرشتے آپ کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے"۔

حضورؐ فرماتے ہیں: "میں کبھی مجھے سلام کرنے کی آواز سنائی دیتی، کوئی مجھ سے کہتا

السلام علیک یا محمدؐ! میں ادھر ادھر دیکھتا تو مجھے کوئی نظر نہ آتا۔ کبھی میں سوچتا تھا شاید یہ پتھر یا درخت مجھے سلام کرتے ہیں۔ بعد میں سمجھ میں آیا کہ وہ فرشتہ الٰہی تھا جو مجھے سلام کیا کرتا تھا"۔

آغاز رسالت کے بالکل نزدیک کے ایام میں پیغمبر اکرمؐ کو غیر معمولی عجیب وغریب خواب دکھائی دیتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں خواب دیکھا کرتا تھا جو فجر کی مانند صبح صادق کی طرح سچے ہوا کرتے تھے۔ میں بالکل واضح خواب دیکھا کرتا تھا کیونکہ بعض خواب وحی والہام کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اپنی قوم میں تنہا تھے۔ ان کو کوئی اہم فکر لاحق نہ تھی۔ جناب خدیجہؓ سے شادی کے بعد گھریلو زندگی کی بنیاد رکھی تو آپؐ ایک دو سال کے بچے کو اس کے والد سے حاصل کر کے اپنے گھر لے آتے ہیں۔ یہ بچہ علیؑ ابن ابی طالب تھے۔ آپ کے رسالت کے مبعوث ہونے اور وحی الٰہی کی صحبت کی وجہ سے آپ کی تنہائی تقریباً دور ہونے تک یعنی اس بچے کی عمر دس بارہ سال ہونے تک آپ کا ساتھی اور ہم نشین صرف یہی بچہ تھا۔ یعنی مکہ میں اس بچے کے سوا کوئی اور نہ تھا جو آپؐ سے ہم فکری، ہم روحی اور ہم افقی کی اہلیت کا حامل ہوتا۔ خود حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا سا تھا جب حضور صحرا میں جاتے تو مجھے کاندھے پر بٹھا کر اپنے ہمراہ لے جاتے۔

ایک دولت مند اور تاجر خاندان ہونے کے باوجود آپ تجارت کے لئے نہیں جاتے ہیں بلکہ عہد تنہائی، یعنی گوشہ نشینی، خلوت، یکسوئی اور عبادت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران آپؐ پر کیا عالم طاری ہوتا ہوگا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہی وقت ہے جب اس بچے علیؑ کے سوا کوئی اور آپ کے ہمراہ اور ہم نشین نہیں۔

جب ماہ رمضان آتا تو آنحضرت کلی طور پر مکہ چھوڑ دیتے۔ حتیٰ کے حضرت خدیجہؓ سے بھی دور رہتے۔ انتہائی مختصر غذا، کچھ پانی، تھوڑی سی روٹی اپنے ساتھ لے کر کوہ حرا چلے

جاتے۔ جناب خدیجہؑ آپ کے لیے پانی اور غذا کا بندوبست فرماتیں۔ یہ پورا ماہِ مبارک آپ تنہائی میں بسر فرماتے۔ البتہ کبھی کبھی صرف حضرت علیؑ وہاں موجود ہوتے اور یہ بھی سکتا ہے کہ ہمیشہ ہی حضرت علیؑ آپ کے ساتھ ہوتے کیونکہ آپؑ نے فرمایا:

"غارِ حرا میں نزولِ وحی کے وقت میں رسولِ اکرمؐ کے ہمراہ تھا"۔

حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ سے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جب آپ پر وحی نزول ہو رہی تھی میں نے شیطان ملعون کی آہ و بکا کرنے کی آواز سنی تھی"۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا: ہاں علیؑ! بے شک سنی ہوگی کیونکہ جو میں سنتا ہوں وہ تم سنتے اور جو میں دیکھتا ہوں وہ تم دیکھتے ہو، لیکن تم پیغمبر نہیں ہو"۔

فتحِ خیبر

فتح خیبر تاریخ اسلام کا ایک سنہرا باب ہے۔ یہ جنگ سن سات ہجری میں یہودیوں سے ہوئی۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ہے، اس باب میں بے شمار احادیث نبوی موجود ہیں اور تاریخ کے اوراق بھی اس فتح مبین سے بھرے پڑے ہیں۔

سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس فتح کا ذکر کس طرح کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ہم نے کتاب ''قصص القرآن'' منتخب از تفسیر نمونہ، مولفہ حضرت آیت اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی سے رجوع کیا جہاں ہمیں یہ تفصیلات ملیں:

''جب پیغمبرؐ حدیبیہ سے واپس لوٹے تو تمام ماہ ذی الحجہ اور ہجرت کے ساتویں سال کے محرم کا کچھ حصہ مدینہ میں توقف کیا، اس کے بعد اپنے اصحاب میں سے ان ایک ہزار چار سو افراد کو جنہوں نے حدیبیہ میں شرکت کی تھی ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، جو اسلام کے برخلاف تحریکوں کا مرکز تھا، اور پیغمبر اکرم کسی مناسب کارروائی کے لیے گن گن کر دن گزار رہے تھے کہ اس مرکز فساد کو ختم کریں۔

روایات کے مطابق جس وقت پیغمبر اکرمؐ حدیبیہ سے پلٹ رہے تھے تو حکم الٰہی سے آپؐ نے حدیبیہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو فتح خیبر کی بشارت دی اور تصریح فرمائی کہ اس جنگ میں صرف وہی شرکت کریں گے اور جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت بھی انہیں کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ تخلف کرنے والوں کو ان غنائم میں سے کچھ نہ ملے گا۔

دعائے پیامبرؐ

"غطفان" کے قبیلہ نے شروع میں تو خیبر کے یہودیوں کی حمایت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد میں ڈر گئے اور اس سے رک گئے۔

پیغمبر اکرمؐ جس وقت "خیبر" کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپ نے اپنے صحابہ کو رکنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کیا اور یہ دعا پڑھی:

"اے اللہ! اے آسمانوں کے پروردگار اور جن پر انہوں نے سایہ ڈالا ہے، اور اے زمینوں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انہوں نے اٹھا رکھا ہے میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیر ہے اس کا طلب گار ہوں اور تجھ سے اس کے شر اور اس میں رہنے والوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس شر سے پناہ مانگتا ہوں۔" اس کے بعد فرمایا: "بسم اللہ آگے بڑھو۔"

اس طرح سے رات کے وقت "خیبر" کے پاس جا پہنچے اور صبح کے وقت جب اہل خیبر اس ماجرے سے باخبر ہوئے تو خود کو لشکرِ اسلام کے محاصرہ میں دیکھا۔ اس کے بعد پیغمبرؐ نے یکے بعد دیگرے ان قلعوں کو فتح کیا، یہاں تک کہ آخری قلعہ تک، جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور تھا اور مشہور یہودی کمانڈر "مرحب" اس میں رہتا تھا پہنچ گئے۔

انہی دنوں میں ایک سخت قسم کا دردِ سر جو کبھی کبھی پیغمبر اکرم کو ہوا کرتا تھا، آپ کو عارض ہوگیا۔ اس طرح سے کہ ایک دو دن آپؐ اپنے خیمہ سے باہر نہ آسکے تو اس موقع پر (مشہور اسلامی تواریخ کے مطابق) حضرت ابوبکرؓ نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر یہودیوں کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس پلٹ آئے۔ دوسری دفعہ حضرت عمرؓ نے علم اٹھایا اور مسلمان پہلے دن کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے، لیکن بغیر کسی نتیجہ کے واپس پلٹ آئے۔

فاتح خیبر حضرت علی علیہ السلام

یہ خبر رسول اکرمؐ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! کل یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور رسول .ن کو دوست رکھتے ہیں اور وہ اس قلعہ کو طاقت کے زور سے فتح کرے گا۔'' ہر طرف گردنیں اٹھنے لگیں کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟ کچھ لوگوں کا اندازہ تھا کہ پیغمبر کی مراد علی علیہ السلام ہیں لیکن حضرت علیؑ ابھی وہاں موجود نہیں تھے، کیونکہ شدید آشوب چشم انہیں لشکر میں حاضر ہونے سے مانع تھا، لیکن صبح کے وقت حضرت علیؑ اونٹ پر سوار ہو کر وارد ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ کے خیمہ کے پاس اترے۔ حالانکہ آپؑ کی آنکھیں شدت کے ساتھ درد کر رہی تھیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میرے نزدیک آؤ، آپؑ قریب گئے تو آنحضرتؐ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب حضرت علیؑ کی آنکھوں پر ملا اور اس معجزہ کی برکت سے آپؑ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے علم ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

حضرت علیؑ لشکر اسلام کو ساتھ لے کر خیبر کے سب سے بڑے قلعہ کی طرف بڑھے تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے قلعہ کے اوپر سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ اس یہودی نے پکار کر کہا: اے یہودیو! اب تمہاری شکست کا وقت آن پہنچا ہے، اس وقت اس قلعہ کا کمانڈر مرحب یہودی حضرت علی سے مقابلہ کے لیے نکلا۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ہی کاری ضرب سے زمین پر گر پڑا۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان شدید جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت علیؑ قلعہ کے دروازے کے قریب آئے اور ایک قوی اور پر قدرت حرکت کے ساتھ دروازے کو اکھاڑا اور ایک طرف پھینک دیا۔ اس زور سے قلعہ کھل گیا اور مسلمان اس میں داخل ہو گئے اور اسے فتح کر لیا۔ یہودیوں نے اطاعت قبول کر لی اور پیغمبر اکرمؐ سے درخواست کی کہ اس

اطاعت کے عوض ان کی جان بخشی کی جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا، منقول غنائم اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے اور وہاں کی زمینیں اور باغات آپؐ نے یہودیوں کو اس شرط کے ساتھ سپرد کر دیے کہ اس کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

آخر کار پیغمبر اکرمؐ نے تواریخ کی نقل کے مطابق غنائم خیبر صرف اہل حدیبیہ پر تقسیم کیے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی وجہ سے خیبر میں شریک نہ ہو سکے، ان کے لیے بھی ایک حصہ قرار دیا۔ البتہ ایسا آدمی صرف ایک تھا اور وہ تھے جناب جابر بن عبداللہؓ۔

جب یہ ذکر چھڑ گیا کہ قرآن میں خیبر کے بارے میں کیا ہے، تو آیئے حضرت ادیب اعظم الحاج مولانا ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی کی کتاب ''مجمع الآیات'' جلد اول سے استفادہ کرتے ہیں، جس میں مخصوص عنوانات کے تحت آیات قرآنی جمع کی گئی ہیں۔

سورۂ المائدہ، آیت ۵۴ میں ارشاد رب العزت ہے: ''اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایک ایسی قوم کو ان کی جگہ لے آئے گا جنہیں اللہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہوں گے ایمان داروں کے سامنے منکسر اور کافروں کے مقابل کڑے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی گنجائش والا واقف کار ہے۔'' جو صفات اللہ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہیں ان کا سچا مصداق حضرت علیؑ کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جنگ خیبر میں حضرت کے لیے رسولؐ نے جو فرمایا وہ اس دعوئی کی تصدیق ہے، جب اٹھارہ روز تک قلعہ خیبر فتح نہ ہوا تو شام کو آپؐ نے فرمایا: ''کل میں یہ علم اس مرد کو دوں گا جو پے در پے حملہ کرنے والا ہوگا، بھاگنے والا نہ ہوگا۔ اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور اللہ اور رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے اور وہ بغیر دونوں ہاتھوں پر فتح حاصل کیے واپس نہ آئے گا۔''

مولانا مذکور (حضرت مولانا ظفر حسن صاحب قبلہ) اپنی ایک اور کتاب ''سیرت علی علیہ السلام وحقائق ومعارف اسلام'' میں باب ''جنگ خیبر اور حضرت علیؑ'' میں رقم طراز ہیں:

''ارجح المطالب۔ (جب قلعہ خیبر کسی طرح فتح نہ ہوا تو) آپؐ نے حضرت علیؑ کو بلانے کے لیے بھیجا۔ ان کی دونوں آنکھیں دکھتی تھیں۔ ایک صحابی ساتھ لے کر آئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''آج میں اپنا علم ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں۔'' حضرتؐ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں کو لگایا، وہ اچھی ہو گئیں۔ آپؐ نے علم ان کو دیا۔ مرحب قلعہ سے باہر نکلا اور یہ اشعار پڑھنے لگا: ''تمام خیبر جانتا ہے میں مرحب ہوں۔ آلات حرب سے آراستہ، مجرب، بہادر۔ جب معرکہ میں شیر در آتے ہیں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو مرحب کے حملہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ میرے خوف سے کوئی قریب نہیں آتا۔ کبھی نیزہ مارتا ہوں کبھی تلوار۔ اگر تمام زمانہ مغلوب ہو جائے تو بھی میں غالب رہتا ہوں۔ میرے آگے حریف خون میں تر ہے۔''

حضرت علیؑ نے اس کے مقابل یہ رجز پڑھا:

''میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔ بہادری کے بیشہ کا درندہ شیر ہوں۔ قوی بازو اور سخت گردن والا، جیسے ڈراؤنی صورت والا جنگل کا شیر۔ میں تلوار کے بڑے پیمانہ سے تمہیں ناپوں گا۔ میں ایسی ضرب لگاؤں گا کہ تمہاری پشت کا ایک ایک مہرہ جدا ہو جائے گا۔ میں نیزہ کو سخت زمین میں گاڑتا ہوں۔ میں تلوار سے کافروں کی گردن مارتا ہوں۔ یہ بزرگ قوم کے زور میں بھرے ہوئے نوجوان کی ضرب ہے، اس کے لیے جو حق کو چھوڑتا ہے اور ذلت پر ٹھہرتا ہے۔ میں ان میں سے سات یا دس آدمیوں کو قتل کروں گا جو سب فاسق وفاجر ہیں۔''

اس کے بعد حضرتؓ نے ایسا وار کیا کہ مرحب کا سر کٹ کر گر پڑا اور اللہ نے ان کے ہاتھ سے فتح عطا کی۔ ایک روایت میں ہے:۔ حضرت علیؓ علم کو لے کر آگے بڑھے اور قلعہ کے نیچے پتھریلی زمین پر اسے گاڑ دیا۔ قلعہ کے ایک یہودی نے کہا: ''آپ کون ہیں؟'' فرمایا: ''میں علی ابن ابی طالب ہوں۔'' اس نے کہا تم بلندی پانے والے ہو، موسیٰ پر جھوٹ بات نازل نہیں ہوئی۔'' (غالباً اس نے ایسا اس لیے کہا کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب کا نام اور اس نام کی علامات توریت میں موجود ہیں)۔ جب تک قلعہ فتح نہ ہوا آپ وہاں سے واپس نہ ہوئے۔

ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب آنحضرت نے علیؓ کو علم دے کر روانہ کیا تو ہم بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جب آپ قلعہ کے پاس پہنچے تو قلعہ والے نکل کر آپ کے مقابل آئے۔ ایک یہودی نے آپؓ پر ضرب لگائی، آپؓ نے ہاتھ سے سپر پھینک دی اور قلعہ کے دروازے کو اٹھا کر سپر بنا لیا اور لڑتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کو فتح دی۔ پھر آپؓ نے اس دروازہ کو پھینک دیا۔ ہم سب آٹھ آدمی تھے۔ ہم نے دروازہ کو الٹنا چاہا، بہتیرا زور مارا مگر وہ الٹا نہ جا سکا۔ بریدہ اسلمیؓ کہتے ہیں کہ خیبر کے دن ابوبکرؓ نے علم اٹھایا مگر فتح نہ ہوئی۔ دوسرے دن حضرت عمرؓ نے علم لیا مگر قلعہ فتح نہ ہوا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: ''کل میں ایسے شخص کو یہ علم دوں گا جو بغیر فتح کیے نہ پلٹے گا۔ جب حضورؐ نماز صبح پڑھ چکے تو علم طلب کیا اور حضرت علیؓ کو بلایا۔ ان کی آنکھیں دکھتی تھیں۔ حضرت نے علم ان کے سپرد کیا۔

عبداللہ بن عمرو العاص کہتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ قلعہ قموص کے قریب گئے تو یہودی آپ پر تیر اور پتھر پھینکنے لگے۔ آپؓ نے ان پر حملہ کیا اور ان کو مارتے کاٹتے دروازہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں آپؓ کا قدم پھسل گیا۔ آپ جوش میں بھرے اٹھے اور دہلیز پر آئے اور دروازہ کو اکھاڑ کر چالیس گز کے فاصلہ پر پھینک دیا۔ عبداللہ کہتے ہیں مجھے دروازہ اکھاڑنے پر تو تعجب نہ ہوا بلکہ تعجب اس پر ہوا کہ چالیس آدمیوں نے اس کے اٹھانے میں زور آزمایا مگر اٹھا نہ سکے۔

جب جناب رسالت مآبؐ سے ذکر ہوا، آپؐ نے فرمایا "چالیس فرشتے ان کے مددگار تھے۔"

حضرت علیؑ جب علم لے کر مع لشکرِ اسلام کے بڑھے اور میدان جنگ میں آ کر سب سے پہلے یہ کام کیا کہ پتھر کی ایک سخت چٹان پر اپنا علم گاڑ دیا۔ اس کے بعد شجاعانہ انداز میں رجز پڑھ کر مبارز طلبی کی۔ پہلے حارث مقابلہ کو نکلا۔ آپؑ نے پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کیا۔ پھر عنتر بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہاتھی کی طرح چنگھاڑتا ہوا سامنے آیا۔ چند چوٹوں کے بعد وہ بھی لقمہ نہنگ اجل ہو گیا۔ اب مرحب کی باری آئی۔ مار سیاہ کی طرح بل کھاتا پھنکاریں مارتا، دوہرا خود یعنی ہیلمٹ (ایک لوہے کا ایک پتھر کا) سر پر رکھے، دوہری زرہیں پہنے، دو دو تلواریں لٹکائے، حضرت کے سامنے آیا۔ آپس میں چوٹیں چلنے لگیں۔ یہودیوں کو اس پر بڑا غرہ تھا۔ لیکن شیرِ خدا کے پنجہ سے نکل کر کہاں جاتا۔ چند ہی منٹ بعد لوگوں نے اسے خاک و خون میں تڑپتے دیکھا۔

مرحب کے قتل ہونے کے بعد یہودیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور سب نے قلعہ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ یہ دروازہ فولادی تھا اور اتنا وزنی کہ چالیس آدمی اسے کھولتے اور بند کرتے تھے۔ دروازہ کے بعد اندر کی طرف ایک چوڑا اور گہرا خندق تھا اس کا تختہ بھی اٹھا لیا۔ حضرتؑ دروازے کے پاس آئے اور دست مبارک کو اس پر مارا۔ جس اللہ نے جناب داؤدؑ کے لیے لوہے کو موم بنایا تھا اسی نے درِ خیبر کے لوہے کو ایسا نرم بنا دیا کہ حضرتؑ کی انگلیاں اس میں در آئیں اور آپ نے بقوت ربانی جھٹکا دے کر اسے اکھاڑ لیا اور سپر کی طرح ہاتھ میں لے کر خندق میں کود گئے۔ ایک ہاتھ میں تلوار، دوسرے پر درِ خیبر، یوں دونوں ہاتھوں سے فتح حاصل کر کے رسولؐ کے حکم کی تعمیل کی۔ آپؑ نے دروازہ کو خندق کے ایک کنارہ سے ملا کر مسلمانوں سے کہا "اس پر آ جاؤ" اس کے بعد اسے دوسرے کنارہ سے ملا کر کہا، "اتر جاؤ" اس طرح سارا لشکر قلعہ کے اندر اتار دیا۔ مسلمانوں نے وہاں پہنچتے ہی

قتال کا بازار گرم کیا۔ حضرت علیؑ نے دروازہ اٹھا کر پھینکا تو چالیس قدم پر جا کر گرا۔

تجمل لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے:

زور یداللّٰہی کا نمونہ دکھا دیا

حیدرؑ نے انگلیاں درِ خیبر میں گاڑ کے

امامت مطلقہ کی معرفت نہ رکھنے والے اور علیؑ کا مرتبہ نہ پہچاننے والے ضرور اسے شیعوں کی گپ کہیں گے کیونکہ وہ روحانی طاقت اور ربانی طاقت کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔ حضرت علیؑ نے خود فرمایا: "میں نے باب خیبر کو ربانی قوت سے اکھاڑا، نہ کہ جسمانی قوت سے۔" دیکھنے والے علیؑ کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں، خدائی زور کو نہیں۔ بجلی کا تار کتنا کمزور ہوتا ہے لیکن بڑے بڑے انجنوں کو کرین کے ذریعہ اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ یہ اس تار کی قوت نہیں بلکہ اس پاور ہاؤس کی ہے جس سے اس تار کا کنکشن ہے۔ ہجرت کے بعد یوں تو جناب امیرؑ نے تمام ہی غزوات میں اپنی بے نظیر شجاعت کے جوہر دکھائے لیکن بدر و احد و خندق و خیبر، اس انداز سے لڑے کہ کفار و مشرکین کا تمام زور علیؑ کی بدولت خاک میں مل گیا۔

مآخذ

(۱) "قصص القرآن" منتخب از تفسیر نمونہ، مولفہ حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

(۲) "مجمع الآیات" جلد اول۔

(۳) "سیرت علی علیہ السلام وحقائق ومعارف اسلام"

(۲) اور (۳) دونوں کتب مولفہ حضرت ادیب اعظم الحاج مولانا ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی۔

جناب یوسفؑ کی دُعائیں

قرآن مجید فرقان حمید متقین کے لیے ہدایت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کا ایک ایک حرف معنی و رموز کا خزانہ ہے۔ سورۂ یوسفؑ کی ابتدائی تین آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''الف، لام، را۔ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں، ہم نے عربی زبان میں قرآن نازل کیا تاکہ تم سمجھو۔ اے رسول ہم قرآن نازل کر کے ایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں، اگرچہ اس سے پہلے تمہیں معلوم نہ تھا۔''

اس تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کا پورا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ ایک دلگداز اور حسین قصہ ہے۔ ظاہر ہے اللہ جس قصہ کو ''احسن القصص'' کہے اس زیادہ احسن قصہ اور کون سا ہوگا۔ حضرت یوسفؑ کے قصے کو سب سے حسین قصہ اس لیے بھی کہا گیا ہے کہ یہ قصہ ہر انسان سے مناسبت رکھتا ہے۔ ہر شخص جوانی میں حسین ہوتا ہے اور حسن کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ اس وقت تزکیۂ نفس کے لیے حضرت یوسفؑ کی مثال بہت عمدہ ہے۔ اسی طرح حسد کا ہر شخص نشانہ بنتا ہے، مصیبتوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اسے رجوع اِلی اللہ کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے تمام حالات میں حضرت یوسفؑ کا قصہ رہنمائی کرتا ہے۔

یہاں پورا قصہ بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ سورۂ یوسفؑ کی کچھ آیتوں میں آپؑ کی دعائیں مذکور ہیں۔ ہم صرف ان آیات کو منتخب کر کے اس کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ یوسفؑ آیت ۳۳:

جناب یوسفؑ نے کہا: ''اے میرے پالنے والے مالک! قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے

اس کام سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں۔ اور اگر تو نے مجھ سے ان کی چالاکی کو دور نہ کیا تو میں ان کی طرف ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔"

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ جناب یوسف فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں تیرے فرمان کا احترام کرتے ہوئے اور اپنی پاک دامنی کی حفاظت کرتے ہوئے اس وحشت ناک قید خانے کا استقبال کرتا ہوں۔ وہ قید خانہ کہ جس میں میری روح آزاد ہے اور میرا دامن پاک ہے اس کے بدلے میں اس ظاہری آزادی کو ٹھوکر مارتا ہوں کہ جس میں میری روح کو زندان ہوس نے قید کر رکھا ہو اور جو میرے دامن کو آلودہ کر سکتی۔ یا اللہ! میری مدد فرما، مجھے قوت بخش اور میری عقل ایمان اور تقویٰ کی طاقت میں اضافہ فرما، تا کہ میں ان شیطانی وسوسوں پر کامیابی حاصل کروں۔

نیز یہ کہ اس آیت کے آئینے میں حضرت یوسف کے کردار کی پختگی کو ملاحظہ فرمائیں، جس سے نبوت کی عظمت سمجھ میں آتی ہے کہ ایک نوجوان اپنی بھرپور جوانی کے ساتھ موجود ہے اور دوسری طرف حسین ترین عورتیں اس کو پھنسانے کے لیے جال پر جال پھینک رہی ہیں۔ جدھر دیکھتا ہے گناہ اپنی ساری خوش نمائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ دروازے کھولے اس کے منتظر ہیں۔ حسن خود دعوتِ گناہ دے رہا ہے۔ رات دن چوبیس گھنٹے وہ اس خطرے میں بسر کر رہا ہے، اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے ارادے میں ذرا سی بھی کمزوری پیدا ہو جائے تو گناہ کے بے شمار دروازے اس پر کھل جائیں۔ امیر، حسین اور جوان عورتیں اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں مگر اس کے قدم ذرا نہیں پھسلتے۔ پھر اس پر بھی اس میں کوئی غرور یا تکبر کا شائبہ نہیں پیدا ہوتا، اس قدر مستحکم کردار کے ہوتے ہوئے بھی وہ بشری کمزوریوں کا خیال کر کے کانپ اٹھتا ہے۔ اور نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ سے توفیقات کا سوال کرتا ہے کہ میں ایک کمزور انسان ہوں، مجھ میں

اتنی طاقت نہیں کہ میں خود اپنے بل بوتے پر ان بے پناہ گناہوں کی دعوتوں کا مقابلہ کر سکوں۔ اے اللہ! تو مجھے سہارا دے، مجھے گناہوں سے بچائے رکھ، کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں۔ غرض حضرت یوسفؑ جس نازک ترین دور سے گذرے اس میں گذرنے کی وجہ سے ان کی غیر معمولی صفات جواب تک دبی ہوئی تھیں، وہ سب ابھر آئیں اور پورے زور کے ساتھ کام کرنے لگیں۔۔۔(تفہیم القرآن)۔

حضرت یوسفؑ کے امتحان کے مقاصد:

اللہ کا مقصد بھی یہی تھا کہ (۱) حضرت یوسفؑ کو خود اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہو جائے۔ (۲) ان کی صلاحیتیں بیدار ہوں۔ (۳) عالمِ انسانیت کے سامنے ایک پاک نمونۂ زندگی پیش کیا جاسکے۔ (۴) اللہ کی معرفت، شکر اور خوفِ الٰہی کے عملی معنی معلوم ہوسکیں۔ (۵) نبوت کی عظمت کا احساس اجاگر ہوجائے۔ (۶) امتحانات اور نازک حالات سے گزرنے کا طریقہ، مقصد اور فلسفہ دنیا کو معلوم ہوجائے۔ (ڈاکٹر محمد حسن رضوی)۔

مصیبت کو گناہ پر ترجیح دینا اور صدیقین کے صفات:

۱۔ خوب خیال رہے کہ حضرت یوسفؑ جیل خانے کی دعا میں صرف یہ عرض کررہے ہیں کہ: ''زنا کاری یا گناہ کرنا مجھے جیل کی سختیوں سے بھی زیادہ ناگوار ہے۔'' اس جملے پر عرفا نے لکھا کہ مصیبت کو گناہ پر ترجیح دینا یا اختیار کرنا صدیقین کا شیوہ ہوتا ہے۔

۲۔ نیز حضرت یوسفؑ کا اللہ سے دعا کرنا بتاتا ہے کہ صدیقین اپنے تقویٰ پر بھروسہ نہیں کرتے، وہ اللہ سے مدد مانگتے ہیں کہ اللہ کی توفیقات ہمارے شاملِ حال ہوں تو وہ خود کو گناہ سے بچالیں گے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ گناہ کے اسباب اور ذرائع سے بھی بھاگتے رہنا سعادت مندوں کی نشانی ہے۔ (ماجدی)

اعتراض اور اس کا جواب:

مرشد تھانوی نے لکھا کہ: حضرت یوسف کی یہ دعا کسی طرح بھی ان کی عصمت کے منافی نہیں، اس لیے کہ انبیا کی عصمت اللہ کی حفاظت ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انبیاء کرام کی نظر ہمیشہ اصل موثر پر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کبھی اپنی عصمت پر اعتماد، ناز یا فخر نہیں فرمایا کرتے۔

عزت جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہو صدا دیتا ہے

میر انیسؔ

ا۔ آخر میں حضرت یوسف کا فرمانا: ''اگر تو نے مجھ سے ان (عورتوں) کی چالاکی کو دور نہ کیا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو جاؤں گا۔''

اس آخری فقرے نے بتا دیا کہ تقویٰ اور اللہ کی اطاعت کی ضد کو جاہلیت کہتے ہیں۔

۲۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جاہلیت کا تعلق سراسر کردار سے ہے۔ کتابوں کے رٹ لینے سے تو عالم نہیں بنتا۔

۳۔ اللہ کی توفیق کے بغیر تقویٰ یا اطاعت ممکن نہیں۔ (ماجدی)

عارفوں نے نتیجہ نکالا:

ا۔ اپنے نفس کو خاطی اور عاجز جاننا۔ (۲) اور ہر خیر کی توفیق کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اور اللہ کی عطا سمجھنا۔ (۳) ہر برائی کو اپنی جانب منسوب کرتے رہنا، صدیقین، مخلصین اور متقین کی روش ہوتی ہے۔ محققین نے لکھا کہ حضرت یوسف کا کردار مقامِ صدیقیت ہے۔ یعنی کردار کی سچائی۔ ایک حسین امیر زادی دعوتِ گناہ دے رہی ہے مگر جناب یوسف پر خوف

خدا غالب ہے، وہ بھی اس قدر کہ حضرت یوسفؑ جیل جانے کو تیار ہیں، مگر حسین آغوش میں جانے کو تیار نہیں۔ (سبحان اللہ)۔ (ابن کثیر)۔

سورۂ یوسف، آیت ۱۰۱:

"(یوسف نے عرض کی) پروردگارا! تو نے مجھے حکومت کا (عظیم) حصہ بخشا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا ہے۔ تو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تو دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ مجھے دنیا سے (حقیقی) مسلمان (یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والا) اٹھانا اور مجھے (آخرت میں) نیک کام کرنے والے صالحین کے ساتھ ملا دینا۔"

حضرت یوسفؑ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ جملے احساسِ شکرگزاری کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ صحرا میں رہنے والا ایک بچہ جس کو اس کے بھائی قتل کرنا چاہتے ہوں، ترقی کرتے کرتے مصر جیسے عظیم مہذب ملک کا مالک بن جائے اور پھر اس کے قاتل بھائی اسی کے سامنے (قحط کے زمانے میں) غلہ حاصل کرنے کی درخواست پیش کریں تو ایسے موقع پر دنیا پرست لوگ فخر جتانے اور انتقام لینے کی فکر کرتے ہیں۔ طعن و تشنیع کے تیر چلاتے ہیں، مگر ایک سچا خدا پرست شریف انسان دوسرے طرزِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ فخر، کبر اور طعن کرنے کے بجائے اللہ کا شکر بجا لاتا ہے اور اللہ کے احسانات کو یاد کرکے اپنے قاتلوں اور اپنے اوپر ظلم کرنے والوں پر احسان کرتا ہے۔ ان سے کسی قسم کا کوئی انتقام نہیں لیتا بلکہ ذرا سی شرمندگی کے اظہار پر پوری طرح معاف کر دیتا ہے۔ ان سے شکایت تک نہیں کرتا۔ یہ تک نہیں کہتا کہ تم نے مجھ پر ظلم کیا تھا۔ اس وقت وہ یہ کہتا ہے کہ "شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان دشمنی ڈال دی تھی۔" یعنی برائی کے برے پہلو کو نظر انداز کر کے اچھے پہلو کو پیش کرتا ہے کہ اللہ نے مجھے بلند مرتبے پر پہنچانے کے لیے یہ تدبیر فرمائی کہ مجھے امتحانات اور مشکلات سے گذرنا پڑا۔ پھر وہ اللہ کے آگے جھک جاتا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا

ہے اور کہتا ہے کہ "مالک! یہ سب تیری عطا ہے کہ تو نے مجھے اعلیٰ صلاحیتیں بخشیں، میری ترقی کے راستے ہموار کیے، مجھے قید خانے سے نکالا، مجھے بادشاہ بنایا۔ اب میں جب تک زندہ رہوں گا تیری غلامی پر ثابت قدم رہوں گا، اور جب میں دنیا سے جانے لگوں تو مالک! مجھے اپنے نیک بندوں سے ملا دینا۔ (ماجدی)۔

نکات:

۱۔ حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ "اے میرے اللہ، تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا کچھ علم بھی دیا۔" "من تبعیضیہ ہونے سے یہ نتیجہ نکلا کہ بڑے سے بڑے انسان کا علم بہر حال محدود ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر)۔

۲۔ حضرت یوسفؑ کی دعا کی روح یہ ہے کہ "اے اللہ! جس طرح تو نے میری دنیا کے سارے کام بنا دیے اسی طرح میری آخرت کے بھی سارے کام بنا دے اور اس طرح مجھے اپنی قدرت، رحمت اور کرامت کی جلوہ سازیاں دکھا دے اور اس کی معراج (Climax) اس طرح ہو کہ "جب میری موت آئے تو دینِ اسلام پر آئے۔"
(تفسیر کبیر بقول حضرت ابن عباسؓ)

نتائج:

۱۔ انسان کو دنیا کی کامیابیوں کے ملنے پر آخرت کی سرفرازیوں کے لیے دعا کرنی چاہیے۔

۲۔ حضرت یوسفؑ کی اس دعا سے کہ "مجھے فرمانبرداری کے عالم میں موت دے۔" "یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ انبیاء کرام باوجود عصمت وطہارت کے، خوفِ خدا بھی رکھتے ہیں۔ اور اپنی کمالِ معرفت کی وجہ سے اللہ سے ملاقات کا شوق بھی رکھتے ہیں۔" (تھانوی)۔

(انبیاء کرام کو اپنے عمل میں نقص کا خوف اپنی انکساری کی وجہ سے لاحق رہتا ہے)۔
(ڈاکٹر محمد حسن رضوی)۔

۳۔ امام رازیؒ نے لکھا کہ جب انسان دنیا کی زندگی کو اچھی طرح سمجھ اور برت لیتا ہے تو پھر دنیا کی لذتیں لاحاصل دکھائی دینے لگتی ہیں۔ پھر اس کی دعائیں اور آرزوئیں حضرت یوسفؑ کی یہی دعا بن جاتی ہیں۔ اور یہی کمال انسانی کی ایک انتہا ہے۔ (تفسیر کبیر)۔

۴۔ حضرت یوسفؑ کا یہ دعا فرمانا کہ "مجھے صالحین سے ملا دے" تو صالحین کا مفہوم اضافی ہے۔ اس کا معیار ہر ایک کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ جس مرتبۂ صالحین کی تمنا کر رہے ہیں وہ حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت ابراہیمؑ (اور حضرات محمدؐ و آل محمدؐ) کے مرتبے کے صالحین ہیں۔ (ماجدی)۔

۵۔ حضرت یوسفؑ کا فرمانا کہ "مجھے فرماں برداری کی موت دے۔" (تَوَفَّنِي مُسْلِمًا) یعنی حضرت یوسفؑ نے اسلام پر خاتمے کی دعا مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ نعمت کی تکمیل اچھے خاتمے پر ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ حضرت یوسفؑ نے موت کی تمنا کی اور اللہ کی اطاعت کے عالم میں موت کی درخواست کی اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ حضرت یوسفؑ نے موت کی تمنا کی۔ اور اللہ کی اطاعت کے عالم میں موت کی درخواست کی۔ (روح البیان)۔

اسی لیے حضور اکرمؐ نے فرمایا: "موت مومن کے لیے تحفہ ہے، اس لیے کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ کیونکہ مومن دنیا میں دکھ درد میں مبتلا رہتا ہے۔ خاص کر شیطان کے بہکانے کی وجہ سے اور موت کے ذریعہ سے وہ تمام تکالیف سے نجات پا کر دائمی راحت کو پا لیتا ہے۔ (روح البیان)۔

۶۔ حضرت یوسفؑ کی یہ دعا کہ "تَوَفَّنِي مُسْلِمًا" (مجھے اسلام پر موت دینا) اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ: "کسی نبی نے جلدی مرنے کی دعا نہیں کی سوائے حضرت یوسفؑ کے۔ کیونکہ اللہ نے جب سارے خاندان کو ملا دیا اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں اور دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہو چکے تو خیال آیا کہ یہ سب کچھ فانی ہے۔

اس لیے اللہ سے دائمی نعمتوں کے ملنے کی دعا کی۔موت کی تمنا ظاہر کی، اور فرمایا: ''اے اللہ! مجھے اسلام پر تابع داروں والی موت عطا فرما۔ پھر مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔یعنی جنت کے رہنے والے انبیا اور صالحین کی صحبتیں عطا فرما۔'' (تفسیر مجمع البیان)۔

مسائل سلوک:

ا۔حضرت یوسفؑ کی اس دعا سے معلوم ہوا کہ اللہ کی اطاعت کی حالت میں مرنا بڑی عظمت رکھتا ہے۔

۲۔باوجود عصمت و نبوت کے حضرت یوسفؑ یہ دعا فرما رہے ہیں تو ہم گنہگاروں کو کس قدر اس دعا پر اصرار کرنا چاہیے۔

۳۔اللہ سے ملاقات کے لیے موت کی تمنا کرنا اللہ کی محبت کے غلبے کا اثر ہے۔(تھانوی)۔

سوال:

سوال یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے صالحین کے ساتھ شامل ہونے کی دعا کیوں فرمائی جب کہ وہ نبی تھے؟، جواب یہ ہے کہ (۱) صالحیت ایک ایسے بڑے مرتبے کا نام ہے جو تمام مراتب کا جامع ہے۔ کیونکہ لفظ ''صالح'' شہید، صدیق، نبی، امام سب پر بولا جاتا ہے۔ (۲) حضرات انبیاء کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ (۳) تاکہ امت کو دعا مانگنے کا سلیقہ آجائے۔(روح البیان)۔

تفسیر صوفیانہ:

صوفیاء حضرات نے فرمایا کہ: (تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا) اشارہ ہے فنا فی اللہ کی طرف اور ''اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ '' سے مراد مجھے ''بقاء باللہ'' عطا فرما۔ کیونکہ تیری بقاء ازلی ہے۔(روح البیان)۔

سورۂ یوسف کی مذکورہ آیات میں آپؑ کی دعائیں ہیں، جن کا ترجمہ اور تفسیر پیش کی

گئی۔ اس سورہ (آیت ۱۰ کی تفسیر) میں آپؑ کی ایک اور بھی دعا ہے جو قرآنی متن میں نہیں بلکہ حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ مناسب ہوگا اگر ہم اس دعا کا بھی اس مضمون میں ذکر کردیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: ''جب حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں ڈالا تو جبرئیلؑ نے آکر حضرت یوسفؑ سے پوچھا: ''آپ کو کس نے یہاں پھینکا ہے؟ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا: ''باپ کی محبت اور بھائیوں کے حسد نے۔'' حضرت جبرئیلؑ نے پوچھا: ''کیا تم کنویں سے نکلنا چاہتے ہو۔'' حضرت یوسفؑ نے فرمایا: ''یہ بات حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسحاقؑ و حضرت یعقوبؑ کے پالنے والے مالک کی مرضی کے تابع ہے۔'' اس پر حضرت جبرائیلؑ نے فرمایا: ''حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسحاقؑ و حضرت یعقوبؑ کے پالنے والے نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''تم مجھے دعا کے ذریعہ سے پکارو۔'' (تفسیر مجمع البیان)۔

کنویں کے اندر حضرت یوسفؑ کی دعا:

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کیونکہ ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے، کوئی معبود نہیں تیرے سوا، تو ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، اے بزرگی واکرام کے مالک! حضرت محمدؐ و آل محمدؐ پر خاص الخاص رحمتیں نازل فرماتا رہ۔ اور میرے لیے تنگی سے کشادگی اور خوشی اور رہائی عطا فرما، اور مجھے وہاں سے روزی دے جہاں سے توقع ہو، اور وہاں سے بھی روزی دے جہاں سے مجھے کوئی توقع ہی نہیں۔'' (تفسیر انوار النجف)۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب نے فرمایا کہ ''پس حضرت یوسفؑ کی دعا قبول ہوئی۔ انہیں کنویں کی تنگی اور قید سے فوراً نجات ملی۔ اسی دعا کی وجہ سے وہ زلیخا کی مکاری سے بچے، اور اسی دعا کی بدولت اللہ نے انہیں مصر کی بادشاہی عطا

فرمائی جس کی ان کوتوقع ہی نہ تھی۔"

حضرت یوسفؑ کنویں میں یہ دعا بھی مانگا کرتے تھے: "اے ابراہیمؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ کے پالنے والے مالک! میری کمزوری، بے چارگی اور کم سنی پر رحم فرما۔" (تفسیر برہان۔ تفسیر انوار النجف)

محققین نے لکھا کہ اللہ نے بچپنے ہی میں حضرت یوسفؑ کی طرف وحی کی جس طرح حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف وحی فرمائی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت اللہ کی عطا ہوتی ہے کیونکہ بچپنے میں کسب کا سوال پیدا نہیں ہوتا، آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ (تفسیر صافی)۔

مآخذ

(۱) خلاصۃ التفاسیر، قرآن مبین مترجم۔ ڈاکٹر محمد حسن رضوی۔

(۲) انوار القرآن۔ علامہ ذیشان حیدر جوادی۔

(۳) قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ مولفہ حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی۔

(۴) تفسیر القرآن۔ ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن امروہوی۔

ہمارے علمائے کرام

مورخِ اسلام پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاریؒ

مکتبِ امامیہ کا یہ اعزاز ہے کہ اس سے وابستہ افراد میں علم کے حصول کی بڑی خواہش پائی جاتی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ یہ شہرِ علم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے باب، امام المتقین حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام سے ایک والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ چہاردہ معصومین علیہم السلام نے اپنی زندگیاں علوم قرآنی و سیرت نبوی کو پھیلانے میں صرف کیں۔ اس میں انہیں شاہانِ وقت سے ٹکرانا پڑا اور اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا۔ چودھویں معصوم (بارھویں امام) حضرت مہدی عجل اللہ فرجہٗ کے غیبت میں جانے کے پیشِ نظر ہمارے گیارھویں امام حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے امت مسلمہ کا عملی وظیفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اور فقہا میں سے جو اپنے نفس کو بچانے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، اپنی ہوا و ہوس کی مخالفت کرنے والا اور اپنے رب کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام کے لیے اس کی تقلید جائز ہے۔'' (وسائل، باب ۱۰، حدیث ۲۰۔۳۳۳۸۵) یہیں سے نظام اجتہاد و فقہ کی بنیاد استوار ہوئی اور عام افراد امت کے لیے جہالت کی تاریکیوں میں اپنی قوت عمل کو برباد کرنے کی بجائے ''علمائے دین'' یا ''فقہائے مجتہدین'' کی تقلید کا سلسلہ شروع ہوا۔

ماہ نامہ ''خواجگان'' لاہور کے اکتوبر ۲۰۱۶ء (سیدالشہداء نمبر) میں مترجم و مفسر قرآن

مجید، حافظ سید فرمان علی اعلی اللہ مقامہٗ کی داستان حیات پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ ہمارے بہت سے علماء کے شہ پارے تو ہماری نظر سے گزرتے ہیں لیکن ان کی نجی زندگی کے بارے میں ہمیں کم کم معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ارادہ کیا کہ اپنے علماء حق کے بارے میں جتنی معلومات ہمیں کتابوں میں ملتی ہیں ان کو لکھ کر عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ ان علماء کی زندگی اور ان کی کاوشوں سے آگاہ ہوکر ہمارے اندر حصول علم اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش بیدار ہوگی۔

ایسے ہی ایک عالم دین جناب پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری اعلی اللہ مقامہٗ کی ذات بابرکات ہے۔ جنہوں نے علم نہ صرف حاصل کیا بلکہ اسے عوام الناس تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ کی دو کتابیں میرے پیش نظر ہیں۔ پہلی "کربلا کی کہانی، قرآن کی زبانی" اور دوسری "معارج العرفان، عصمۃ الصغریٰ ابی طالب عمران"۔ پہلی کتاب میں ان کی دختر نیک اختر محترمہ خلیلہ زینب صاحبہ نے ان کے حالات زندگی بیان فرمائے ہیں۔

نام، کنیت، تخلص:

آپ کا نام محمد لطیف کنیت ابوالفضل، تخلص پہلے "محزونؔ" پھر نسبتِ پدری سے تبدیل کر کے ابن عقیل اختیار کیا۔ ان کا سلسلۂ تلمذ ناخدائے سخن میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ پر ختم ہوتا ہے۔

ولادت و مولد:

محلہ شاہ ولایت، اونچا ٹیلہ سہارن پور میں بارہ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ میں ولادت ہوئی۔ ان کی والدۂ ماجدہ کہا کرتی تھیں کہ بیٹا تم ۱۲ محرم کو پیدا ہوئے، مشیت الٰہیہ نے تمہارے لیے بارہ مہینے ہی محرم کردیا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو، بارہ مہینے مجالسِ عزا پڑھ کر مثاب ہوتے ہو۔

خاندانی کوائف:

ان کا سلسلہ نسب انصار کے قبیلہ خزرج سے ملتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ حضرت ابوایوب

انصاریؓ ہیں، جن کا نام خالد تھا۔ سرکار رسالت ختم رسل محمد مصطفیٰ ارواحنالہ الفداء نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی اور اشعہ نورانیہ سے ختم رسالت نے مدینہ طیبہ کو مدینہ منورہ بنایا، تو یہی ابوایوب انصاریؓ تھے جن کے گھر میں نزول اجلال فرمایا اور انہیں شرف میزبانی بخشا۔ یہ سعادت مشیت ربانیہ نے ہی عطا کی تھی ورنہ ہر انصاری یہ چاہتا تھا کہ حضور سرور کائناتؐ میرے گھر قیام کی سعادت عطا فرمائیں۔ مگر جناب رسالت مآبؐ نے جو وما تشاؤن الا ان یشآء اللہ کے مصداق تھے، اس امر کو مشیت الٰہیہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ اللہ نے اس طرح چاہا کہ ناقہ رسالتؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے جا ٹھہرے۔ حضورؐ کے قدوم مبارک نے کاشانۂ ایوبؓ کو مطلع الانوار کر دیا۔ ان قدموں کا جب مقام شب معراج عرش کو نصیب ہوا تو وہ عرش معلیٰ ہو گیا اور جب سرزمین کعبہ پر قدم رکھے تو شہر مکہ محرمہ محل قسم الٰہی ہو گیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا: لا اقسم بھٰذا البلد و انت حل بھٰذ البلد و والد و ما ولد اے حبیب میں اس لیے اس شہر کی قسم کھاتا ہوں کہ اس شہر کی زمین تیرے قدموں کو مس کر رہی ہے اور اس شہر کا دوسرا شرف مولود کعبہ کے والد ابو طالب اور مولود کعبہ علی مرتضیٰ ہیں۔ اب یہ شرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کو حاصل ہوا تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد و احفاد قیامت تک یہ شعر گنگناتے رہیں گے:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مشاہیر آباء کرام واجداد عظام:

آپ کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری پیر ہرات شاعر مشہور فارسی ہیں۔ ان کی رباعیات بلاغت و فصاحت میں معراج کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔ علوم مختلفہ میں تصنیف و تالیف میں حصہ لیا۔ علم بیان، علیم بدیع، علم معانی، علم عروض میں کتابیں لکھیں۔ علم

فقہ پر انہیں کافی عبور تھا۔ چنانچہ ہرات کے قاضی القضاۃ تھے۔ ان کا بلند ترین مقبرہ شہر ہرات میں ہے۔ ان کے جوار رحمت میں افغانستان کا شاہی قبرستان ہے اور امیر دوست محمد کی ابدی خواب گاہ بھی وہیں ہے۔

ان کے علاوہ آپ کے مشاہیر آباء کرام میں خواجہ عبدالوہاب واعظ ہرات، خواجہ ملک فرید انصاری، کمانڈر انچیف، افواج محمود غزنوی، خواجہ نصیر الملک المخاطب ملک اشجع گورنر ملتان و گجرات (عہد محمود غزنوی)، خواجہ سالار انصاری، بزرگ چشتیہ وجد انصاریاں سہارن پور، داماد مولانا محمد اسحاق الملقب شاہ ولایت (ان کی بیٹی کا نام بی بی رزق اللہ تھا)، خواجہ خدا بخش فارسی شاعر تلمیذ مصحفی کے علاوہ آپ کے والد خواجہ محمد عقیل تھے جو محکمہ مال کے مختلف مناصب پر مامور رہے۔ تحصیل دار بھی رہے اور مال افسر بھی۔

خواجہ محمد لطیف انصاری کے والد خواجہ محمد عقیل اہل سنت والجماعت تھے اور دیوبندی مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے شجرہ میں خواجہ طیب حسن کے بعد تین چار پشتوں میں مذہب اہل سنت والجماعت رہا۔ دیوبند مکتب خیال کا مشہور مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اسی خاندان کی ایجاد ہے۔ مشہور مدرسہ دیوبند کے بنانے میں اس خاندان نے بہت امداد کی۔

کایا پلٹ گئی:

سن ۱۳۰۶ھ میں خواجہ محمد لطیف انصاری کی والدہ نے ایک رویائے صادقہ میں زیارت آبروئے وفا حضرت ابوالفضل العباس ارواحنا لہ الفدا کا شرف حاصل کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ایک سال تھی۔ سرکار علم دار نے انہیں اور والدہ کو خواب میں مجلس عزا کے بعد عورتوں اور مردوں میں دودھ تقسیم کرنے کے لیے دیا۔ آپ نے ایک سال کی عمر میں مردوں میں دودھ تقسیم کیا اور والدہ نے عورتوں میں دودھ تقسیم کیا۔ آپ کے اساتذہ کرام اس کی تعبیر یہ بتاتے تھے کہ دونوں ماں بیٹا تبلیغ مذہب شیعہ اثنا عشریہ کریں گے۔ چنانچہ اس خواب کی

تعبیر نے حقیقت کا پہلو اختیار کیا۔ باپ نے ماں کے شیعہ ہو جانے پر سختی اور شدائد اختیار کیے اور ماں کو ایک سال دودھ پلانے کے بعد دودھ پلانے سے محروم کر دیا۔ والد کی تین بیویاں تھیں۔ بڑی بیوی امتہ البتول خواجہ سعادت مند انصاری کی دختر ارجمند تھیں، جو فاضل جلیل تھے۔ امتہ البتول نے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور حقیقی ماں سے بڑھ کر پالا۔ اللہ کی شان کہ والد اپنی وفات سے آٹھ دن پہلے مذہب شیعہ اختیار کر چکے تھے۔

خواجہ لطیف صاحب کے بڑے بھائی پہلی عالمی جنگ میں فوج میں بھرتی ہو کر عراق چلے گئے۔ وہاں میجر خان غلام سرور قزلباش اور آقائے ریاض حسین فرزند حجتہ الاسلام آقا محمد تقی شیرازی کی صحبت میں، جن کا ان سے تعارف خواجہ لطیف صاحب نے کرایا تھا شیعہ ہو گئے۔ وہ مجسٹریٹ کے عہدے سے فارغ ہو کر کاظمین (عراق) میں آباد ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ایک عرب خاندان میں شادی کی اور ان کی اولاد وہیں رہی۔ ان کی ہندوستانی بیوی سے اولاد سہارن پور ہندوستان میں آباد ہے۔

خواجہ محمد لطیف انصاری نے شرف نسبی کو کبھی اولیت کا مقام نہیں دیا۔ وہ اسے ایک ثانوی شرف سمجھتے تھے۔ آٹھویں امام حضرت علی رضاؑ کے دو اشعار ان کا نصب العین رہے، جن کا ترجمہ یہ ہے: "بیٹا! جس کا جی چاہے ہو جا مگر ادب حاصل کر۔ ادب کا حاصل کرنا تجھے نسب کے فخر و مباہات سے مستغنی کر دے گا۔ جواں مرد تو وہی ہے جو یہ کہے کہ میں یہ ہوں، وہ جواں مرد نہیں جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا۔" (مختصر یہ کہ 'پدرم سلطان بود' کوئی وجہ افتخار نہیں)۔

تعلیم وتربیت:

ماں نے آپ کی تعلیم و تربیت کا ایک احسن طریقہ اختیار کیا۔ سرکاری مدارس کی دنیاوی تعلیم کے پہلو بہ پہلو دین و دیانت کی تعلیم کا آغاز فرمایا۔ سب سے پہلے تعلیم قرآن شروع کی۔ حافظ مولا بخش عرف نولکھا آپ کے پہلے استاد تھے، جو تقیہ کی حالت میں تھے۔

میر انیسؔ کے بیسیوں مرثیے انہیں یاد تھے۔ چونکہ اس زمانے میں اہلِ سنت میں موجودہ عصبیت موجود نہیں تھی اور امام حسین علیہ السلام سے انہیں عقیدت تھی، اس لیے حافظ صاحب کو مجالس عزا پڑھنے سے نہیں روکتے تھے۔ ماں نے انہیں اردو کی تعلیم خود دی۔ جب وہ دوسری جماعت میں تھے تو اسی دوران میر انیسؔ کی رباعیات اور سلام انہیں پڑھا کر بچپن میں ہی تحت اللفظ مرثیہ خوانی شروع کرادی تھی۔ اس طرح ذکرِ حسینؑ مرثیہ خوانی سے شروع ہوا جو آخر خطابت تک پہنچا۔ ان کی ابتدائی دینی تعلیم خاندانِ ارسطو جاہی میں شروع ہوئی جس کا مختصر ذکر خاندان ارسطو جاہی کے چشم و چراغ، ادیب مشرقیات نبیرہ سرکار شریف العلماء سید آغا حسین شاعر پہلوی نے اپنے دیوان پہلوی کو ہساراں میں کیا ہے۔ سید آغا حسین خاندان ارسطو جاہی کے دوسرے فرد ہیں جن کا کلام ایران میں مقبول ہوا۔ پہلے فرد مولانا فرزند علی فرخ تھے جن کا دیوان ایران یونی ورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں داخل رہا ہے۔

اساتذہ کرام:

اس باب میں خواجہ لطیف صاحب بڑے خوش نصیب تھے کہ اس دور کے جید علماء سے انہیں کسبِ فیض کا موقع ملا۔ مختصراً چند نام پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ سرکار شریف العلماء مولانا سید شریف حسین خاں ابن سرکار ارسطو جاہ۔

۲۔ قدوۃ العلماء مولانا سید مرتضیٰ حسین نقوی البھاکری۔

۳۔ ادیب اعظم، خطیب اکرم مولانا سید مقرب علی المتخلص زائرؔ۔

۴۔ استاد العلماء مولانا سید محمد باقر النقوی۔

۵۔ صدر المتکلمین مولانا سید باقر علی بخاری بٹالوی۔

۶۔ ادیب یگانہ مولانا سید محبوب علی شاہ نقوی، خوشاب ضلع سرگودھا۔

۷۔ استاذ معقولات مولانا حشمت علی صاحب جگرانوی۔

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر سید تنظیم الدین احمد، لیپزگ یونیورسٹی، جرمنی۔

۹۔ فاضل جلیل مولانا شیخ مومن علی، منارووالی، پروفیسر ادبیات عربی، اورینٹل کالج، لاہور۔

۱۰۔ زبدۃ العلماء مولانا سید صادق صاحب لکھنوی، برادر نسبتی سرکار محمد باقر مجتہد، اورینٹل کالج، لاہور۔

۱۱۔ علامہ سرکار مرزا احمد علی صاحب، جیسنم پاک وہند۔

۱۲۔ سرکار مولانا سید شریف حسین سبزواری بریلوی۔

درس وتدریس:

آپ نے دینی و دنیاوی علوم مختلف درس گاہوں سے کسب کیے۔ ان میں چند درس گاہیں یہ ہیں:

اورینٹل کالج لاہور، سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور، درس گاہ سرکار شریف العلماء۔

بحیثیت ٹیچر و پروفیسر وغیرہ مختلف درس گاہوں میں خدمات انجام دیں، جن میں چند نام یہ ہیں:

مشن ہائی اسکول، لدھیانہ۔ گورنمنٹ ہائی اسکول پھلور ضلع جالندھر۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مکتسر ضلع فیروزپور۔ گورنمنٹ ہائی اسکول جگراؤں۔ آر کے ہائی اسکول جگراؤں۔ ڈی ایم ڈگری کالج اور ڈی ایم کالج فاروو مسن، موگا ضلع فیروزپور۔ امریکن ٹریننگ کالج فار ویلیج ٹیچرز۔

بحیثیت پرنسپل دار العلوم محمدیہ سرگودھا، آنریری پرنسپل دار العلوم کاظمیہ بھلروان ضلع سرگودھا۔ انچارج واعظین کلاس پاکستان، امامیہ مشن لاہور، واعظین کلاس مجلسِ تنظیم الاسلام لاہور۔

ان کے علاوہ بہت سے اداروں کے ممتحن، ایگزامنر، جلسوں کے شریک رہے۔

ہندوستان و پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں (مثلاً ہندوستان میں فیض آباد، امروہہ،

جانسٹھ ضلع مظفر نگر، جلالی ضلع علی گڑھ، بریلی، لکھنو، ساڈھورہ ضلع انبالہ، رام پور اور مراداباد اور پاکستان میں حیدرا باد سندھ، علی پور ضلع گوجرانوالہ، کراچی، خیر پور میرس، سکھر، کوٹ ڈی جی، لاڑکانہ، قمبر علی، پارہ چنار کرم ایجنسی، کوہاٹ، پشاور، علی زئی) کے علاوہ عراق، ایران، بیت المقدس، افریقہ میں مجالس عزاء سے خطاب فرما کر علوم محمدؐ و آل محمدؐ کی تشہیر و تبلیغ فرمائی۔

تصانیف و تالیفات:

☆ مواعظ و خطبات کے متعلق پہلی کتاب "الارشاد والعزاء" ترجمہ "المواعظ المبکاء" شیخ جعفر شوستری۔

☆ "تشیید العقائد" ترجمہ فوائد المشاہد، شیخ جعفر شوستری کی سات تقاریر کا ترجمہ۔

☆ "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" سات جلد۔

☆ "تاریخ کربلا" یعنی شہزادۂ یثرب عالمِ ہجرت میں۔ تین جلد

☆ "بلاغت زینبیہ" یا "خطبۂ آل محمدؐ"۔

☆ رجال: "تاریخ حسن مجتبیٰ" "حالات طیبہ سرکار امام تقیؑ" "حیات طیبہ حضرت علی ابن موسیٰ الرضاؑ" "سیرت سلمان محمدیؓ" "آبروئے وفا حضرت عباسؑ وفا شعار کی سیرت۔"

☆ ہندی بھاشا میں سرکار وفا حضرت عباسؑ کی سیرت "جل داتا عباسؑ"

☆ گورمکھی زبان میں "سیرت سید الشہداء جگت گرو حسینؑ" "شہیدان فرات"

☆ قرآنی استدلال کی کتابیں: "کربلا کی کہانی قرآن کی زبانی" "معارج العرفان فی عصمت ابی طالب عمرانؑ من آیات القرآن" "خصائص سرکار محمدؐ و آل محمد علیہم السلام۔"

☆ دور حاضر کے مذاہب باطلہ کی تردید: "کشف الغطا عن حقیقت الشیخیہ" "کشف الغطا عن مذہب الباب والبہا" "کشف الحیل مذاہب باطلہ یعنی شیخیہ و مذہب باب و بہا" "بہائی مذہب کا سیاسی پس منظر"

ان کتابوں کے علاوہ بہت سی درسی کتب، مقالات، سفرنامے، تنقیدی و اصلاحی مضامین رسالوں اور اخبارات کے لیے لکھتے رہے۔

مورخ اسلام پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری اعلی اللہ مقامہٗ کا یہ خاکہ ان کی کتاب ''کربلا کی کہانی قرآن کی زبانی'' کی ابتدا میں ان کی صاحب زادی ذاکرۂ اہلبیت اطہار محترمہ خلیلہ زینب صاحبہ کے مضمون ''حالات زندگی مؤلف کتاب'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

ہمارے علمائے کرام

شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستریؒ

آپ ہندوستان کے ایرانی نژاد فقیہ، متکلم، ادیب اور شاعر تھے۔ معروف کتب "مجالس المومنین" اور "احقاق الحق" ان کی تالیف ہیں۔

آپ کا اسم گرامی سید نور اللہ اور لقب ضیاءالدین، المعروف شہید ثالث (۹۵۶۔۱۰۱۹ھ)۔ آپ سید شریف بن جمال الدین نور اللہ ابن شمس الدین محمد شاہ حسینی مرعشی شوستری کے بیٹے تھے۔ شجرۂ نسب حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ آپ کی ولادت ۹۵۶ھ میں شہر شوستر میں ہوئی، جو خوزستان ایران کے نواح میں ہے۔ آپ شیخ بہائیؒ کے ہم عصر تھے۔

ابتدائی تعلیم شوستر میں حاصل کی۔ جب جوان ہوئے تو علم کے اعلیٰ مقامات حاصل کر لیے۔ مزید حصول علم کے لیے مشہد مقدس تشریف لے گئے اور کسب علم میں مشغول ہوئے۔ یہاں انہیں نابغۂ روزگار علماء سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح علم کے بلند مرتبہ پر پہنچ کر مرجعیت امامیہ کا مقام حاصل کیا۔

جب انہیں علم ہوا کہ ہندوستان میں مسلکِ شیعہ کے آثار کم ہیں اور جو مختصر سے شیعہ موجود ہیں وہ بھی دوسرے مسالک کے مقابلے میں نہایت کمزور ہیں تو ہمت کر کے ہندوستان کی طرف سفر کیا تاکہ مسلک شیعہ کو وہاں کے لوگوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ روشناس کر سکیں۔ آپ کے پیش نظر تبلیغ دین تھی جو آپ نے بھرپور طرح سے کی۔ آج ہندو

پاک میں جو اہل تشیع کی علمی قابلیت ہے، آپ ہی کی بدولت ہے۔ اس وقت آگرہ ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اور مغل بادشاہ اکبر کا ڈنکا بج رہا تھا۔ آگرہ میں آپ نے حکیم فتح گیلانی کی قربت اختیار کی اور دربار اکبری تک رسائی حاصل کی۔ اکبر کے دربار میں علماء و فضلا کی بڑی توقیر تھی۔ جب اکبر نے آپ کے علم و فضل کو درک کیا تو بہت متاثر ہوا۔ اس نے آپ کو قاضی القضاۃ کا منصب سنبھالنے کی پیش کش کی۔ آپ نے اس منصب کو قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھی کہ وہ مسلمانوں کے مختلف مسالک میں سے کسی خاص فقہ کے تحت فتویٰ جاری نہیں کریں گے اور کسی خاص فقہ کے تابع مہمل بن کر فیصلہ نہیں کریں گے۔ البتہ ان کا فتویٰ تمام مسالک کے باہر بھی نہیں ہوگا۔ (یہ طریقہ قضا مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے طریقہ سے مماثلت رکھتا ہے کہ اپنے ظاہری دور خلافت میں وہ مسلمانوں، یہودیوں یا نصاریٰ کے فیصلے ان ہی کی کتابوں کے تحت دیا کرتے تھے)۔

اکبر نے آپ کی شرائط کو قبول کیا اور آپ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

قاضی نور اللہ نے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے جن میں سے "مجالس المومنین" میں تاریخی مباحث پر توجہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ، بارہ مجلسوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ اس کا مقدمہ تشیع کی تعریف اور پیغمبر اسلام کی ایک حدیث پر مبنی ہے جو ائمہ طاہرین کے بارہ تک محدود ہونے کی علت کے بیان میں ہے۔ جب کہ کتاب کی مجالس بالترتیب ان موضوعات پر ہیں: بعض مقامات کا ذکر جو ائمہ علیہم السلام سے مخصوص ہیں، گروہ شیعہ، بنی ہاشم اور دیگر قبائل سے تعلق رکھنے والے اکابر، متکلمین، مفسرین، محدثین، فقہاء، علمائے نحو و لغت، بعض بزرگ صوفیاء، مشہور حکمائے اسلام، شیعہ سلاطین و ملوک، امراء اور سپہ سالار، وزراء، شعرائے عرب اور شعرائے عجم۔

اس کتاب میں غلطی سے بہت سے ایسے لوگوں کو بھی شیعوں کے زمرے میں شمار کیا

گیا ہے جو حقیقت میں شیعہ نہیں بلکہ صرف شیعوں کو چاہنے والے تھے۔ اسی وجہ سے قاضی نوراللہ شیعہ تراش کے نام سے مشہور ہوئے۔

"مجالس المومنین" سادہ اور رواں فارسی نثر میں ہے جو ۹۹۳ سے ۱۰۱۰ھ کے دوران لکھی گئی۔ یہ کتاب قاضی نوراللہ کے خلاف مقدمہ اوران پر سزا کے حوالے سے ایک سند اور دستاویز ثابت ہوئی۔ چنانچہ ان کے دشمن یہی کتاب جہانگیر کو دکھا کر انہیں معزول کرنے اور سزا دینے پر ابھارنے میں کامیاب ہوئے۔ (گلچین معانی، ۱۳۴۸، ص ۵۹، ۶۶، ۶۷: ابن، ج ۱۰، ص ۳۲۸-۳۳۰)

قاضی القضاۃ کے عہدے کے ساتھ ہی آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور چاروں مذاہب کے درس دینے لگے۔ یہ طریقہ کار اتحاد بین المسلمین کا زبردست ذریعہ بنا۔ مقام قضاۃ کی عظمت ملنے کی وجہ سے دیگر لوگ ان سے حسد کرنے لگے۔

ایک دن جب آپ نے حضرت علی کا نام لیا تو فرمایا علیہ السلاۃ والسلام۔ حاسدین نے اس پر ہنگامہ برپا کر دیا کہ یہ تو بدعت ہے کیونکہ درود و سلام صرف جناب رسالت مآب ؐ کے لیے مخصوص ہے۔ حضرت علی پر درود بھیجنا بدعت ہے اور جو شخص دین میں بدعت جاری کرے وہ واجب القتل ہوتا ہے۔ ان سب نے ایک دستاویز تیار کر کے بادشاہ کو بھیجی جس میں انہوں نے قاضی کی معزولی اور ان کو سزائے موت دینے کا مطالبہ کیا۔

قاضی صاحب نے بادشاہ کے حضور فرمایا:

"آپ ان علماء سے پوچھیں کہ کیا رسول اکرمؐ نے حضرت علی کے بارے میں یہ نہیں کہا تھا "لحمک لحمی" "تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔"

علماء نے کہا:

"جی ہاں! یہ حدیث صحیح ہے۔"

قاضی صاحب نے فرمایا:

''پھر میں نے کون سی بدعت سر انجام دی ہے۔ میں نے بھی حضرت علیؑ کو لحمِ رسولؐ اور نفسِ رسول سمجھ کر ان پر درود و سلام بھیجا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟''

حاسدین شرمندہ ہوئے۔ اللہ نے انہیں ان کے شر سے محفوظ رکھا۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا۔ حاسدین نے پھر سازشیں شروع کر دیں کہ کسی طرح قاضی صاحب کو بادشاہ کی نظروں سے گرایا جائے۔ مگر قاضی صاحب کے حسن تدبیری کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی بات پکڑ میں نہ آسکی۔

پھر دشمنوں نے ایک جوان کو بغرض شاگردی قاضی نور اللہ شوستری کے پاس بھیجا۔ وہ جوان کئی سال ان کے پاس رہا اور ان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس بدبخت نے کسی طرح ان کی کتاب ''تحقیق الحق'' (یا ''مجالس المومنین'') کا مسودہ چوری کر لیا اور دشمنوں تک پہنچا دیا۔ اس کتاب میں مذہب حقہ کی حقانیت بیان کی گئی تھی۔ ان لوگوں نے یہ کتاب جہانگیر کے دربار میں پیش کر دی۔ جہانگیر کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ اکبر کی ہندو بیوی جودھا بائی کے بطن سے تھا۔ جودھا بائی مسلمان نہیں ہوئی تھی۔ آج بھی آگرہ کے شاہی قلعہ میں ایک گوشہ میں وہ مندر موجود ہے جس میں وہ پوجا پاٹ کیا کرتی تھی۔ جہانگیر پہلے ہی اہل تشیع کا دشمن تھا۔ اس کتاب کو دیکھ کر غضب ناک ہوا اور قاضی صاحب کو قتل کی سزا تجویز کر دی۔ ایک خاردار درخت کی ٹہنی لائی گئی اور آپ کے بدن پر اتنی ماری گئی کہ گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گیا۔ پھر حکم دیا گیا کہ ایک تانبے کے برتن کو آگ سے پر کر کے قاضی صاحب کے سر پر رکھ دیں۔ اتنی ظالمانہ سزا کے نتیجہ میں اس مردِ مومن نے جامِ شہادت نوش کیا۔ قاضی صاحب کی لاش کو قلعہ سے باہر پھینک دیا گیا۔ کئی روز بعد ایک ایرانی سردار نے خواب میں جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو دیکھا کہ وہ فرما رہی ہیں کہ میرے شہید بیٹے نور اللہ کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ اسے اٹھاؤ اور تجہیز و تکفین کے بعد تدفین کا اہتمام

کرو۔ چنانچہ انہوں نے کچھ دیگر مومنین کی مدد سے ان کی لاش کو اٹھایا اور تجہیز و تکفین کی۔ جناب سید راجو نے جو آپ کے دوست تھے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آگرہ کے نواح میں دفن کردیا۔ یہ علاقہ نیا آگرہ کہلاتا ہے اور اب آگرہ کا حصہ ہے۔ اس وقت آپ کا مزار شریف فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے اور عام و خاص کے لیے زیارت گاہ ہے۔ ہر سال اکتوبر کے مہینہ میں یہاں عشرۂ مجالس کا اہتمام ہوتا ہے، جس میں پورے ہندوستان سے خطباء اور زائرین تشریف لاتے ہیں۔ (اللہ کے فضل و کرم سے راقم نے دو بار حضرت علامہ قاضی نوراللہ شوستریؒ کے مزار کی زیارت کا شرف حاصل کیا)۔

مآخذ

۱۔ "اسلامی اور ایرانی تہذیب و تمدن میں شیعوں کا کردار" جلد اول، از ڈاکٹر علی اکبر ولایتی۔

۲۔ "مجالس المومنین" از شہید ثالث علامہ قاضی نوراللہ شوستریؒ، ترجمہ جناب محمد حسن جعفری۔

۳۔ "عبادالرحمن فی تجلی دھر و زمان" مولفہ یوسف عباس ناجی۔ ناشر باب العلم دارالتحقیق۔ کراچی۔



سیّد رفیق عبّاس جعفری

E-Mail: rafiqabbasjafri@hotmail.com

مسجد نبوی میں نماز باجماعت جاری تھی۔ امامت اللہ کے نبیؐ خود فرما رہے تھے۔ قیام و رکوع کے بعد حضورؐ سجدے میں تشریف لے گئے۔ جب رسول اکرمؐ نے خلاف معمول سجدے کو طول دیا تو نمازیوں کو محسوس ہوا کہ سجدہ کا دورانیہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ تشویش ہونا فطری امر تھا۔ لیکن سب حکم خداوندی سن چکے تھے کہ جب تک امام جماعت سجدے سے خود سر نہ اٹھائے ہر مقتدی اس وقت تک سجدے میں رہے۔ جب طوالت کچھ اور بڑھی تو نمازیوں نے آہستہ سے تھوڑا سا سر اٹھا کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کی لیکن دیکھا کہ رسولؐ بدستور سجدے میں مصروف ہیں۔ البتہ یہ محسوس ہوا کہ نبیؐ کی پشت پر کوئی سوار ہے۔ اس سے زیادہ دیکھنے کا موقعہ تھا نہ محل۔ کچھ نمازی ذکر تسبیح (سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ) گن رہے تھے جو ساٹھ پینسٹھ سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔ الغرض ستر بار کی تسبیح حمد کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے سجدے سے سر اٹھایا۔ تشہد سلام کے بعد تسبیح فاطمہؑ کا ورد کیا۔ دعا فرمائی۔ اس کے بعد تشویش میں مبتلا نمازیوں نے حضور اکرمؐ پر استفسارات کی بوچھار کر دی۔ حضورؐ نے حسب عادت مسکراتے ہوئے سب کو بتایا۔ ''کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی۔ جب میں سجدے میں گیا تو میرا یہ لاڈلا نواسہ میری پشت پر آ گیا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسے تکلیف نہ ہو اشارے سے بھی ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انتظار میں رہا کہ حسینؑ خود پشت سے اتر جائیں یا اللہ کا حکم آ جائے۔ ایسے میں (سجدے ہی کی حالت میں) جبرئیل امینؑ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان پہنچایا کہ اے رسولؐ سجدے سے اس وقت تک سر نہ اٹھانا جب تک حسینؑ خود اپنی مرضی سے آپ کی پیٹھ پر سے نہ اتر جائے۔ چنانچہ میں تسبیح حمد کی تکرار کرتا رہا اور جب یہ میرا لخت جگر اپنی مرضی سے میری پشت سے جدا ہو گیا تو میں نے سجدے سے سر اٹھایا۔ اے لوگو! اور جان لو یہ بچہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے اور اس کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ جو اس کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے، جو اس کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے اور جو میرا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اے لوگو! میرے بعد اس کا خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچنے دینا۔ یہ اور اس کا بھائی حسنؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔ اس کی ماں میری بیٹی خاتون جنت ہے اور اس کے بابا علی مرتضیٰؑ قسیم نار و جنت ہیں، ساقی کوثر ہیں۔ ان لوگوں کی مودت اللہ نے فرض کی ہے۔ ان سے مودت کے بغیر کوئی جنت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔

یاد رکھنا! یہ رسولؐ کوئی کلام، کوئی عمل اپنی ذاتی مرضی سے نہیں کرتا۔ اس کا ہر عمل، ہر قول اللہ کی ہدایت مطابق ہوتا ہے۔

(یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ حالت نماز میں حسینؑ کا خیال ذہن میں رکھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی بلکہ یہ سنت رسولؐ ہے) اقتباس از مضمون ''یادگار سجدے''

قمر زہرا میموریل اکیڈمی۔ کراچی